

گل بیانو

رضیہ ربٹ



طیارہ محو پرواز تھا۔ ہزاروں فٹ کی بلندی پر اسے جنت اور اہل مومن کے وجود میں کئی وجود
 سینے اپنی مخصوص رفتار سے منزل مقصود کی جانب بڑھ رہا تھا۔ کساروں، رنگیزاروں، پستے پانیوں،
 کھولے سمندروں اور لعلاتے میہانوں کو بڑی بے نیازی سے عبور کرتا چلا جا رہا تھا۔ کبھی بادل راہ
 بن آتے کبھی دھند سرد راہ بنتی اور کبھی ہستی مسکراتی دھوپ راستہ دیتی۔

پینتالیس سالہ فرجاد اپنی آرام دہ نشست میں بڑے سل انداز میں بیٹھا کب سے بیٹوی کھڑکی
 کے شیشے کے پار نظروں میں آتے اور گم ہوتے متاعِ عروج دیکھ رہا تھا۔ کبھی اس کی نگاہیں نیچے آسمان میں
 الگ جاتیں اور کبھی وہ نیچے قدرت کے حسین شاہکار دیکھنے لگتا۔ اونچے اونچے پہاڑی سلسلے وسیع و
 عریض صحرا۔ لمبے چوڑے دریا اور بے کنار سمندر سب جیسے اپنے وجودوں میں سمٹ گئے تھے۔ کتنے
 چھوٹے چھوٹے نظر آتے تھے سب بلندی میں واقعی عظمت ہے۔

فرجاد کی گردن ایک ہی رخ نکلتے تھک گئی تھی۔ اس نے رخ مڑوا۔ تسال سے نشست میں
 کروٹ بدلی۔ شانہ بیٹوی شیشے سے لگا کر طیارہ کے اندر اک نگاہ ڈالی۔

اور

پھر وہ اسی رخ بیٹھا سرے سے لے کر آخر تک نشستوں کا جائزہ لینے لگا۔ پورے طیارے
 میں صرف تین نشستیں خالی تھیں۔ ایک اس کے برابر والی ایک بالکل آخری سرے پر اور ایک
 درمیان والی۔ باقی بیٹیں پر تھیں۔ مختلف ملکوں کے مختلف لوگ بیٹھے تھے۔

وہ کتنی ہی دیر اس فراہمی نوجوان کو دیکھتا رہا۔ جو اپنی انگریز محبوبہ سے بڑی بے تکلفی سے
 محبت کی عملی منزلیں طے کر رہا تھا۔ یہ نوجوان اسے عیروں میں ملا تھا۔ اور اپنے عشق کی پوری
 داستان بتا ڈالی تھی۔

پھر اس کی نظریں اس اندویشی عورت پر رک گئیں۔ جو اپنے بچوں کی شرارتوں سے عاجز آکر
 اپنی زبان میں انہیں سرزنش کر رہی تھی۔ فرجاد کے کالوں میں اس غیر بانوس زبان کا کوئی لفظ نہ بھی
 جاتا۔ تو وہ سمجھنے سے قاصر ہوتا لیکن دور بیٹھے عورت کے چہرے کے تاثرات اس کے ہونٹوں کا،
 حرکت اور بچوں کے انداز سے وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا۔

اللہ کرے تم سر جاتا تک کر رہے ہو۔

”گھر جا کر تمہیں سیدھا کروں گی۔“

ابو سے شکایت نہ کی تو دیکھا۔“

”ایک تھپڑ لگاؤں گی۔“

”کوئی کھلوٹا دے دیا تو جاننا۔“

فرجاد اس عورت کو دیکھ رہا تھا۔ بچوں پر لگائیں جمائے تھا اور یہ نعرے اس کے ذہن میں تخلیق پارہے تے۔ وہ زیر لب مسکراتے لگا۔

ایزہ بوسن چائے چاہے چل اور غافیاں لے آئی۔ تو فرجاد کے تخیل کی تخلیق دور کھڑی۔ لیکن جب وہ سامنے کی میز کو لے آئیں ان سے گھونٹ گھونٹ چائے قتل میں اتار رہا تھا۔ تو اس کی نظریں مختلف نشتوں پر پڑنے لگیں اور کاچازہ پھرے لینے لگیں۔

وہ اب ان دو بوڑھوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو شاید بہت بڑے سکار تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی کتاہیں۔ آنکھوں پر مونے مونے پیشوں والی ٹیگٹیں مچھڑے پر شعور کی سایہ چھن چکیں اور پھر پاتوں کے دوران گردن کو خم دینے، سر ہلانے اور ہاتھوں کو حرکت دینے کا انداز ان کے سکار ہونے کا مکمل کھلا اعلان تھا۔

ان کے پیچھے والی نشست پر کوئی ہندوستانی جوڑا تھا عورت کا بڑا سا جوڑا۔ زیر ماتھے کی بندی میک اپ اور بتاری ساڑھی کے علاوہ پاتوں کا شرمیلا انداز اس کے لویا ہوتا ہونے کا ثبوت تھا۔ مرو بھی خوش پوش تھا۔ اور بار بار اس کی طرف جھک رہا تھا۔ دیار فرنگ میں رہ کر وہ شاید یہاں کی حدود کو پہچانے جانا چاہتا تھا لیکن عورت مشرق کی ایک خاص ہندو بندی کی قائل محسوس ہوتی تھی۔ دونوں غائبانہ ہی مون مٹا کر واپس جا رہے تھے۔

فرجاد کے ہاتھیں ہاتھ درمیانی نشتوں پر بیٹھے کئی مسافر اگے رہے تھے۔ گردنیں کندھوں پر ڈھلک آئی تھیں۔ نیزے کے بلکوروں میں کبھی کبھی شیلے کی کوشش میں وہ آنکھیں کھول دیتے۔ سرخ سرخ ہندو بنی آنکھیں بل بھر کو کھلتی اور پھر بند ہوتا جاتیں۔ ان کے سر کندھوں اور سینوں پر ٹپک جاتے۔ کبھی کبھی تو ان کی شکلیں خاصی مشکل خیر کھتے نکلتیں۔ ایک بار جب ایک مسافر کا سر برابر والی مسعر عورت کے گھٹنے پر خیر میں جموتے ہوئے جا نکلا تو عورت نے ہڑبوا کر اس سر کو پرے دھکیل دیا۔ ابھی وہ سر نہیں کھیل کے میدان میں از خود لڑاکھ آنے والا پائل ہو۔

فرجاد کے لے جسم ہو گئے۔

اور پھر وہ گردن ہٹا کر سامنے دیکھنے لگا۔

اس کی نظریں سنہری بالوں والی جھوٹی سی بچی پر ایک گئیں۔ جو اپنے بال باپ کے ساتھ منور

رہی تھی۔ وضع قطع سے یہ لوگ ایرانی لگتے تھے۔ بچے بے انتہا خوبصورت تھی۔ اس کے بال باپ کی صرف پشت نظر آ رہی تھی۔ فرجاد بچے کے واسطے سے ان کے حسین ہونے کا انداز کر رہا تھا۔ ان لوگوں کے برابر ہی ایک بد فیت سا جانور نما انسان بیٹھا تھا۔ فرجاد اس تضاد پر کچھ دیر تنبیہ کی سے سوچتا رہا۔

خیارے میں بیٹے لوگ سوار تھے۔ فرجاد کو یوں لگا جیسے اتنی ہی دنیا میں جو سفر ہیں۔ فرانسیسی نوجوان کی اپنی سوچ تھی اپنی خوشیاں قہیں اپنے فم تھے۔ وہ ایک خاص طرز زندگی اپنائے تھا۔

ایزہ بوسن عورت کے اپنے مسائل تھے۔ اپنا دارہ تھا۔ اپنے گھمراہ تھے۔

ایزہ بوسن کی اپنی دنیا تھی۔

سکاروں کے اپنے متاخر تھے اپنے افکار تھے اپنی سوچیں قہیں۔

لویا ہوتا بوڑے کی خوشبوؤں اور نمکوں سے بھری اپنی دنیا تھی۔

اوجھنے والوں کا اپنا دارہ عمل تھا۔

ایرانی جوڑا بھی پوری دنیا اپنے آپ میں سمیٹے تھا۔

اور

وہ بد فیت انسان بھی شاید انکوں خوبصورتیوں کو من میں بسائے تھا۔

فرجاد نے ایک لمبی سی انگڑائی لی۔ پولولہ۔ اور دنیا میں آباد دنیاؤں کے حلقے سوچنے لگا۔

”میں آپ کے ساتھ بیٹھ سکتی ہوں۔“ ایک نوائی آواز پر فرجاد نے چونک کر دیکھا۔ چالیس پینتالیس سالہ فری مسکراتے چہرے والی عورت انگریزی زبان میں ساتھ بیٹھنے کی اجازت چاہ رہی تھی بلکہ رنگ کی شلوار فیض پر اس نے کھلا دوپٹا اوڑھ رکھا تھا۔

”شکریہ رکھئے۔“ فرجاد نے اس کے لباس سے اندازہ کرتے ہوئے اردو میں کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے بیٹھ گئی۔ ”دھیکس۔“ وہ بولی۔

”میں پاکستان کا رہنے والا ہوں۔ اردو جانتا ہوں اور اچھی طرح بول بھی جانتا ہوں۔“ فرجاد نے

بھی زیر لب مسکراہٹ سے کہا۔

”ہمت اچھی بات ہے۔“ عورت بیک گود میں رکھتے ہوئے مسکرائی۔ وہ چند لمبے رکی اور پھر فرجاد کے سر پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے مسکرائی۔ ”میرا اندازہ غلط نکلا۔“

”کیوں۔“

”میں آپ کو جرمن سمجھ رہی تھی۔“

فرجاد فہم پر۔ ”شکر ہے جرمن ہی سمجھا جانور نہیں۔“

عورت اس کی خوش ملی پر کھکھلا کر ہنس پڑی۔ "آپ یقیناً ابھی ہم سڑک بات ہوں گے۔"
"جی۔"

"میں اس اعلیٰ والی کے ساتھ بیٹھے بیٹھے پور ہو گئی تھی۔ بعض لوگ خود غرضی کی حد تک خود پسند ہوتے ہیں۔"

"جی۔ شاید۔"

"میں کراچی جا رہی ہوں۔"

"میں بھی۔"

"آپ کتنے عرصے بعد جا رہے ہیں۔ پاکستان۔"

عورت کے سوال پر فرجاد کے چہرے کی ساری خوشگواری ختم ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے کیلا سا دھواں گھسنے لگا۔ بے قراری سے اس نے پہلو ہلایا۔

عورت خاص باتوں تھی۔ جواب کا انتظار کئے بغیر بولی۔ "میں تو پورے پانچ سال بعد جا رہی ہوں۔ اللہ، وطن بھی کیا چیز ہے۔ دل چاہتا ہے منوں میں بیچ جاؤں وہاں۔"

وہ خودی بولی ملی ملی۔ لندن کے قیام۔ گھریا، بال بچوں شور اور اس کے کاروبار کے متعلق بہت کچھ بتاتی رہی۔

فرجاد سمجھکے بیٹھا تھا۔

"آپ کا مستقبل قیام لندن میں ہے یا پاکستان میں۔ عورت نے اٹکا اٹکی فرجاد سے پوچھا۔

"جی۔ میرا قیام۔" فرجاد کے چہرے کیوں پرے رنگ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہاں۔ آپ کا قیام۔" عورت نے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

"میں تو پیشہ ہی حالت سفر میں ہوتا ہوں۔" فرجاد نے کہا۔

"یعنی آپ اکثر جاتے آتے رہتے ہیں۔" عورت نے اس کے ادبی جملے کی بے ادبی کر دی۔

فرجاد عورت کی کم نفی پر ہنس دیا۔

"محترمہ میں پورے بیس سال بعد پاکستان جا رہا ہوں۔" فرجاد سیٹ میں ٹھیک طرح سے بیٹھے

ہوئے بولا۔

"اودہ ماٹے گاؤ۔" عورت کے پھولے پھولے گالوں میں دھنسی آنکھیں فرط حیرت سے پھیل

گئیں۔

فرجاد نے ایک گرمی سانس لی۔ اور پھر گھبراہٹ میں بیٹھ پڑا۔

عورت اور تھیں لازم و ملزوم میں۔ دوسرے کے رازوں کو جاننے کی خواہش عورت کی

رشت میں ہے۔ پھر کھلا وہ خاتون کیوں کہ چپ رہ سکتی تھی۔

"آپ تو ابھی۔ کہہ رہے تھے کہ پیشہ ہی حالت سفر میں رہتے ہیں۔ میرے خیال میں آپ اس سے۔ اس سلسلہ میں یورپ امریکہ، افریقہ جاتے رہتے ہوں گے۔" عورت نے بڑی کرید اور تجسس سے اسے دیکھا۔

وہ ایک دم اداس ہو جانے کے باوجود اس کی سادہ لوحی پر مسکرا دیا اور پھر آہستگی سے بولا۔

"مات سفر سے میری مراد یہ نہ تھی۔"

"تو اور۔"

وہ ذرا لب مسکرایا۔ عورت کی بے تکلفی اسے بری نہ لگ رہی تھی۔ شاید اکیلے بیٹھے بیٹھے وہ خود بھی پور ہو چکا تھا۔ وہ آہستگی سے بولا "جسم کا ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جانا ہی سفر نہیں ہوتا۔ محترمہ سوچ کا یہاں سے وہاں پہنچنا بھی تو سفر ہے انسان اپنی ذات کے اندر ہی محو سفر رہتا ہے۔

عورت نے غور سے اس کی بات سنی اور پھر ایک دم ہنس پڑی۔ "آپ رانڈر ہیں۔"

"نہیں تو۔ یہ آپ نے کیسے کہہ دیا۔"

"لفظوں کو بڑا خوبصورت پکڑوے لیتے ہیں نا آپ۔"

وہ بھی مسکرا دیا۔

عورت چند لمبے چپ رہی۔ پھر بولی۔ "مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ آپ بیس سال بعد اپنے وطن

اپس جا رہے ہیں۔"

"لوگوں کی بہت بری بات تو نہیں۔ کئی لوگ اگلینڈ میں ایسے بھی ہیں جنہیں بیس سال بعد بھی اپنی کا خیال نہیں آتا۔"

"لیکن یہ بھی تو بڑی بات ہے۔ کہ آپ کو بیس سال بعد واپس کا خیال آ گیا۔"

"شاید۔"

"آپ اکیلے ہی جا رہے ہیں۔"

"تو اور کون ہو نا ساتھ۔"

"بیوی بچے۔"

فرجاد نے بے قراری سے پہلو ہلایا۔

"آپ نے عمر کا بہترین حصہ دیارِ غیر میں گزارا ہے۔ شادی بھی یقیناً نہیں کی ہوگی۔"

فرجاد اب اس موضوع پر آپ زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سانسے رکھا۔ بیگزین اٹھا

”آپ شادی شدہ ہیں۔“ عورت اس کی ذات کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔
”تھا۔ لیکن اب نہیں۔ اب صرف میرا پناہ ہے۔ جو وطن کی امانت تھا۔ اسے لوٹانے چاہتا ہوں۔“

”آپ بڑی مٹھلی منظر گو کرتے ہیں۔“

”مجھ میں نہ آنے والی کوئی بات تو نہیں کی میں نے۔“

”یعنی آپ کی شادی ہوئی تھی۔ اور۔“

”جی ہاں دس برس کی یہ قید بھی کاٹ چکا ہوں اب آزاد ہوں۔“

عورت ہنس کر بولی۔ ”آپ خاصے دلچسپ آدمی ہیں۔“

”شکریہ۔“

چند لمبے خاموشی رہی۔ لیکن باقینی سی عورت کو چپ ہی بیٹھنا ہوتا۔ تو اس اظہاری کی محبت کیا بڑی تھی۔

”آپ کو اپنے عزیزوں کی یاد نہ ستاتی تھی۔“ کئی لمحوں کی چپ کو اس نے یوں توڑا۔

فرجاد نے ایک سرسری سی نگاہ اس عورت پر ڈالی۔ اور پھر کمری سانس لینے ہوئے بولا۔ ”ان یادوں سے فرار کے لئے تو تیس سال کا بیٹا نکال لے رہا۔“

”اب فراغت کی ضرورت نہیں رہی۔“ عورت دلچسپی سے مسکرائی۔

”ہاں۔“

”کیوں؟“

وہ چپ رہا۔ عورت کو اس سے اسنے ذاتی قسم کے سوال یوں بے دھرم کرنے پر خود بھی کچھ ذرا مت محسوس ہوئی۔

”معاف کیجئے گا۔“ وہ بولی۔ ”آپ سے اس قسم کے سوال کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔“ میں کسی خاص مقصد کے تحت یہ باتیں نہیں کر رہی۔ چپ رہنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اس اظہاری نے بور کر دیا تھا۔ آپ سے باتیں کر کے میں خوش محسوس کر رہی تھی۔“

”شکریہ۔“

”چلے پر سٹل معاملات سے ہٹ کر باتیں کرتے ہیں۔ سڑک خوشگوار بنانا ہے۔ انتظار کے لمحوں کو کاٹنا ہے۔ کیا آپ کسی اور موضوع پر بات چیت پسند کریں گے۔“

”ہم دونوں اپنے وطن جا رہے ہیں۔ ہم اپنے وطن کی باتیں کر سکتے ہیں۔“

”ہاں ہاں۔“

”سکرادیا۔“

دونوں کچھ دیر وطن عزیز کی باتیں کرتے رہے۔ لیکن وطن کے حوالے سے پھر ذاتی باتیں کرنے لگیں۔

”آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔“

”آپ کے آباؤ اجداد کہاں کے تھے۔“

”جب اتنی بڑی زمینداری تھی تو میں وطن چھوڑنے کی نیت کیوں کرتی۔“

”انگریز عورت سے شادی کیوں کی۔ جب وطن کی خوبصورت بیٹیاں آپ کے لئے چشم براہ ہیں۔“

فرجاد نے سر دونوں ہاتھوں پر گر لیا۔

عورت نے پھر ایک بار ذاتیات پر اتر آنے سے نہامت محسوس کی۔ وہ ہاتھ میں پکڑا رسالہ نیچے لگی۔ فرجاد اب اس عورت کی قربت سے خوف کھانے لگا تھا۔ یہ اگر یوں ہی سوال کرتی رہی۔ تو اسے ہو جائے گا۔ جو وہ کسی طور نہ چاہتا تھا۔ وہ تو فراغت کی راہ پر گامزن تھا۔ اپنے آپ سے چھپنا چاہتا تھا۔ کبھی ذہن کو بیٹھویشے سے باہر نظر آنے والی فضا سے منسلک کر کے اور کبھی طیارے کے ذریعے مسافروں کے طور و طریق کا تجزیہ کر کے اپنے آپ کو اپنے آپ سے ہٹا رہا تھا۔

وہ اس بات پر سوچتا ہی نہیں چاہتا تھا۔

کہ

وہ کیوں واپس جا رہا ہے۔

چند دن پہلے جب وہ سکاٹ لینڈ سے واپس آیا تھا۔ تو اس میں اپنے ایک پرانے پاکستانی شناسا ملاقات ہو گئی تھی۔ یہ پاکستانی تین ماہ کی رخصت پر اپنے گھر گیا ہوا تھا۔ اور ان تین ماہ میں اپنے ”بڑوں“ دوستوں اور نئے والوں کے لئے باتوں کا خاصا بڑا ذخیرہ لے کر آیا تھا۔

اسی نے فرجاد کو بتایا تھا کہ گل بانو پچھلے سال مر گئی۔

کل بانو۔

کل!

تجسم آصف۔

وہ مر گئی تھی۔ پچھلے سال مر گئی تھی۔

فرجاد نے یہ خبر بڑے چھل سکون و اطمینان سے سنی تھی۔ اور پھر اسے یوں لگا جیسے اس کے دماغ سے بہت برا بھلا اتر گیا ہو۔ وہ محض ختم ہو گئی ہو۔ جس میں کبھی کبھی سانس لینا مشکل ہو

جاتا تھا۔ وہ حصار ٹوٹ گیا ہو۔ جو اس نے اپنے وجود کے گرد اکڑا کر رکھا تھا۔
اسے سمجھ نہ آئی تھی۔ کہ اس خبر سے اس نے صدمے کی پختاؤں کو چھو لیا ہے۔ یا سکون؟
ابتداءً کو۔

وہ جان بھی کیسے سکتا تھا۔

ابتداءً و انتہا تو دائرے کی صورت میں ہیں۔ کون جانے ابتداءً کہاں سے ہوتی ہے اور انتہا
کہاں ہے؟ ابتداءً سے انتہا ہوتی ہے؟ یا انتہا سے ابتداءً۔ اک چکر ہے جو چلتا ہی رہتا ہے۔
جو کچھ بھی تھا۔ اس خبر سے اس کی واپسی کا پروگرام انکا ایک ہی بن گیا تھا۔
گلی کیا مری تھی۔

وہ دیوار وہ فیصل وہ چٹان۔ جو اس کی واپسی کی راہ میں حائل تھی مگر تھی تھی۔ ہٹ گئی تھی
ٹوٹ چھوٹ گئی تھی۔ اور اب وہ بڑے آرام سے بڑی آزادی سے اپنے گھر لوٹ سکتا تھا۔

موسم کی دنوں سے تب رہا تھا۔ بیلا آسمان و صول کی تھوڑے تانبے کی رحمت کا ہو رہا تھا۔
دھرتی کے ہونٹوں پر پتھر۔ مٹی جی تھیں۔ شجرے رکھ ہو رہے تھے۔ بیزہ اور ہریالی نیالی تھوں میں
بچپ گئے تھے۔ گری شہید ترین بے شک میں تھی۔ لیکن آغا زکریا قرین تھا۔ ہماروں کی رتوں
کوئی نئی موت آئی تھی۔ فضا میں جھک سوا گری کے انداز پرچے بے تھے۔ موسم بدلنے کا اڑنا خاک
وہ دروں کی سستی و تساہل؟ آپوں آپ پیدا ہو گیا تھا۔

لیکن

اس کے باوجود زندگی کی گاڑی رواں دواں تھی مگر زندگی اگر وقت کے پتھروں پر راجھان نہ ہوتی
۔ تو شاید کبھی کبھی حالات کے تقاضے موسم کی تبدیلیاں سوچوں کے انداز سے دوک ہی دیا کرتے۔
لیکن وقت کے پتھروں تو زندہ دل کی دھڑکن کی طرح ہیں۔ کبھی نہیں رکتے۔ چلتے رہتے ہیں۔ چلتے
جاتے ہیں ایک ہی انداز سے ایک ہی طریق سے۔ ایک ہی رفتار سے۔
یہ بھی اچھی سی بات ہے۔

جو

وقت کے پتھروں رکنے کے عادی نہیں۔
اگر یہ رکنے کے عادی ہوتے تو اللہ جانے کسے کسے میں کیا کیا قیامتیں ٹوٹی ہوتیں۔

اور

حالات کا یہ جو مسلسل بہاؤ ہے۔ جتنی لمبے جتنی گھنٹیاں سب بھائے لے جاتا ہے۔ رک
جاتے کا عادی ہو آ۔ تو کیا کیا طوفان اٹھتے۔

قدرت کا نظام بلاشبہ بہترین ہے۔ کائنات میں توازن کی فضا اسی نظام کی مرہون بنت ہے۔
موسم کی تپش بھی مسلسل نہ تھی۔ چند دنوں کی خشکی کے بعد خشکی لازمی ہوتی ہے۔ اس دن
سج کی آنکھ کھلی۔ تو مطلع ابر آلود تھا۔ فک ہوا میں چلنے لگی تھیں۔ اور فضا میں صول کی بجائے فی
کا احساس غالب تھا۔

پھر بادلوں کی بیخار ہونے لگی۔ اللہ جانے کہاں سے فیل مست کی طے پادیں جھومتے چلے آئے
۔ ہواؤں نے زور پکڑا۔ فضا میں خوشنواہی پھیلنے لگی۔

لوہاں سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ وہ حال ہی میں یونیورسٹی سے نکلا تھا۔ ذہنی بلوغت اس کی ڈگری سے بہت آگے تھی۔

تعلیمی فراغت کے بعد تلاش روزگار کا مسئلہ تھا۔ وہ متوسط طبقے کا انسان اپنی قابلیت کے بل بوتے پر کوئی مقام بنانے کا شروع ہی سے خواہشمند تھا۔ رشتوں کی استطاعت تھی نہ سفارشوں کی رسائی۔ کئی جگہ عرضیاں دے چکا تھا۔ کتنی ہی جگہ انٹرویو دے آیا تھا۔ لیکن حال اسے کامیابی کی جھلک کبیں نظر نہ آتی تھی۔ ڈگری کے کانڈ پر کبھی اس کی قابلیت کی نشاندہی کرنے والی تھریڈ کلاس کامیابی میں مانع تھی۔ اس کے ذہن میں کھولے فکر و محنت کے سمندروں سے کوئی آشنا نہ تھا۔ نظریں تو اس کانڈ پر پڑتیں۔ اسی سے اس کی شخصیت کو جانچا تو لاجا تا۔ کتنا غلط تھا۔ یہ میزبان۔ اس کے اندر چھپا ہوا ذہن و فطرت انسان تپ اٹھتا۔

ملازمت کی اسے تلاش صرف اس لئے نہ تھی۔ روزگار کا مسئلہ تھا۔ اس کا تعلق کسی ایسے محکمے گزرے گھرانے سے بھی نہ تھا۔ اس کے ہوا ایک ایماندار سرکاری افسر تھے۔ زیادہ نہ سہی رکھ رکھاؤ اور سفید پوشی کا بھرم تو بڑی خوش اسطولی سے بھہرا رہے تھے۔ وہ خود بھی چاہتے تھے کہ اسے کوئی اہم و متدار نہ ملازمت ملے۔ اس کے لئے صبر کیا جا سکتا تھا۔ موصوفے تلاش ہو سکتے تھے۔ دوڑ و دوپ کی چالکتی تھی۔

لیکن

اس کی پریشانی ابجی جگہ تھی۔

بیٹا۔ اس کی محبت۔ اس کا عشق اس کی زندگی تھی۔ وہ اس کے لئے کئی تھی۔ یہ اس کے بھوتانہ جذبات ہی بتا سکتے تھے۔

لیکن بیٹا اور اس میں جو معاشرتی فرق تھا۔ جو طبقاتی جہد بندی تھی۔ اس کا احساس اسے اب شدت سے ہو رہا تھا۔ کیوں اسے پتہ چلا تھا۔ کیوں کہ بیٹا کے لئے اونچے اونچے گھر والوں کے رشتے آ رہے ہیں۔

بیٹا اسی خوبصورت خوشبوئیں اور روشنیوں سے بھرے علاقے کی ایک بہت بڑی قدر نما حویلی میں رہتی تھی۔ اس حویلی کے انداز و شانائیت سے۔ گورنمنٹ نے حادثہ کی بوجھاؤ اس حویلی پر بھی کی تھی۔ اس کے کئی سے غیر آباد تھے۔ کبیں کبیں سے ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ کبیں سے پلستر اکھڑ چکے تھے۔ کبیں سے چونا گر رہا تھا۔ برسوں پہلے والی آن بان بھی نہ تھی۔ نوکروں کی پینٹیں۔ نوکرائیوں کے غول۔ گاڑیوں کو ٹوٹے گجیاں چل پھل اب مفقود تھی۔ لیکن پھر بھی حویلی کی آن بان اور دبہہ اب بھی دیباغی تھا۔ صرف حویلی ہی کیا تھا۔ پھر اس کے پس منظر میں مروجوں کے مربیعے زمینیں۔ جو سنہری خوشوں کی کندم کے روپ میں سونا لگتی تھیں۔ جو صحن کی اہمائی تھیں دامن

اور پھر

بال کا سینہ چاک ہوا۔ بوند بوند پانی پڑنے لگا۔ پچاسی زمین کے ہونٹ تر ہوئے فیانی فضا دھلنے لگی۔ بوند بوند پانی موسلا دھار بارش کی صورت اختیار کر گیا۔

اور

اس شام جب پابل کھل کر برس گئے تھے۔ تانبے کی رنگت کا آسمان مگرانیلا ہو گیا تھا۔ دھرتی کے تانبے ہونٹ سیلاب ہو گئے تھے۔ فضا میں رچی بسی مٹی و محل و محل پھٹی تھی۔ سبزہ اور ہریالی نے اپنے ذہب تن کر گئے تھے۔ مکان و محل گئے تھے۔ کوئیاں اور بچکے نچا کئے تھے۔ سرکیں گلیاں صاف ہو چکی تھیں۔

تو

فضا میں ہوئی سوگاری خود بخود ختم ہو گئی تھی۔ زندگی خندہ نظر آتی تھی۔ چروں سے تسال اور وجودوں سے سستی کے خول اترے ہوئے لگتے تھے۔ صرف انسان ہی نہیں چرند پند شجر و حجر ہر شے بیش بیش نظر آتی تھی۔

پس

اس در فربہ دلاؤں سے بھی وہ اداس تھا۔

نیلوں اور چھوٹی چھوٹی درمیانی سر سبز گلیوں میں دھیرے دھیرے بچنے والی ندی کا صاف و شفاف چکلیا پانی آج سرخ مٹی سے لگا ہوا تھا۔ رفتار میں اب تھم چکی تھی۔ لیکن تندی ضرور تھی۔ کنارے کا دھلا دھلا سبزہ ابھی گلا تھا اور نم آلود سا نکھار ہر سو پھیلا تھا۔ درختوں کے نسواری پتے بڑے بڑے ٹکڑے سے تیز شرابیں اور پتیاں گہری گہری ہودی تھیں۔ ہوا کے کسی ٹکڑے سے پتیاں بھول اٹھیں تو ان پر رے کپانی کے قطرے پھواری کی صورت برس جاتے۔ اور پھر چپوں کی ٹوک پر ایک ایک قطرہ یوں اکٹھا جاتا جیسے کسی دھڑکے کی خوبصورت بایلوں میں موتی چمک جاتے۔

درختوں کے جھنڈے کے جھنڈے تھے۔ خورد و جھاڑیاں تھیں۔ جنگلی پھول تھے۔ از خود اگنے والی پھلیں تھیں

ندی کے کنارے سے ذرا بہت کر ایک ٹوٹے درخت کے موٹے سے پر وہ ٹیک لگائے بیٹھے کے انداز میں کھڑا تھا۔ اس نے کئی حرکتیں چھوٹکے والے تھے۔ اور وہ موم اور ماحول سے بے نیاز اپنی سوچوں میں گم بیٹھا کا انتظار کر رہا تھا۔ متوسط طبقے کا ذہن و ذہک لوہاں۔ جس نے زمانے کے دستور اپنا رکھتے تھے۔ لمبی قلیں اور بھاری مونیٹیں اس کے خوبصورت چہرے کو لاد رہی تھیں۔ اس کا قد لمبا اور تھا۔ جسم متوازن اور خود خال پر وقار تھے۔ لباس اور وضع قطع سے وہ کسی پورژورا

میں لئے پیسے کی بھرمار کا اعلان کرتی تھیں۔ جہاں تمباکو پیدا ہوتا تھا۔ کہاں اچھی تھی۔ چھوٹی موٹی اور چیزوں کے علاوہ گئے جیسی چیزیں فصل بھی ان زمینوں کے سینے سے باہر آتی تھی۔
 حویلی کے کینوں کی دولت کا اندازہ کرنے کو تو سوئی کپڑے کی وہ لی ہی کم تھی۔ جو قریب بڑے اور معنی شرمیں چل رہی تھی۔

مادی دولت کے علاوہ مذکورہ دولت کا حسین ترین شکار تھی (حسن صرف خوبصورت آنکھوں، دلکش خندہ خال سمتری رنگت اور کٹھاؤں ایسے بالوں ہی کا نام نہیں۔ ان چیزوں سے چھوٹے والی اس روشنی اور محرک نام ہے۔ جو دوسروں کے دل سحر کر لیتی ہے۔ آنکھ دیکھتی ہے اور دیکھنے چلے جانے پر مجبور ہوتی ہے۔ دل میں لگا لگا ہٹ محسوس ہوتی ہے اور ذہن عقیدت و احترام سے مجبور ہو کر سلام کرنے لگتا ہے کچھ ایسا بھی کچھ ایسی شے تھی۔

خوبصورت تناسب جسم میں لہجہ و لہجہ کا ایسا حسین استخراج تھا کہ دیکھنے والے کو یوں لگتا جیسے وہ گوشت اور ہڈیوں کا مرقعہ نہیں دیکھتے ہوئے ریوڑ کو دے کی تخلیق ہے۔ اس کی رنگت میں دودھیا چاندی اور شفق کے عکس لڑاں تھے۔ اس کی آنکھوں میں ساحرانہ کشش تھی۔ یہ آنکھیں ناچتی تھیں بولتی تھیں۔ پڑ پڑا تھیں کہ جاتی تھیں۔ تو یوں لگتا تھا۔ کائنات جھوم رہی ہے۔ قہقروں کی کلنگ ہر سو لہریں لے رہی ہے۔

اور جب

یہ آنکھیں چپ ہو جاتیں تو یوں لگتا کائنات کا دم رک گیا ہے۔ ہر چیز پتھرا گئی ہے۔ ساکن ہو گئی ہے۔ ادا سب کے دھوئیں کا چاؤ فضا میں محسوس ہونے لگتا۔
 شوخ رہتی کی طرح تجلی اور شرر آنکھیں کبھی کبھی وحشت زدہ ہوتی کی آنکھوں کا جادو بھی اپنے میں سمیٹ لیا کرتی تھیں۔

اس کے بال امڈتی گھٹاؤں کی طرح تھے۔ سیاہ راتوں سے بھی تاریک اور جھر کے لہجوں سے بھی طویل۔ اس کی نازک ہڈت پر کبھی بالیں بدل کر گھبرے ہوتے تو کبھی لمبی چوٹی جو بیشادہ کھلی ہوتی۔ پڑے رہتے۔ یہ بال اس کے حسن میں بے ہما اضافہ تھے۔ اسے احساس بھی تھا۔ پھر بھی وہ انہیں سنہالے سمیٹے۔ کبھی کبھی اچھٹا جاتی کہ انہیں کٹوا دینے کو چل اٹھتی۔
 لیکن

اس کی ہر خواہش پوری کرنے والے اس کے ابو یاں کٹوائے کی کبھی اجازت نہ دیتے۔ ان خوبصورت بالوں سے انہیں بے حد پیار تھا۔

بیٹا شرف و شک لڑکی تھی۔ اس کی تربیت مشرق و مغرب کی استراحتی خوبیوں پر ہوتی تھی۔ اس کے گھر کا باول بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ نہ ہی دقناوی تھا۔ نہ ہی الزا ماؤرن۔

اس نے بی اے کا امتحان دے دیا تھا۔ اس کی سیلاب بھی تھیں۔ دوست بھی۔ کسی سے ملنے جلتے پر پابندی نہ تھی۔ لیکن اس آزادی میں بھی ایک غیر محسوس بندش تھی۔ بیٹا ایسی نا بھہ نہ تھی کہ وہ اسے بچان نہ پاتی۔ آزادی اور آوارگی میں جو فرق ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ دیے بھی سادگی اور پاکیزگی اس نے اپنی معصوم و سادہ لوح لباس سے ورنہ میں پاتی تھی۔ وہ فیشن ایبل بھی تھی۔ جدید ترین لباس بھی پہنتی تھی۔ گھونٹے پھرنے کی بھی شائق تھی سیر و تفریح کی بھی دلدادہ تھی۔ لیکن یہ سب چیزیں ایک حد بندی کے اندر آتی تھیں۔ وہ وقت سے پیچھے تھی نہ آگے۔ بس وقت کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اور اس کی اجازت اس کے پیارے ابو نے فراہمی سے دے رکھی تھی۔

اگر شہ نے آخری سگریٹ ادھ جلا ہی پھینک کر لوٹ کی نو سے مسل دیا ندی کے اوپر بنے لکڑی کے پتھروں کے لیے چھوٹے سے پل سے بیٹا آئی دکھائی دی۔ وہ ایک اوائے بے نیازی سے قدم اٹھاتی چلی آ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پوری کائنات جھومتی چلی آ رہی ہے۔ کچھ موسم کا حسن۔ کچھ بیٹا کا وجود وارش پر خود فراموشی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔
 لیکن دکھ کا احساس بھی نہیں گیا۔ اس نے مرکز بیٹا کو دیکھا۔

ندی کا چھوٹا سا پل۔

خوبصورت منظر۔

حسین بیٹا۔

اور اس کے پس منظر میں اونچی محل نما حویلی۔

ارش کی کو یوں لگا جیسے وہ بہت نیچے۔ بہت ہی نیچے کھڑا ہے۔ اور یہ سب اونچی چیزیں اسے گردن کو اٹھا کر دیکھنے کی سعی کرنا پڑ رہی ہے۔

”ارشی۔“

”ہوں۔“

”تم کچھ آج کل اداس لگ رہے ہو۔“

”تم نے کیسے جانا۔“

(یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ جذبہ اپنی پہچان آپ ہی کرادیے ہیں ارشی محترم۔“

”بہت ذہین ہو۔“

”اللہ کے فضل سے۔“

”ٹینا۔“

”ہوں۔“

”مستعان کی اہی تمہارے ہاں آئی تھیں۔“

”آسمان کی اہی۔ زمین کی بہن، یادوں کے بھائی۔ ہائے ارشی ہمارے ہاں تو ہر کوئی آتا ہے۔“

اپنی بات پر وہ خود ہی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے کھلتے تھمتے کالوچہ اور ارتعاش پر دیگر بے فضا میں پھیلا رہا۔

ارشی ہاتھ میں پکڑے گھاس کے سوسکے ٹکے کو کھاتا رہا۔ وہ اب بھی اداس تھا۔ چند لمبے خاموشی رہی۔ ٹینا درخت کے تنے پر بٹکی جی جھٹ لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے پکا پھلکا اور بالکل سادہ سا سوئی لباس پہن رکھا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی انفرزائٹ سوار ہی تھی۔ اپنی ذات میں وہ یکا تھی۔ موسم کا اثر تھا یا اس کی اپنی شہر و پختل طبیعت۔ وہ اداس ہونے کے موڈ میں قطعی نہ تھی۔

مثبت سوچ کی اساس پر باتیں کرنا چاہتی تھی۔ منفی انداز میں کچھ کہنے کو تیار نہ تھی۔

”اے مسٹر۔“ ارشی کے گم سم پیٹھے رہنے پر اس نے گھاس کا ٹیلا اٹھا کر ارشی کے کان پر پکیرا۔

”ہوں۔“ وہ ہلا اور وہ اچھٹے سے کان ملتے ہوئے بولا۔

”آج آف کیوں ہو۔“

”بہن یو نہی۔“

”مجھے ٹالنے کی کوشش بیکار ہوتی ہے۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔“

”کوئی خاص بات نہیں۔“

”جو میں کموں بہت خاص بات ہے تو؟“

”پھر تم ہی بتا دو۔“

”تمہیں عثمان کی اہی کے آنے کی خبر ہو گئی نا۔“

”ہاں۔“

”تو اس میں تمہیں پریشانی کیوں ہو رہی ہے۔“

ارشی نے قدرے رخ مود کر ٹینا کو گہری نظروں سے دیکھا۔ ”تمہارے خیال میں پریشانی نہیں ہونا چاہئے۔“

”بالکل نہیں۔“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ۔ اس لئے کہ۔“

”بات نہیں نا بہن پائی۔“

”یہ بات نہیں ارشی۔ دے دے تم خواہ مخواہ ہی پریشان ہو رہے ہیں۔ دیکھو موسم کتنا خوبصورت ہے۔ پچھلے چند دن کتنی گرمی رہی۔ آف کل رات کتنا حسین موسم تھا۔“

”مجھے اوٹ ٹانگ باتوں میں الجھاؤ نہیں ٹینا۔“

”ٹینا کو دکھ موٹے سے پیچھے اتری۔ اور ارشی کے عین سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کے وجہ سرایا کو بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھا اور پھر سہیجگی سے بولی۔“

”تم بے فکر رہا کرو۔“

”یہ میرے بس کی بات نہیں ٹینا۔“ وہ جبک کر نیا ٹیلا اٹھا تے ہوئے بولا۔ ”جانے کیوں مجھے مستقبل سے خوف آنے لگا ہے۔“

”بزدل کہیں کس۔“

”سچ کہتا ہوں۔ ٹینا۔ اس کی وجہ شاید ملازمت کے حصول کی ناگاہی بھی ہو۔ پھر بھی۔“

”ہائے ہائے تم بھی کیا کہتے ہو ارشی۔ جو جہد آجھ دن ہوئے ملازمت تلاش کرتے اور رونا رونے لگے ناگاہی کا۔ مل ہی جائے گی۔“

”مل جانا چاہئے اب تک۔“

”یہ تو اتنی بڑی بات نہیں۔“

”تمہارے لئے نہیں۔ لیکن میرے لئے ہے۔“

”اتھما بھی ہوگی۔“

مینا سسکراتے ہوئے چھوٹے سے پتھر پر بیٹھ گئی۔ اس کی پشت پر بکھرے بال ہواؤں کی چھیڑے لرانے لگے۔ اور مسکتے باخول میں اس کے بالوں کی مخصوص خوشبو پھیلنے لگی۔

ارشٰی اسے اداس نظروں سے دیکھتا رہا۔ یہ معصوم الزاور پرانہ لڑکی اسے کتنی محبوب تھی۔ وہ اس کے بغیر ہی سکتے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ چاند بے سے خود مند تھے۔ لیکن ان دونوں مایوسیوں کی بجلی بجلی تھیں۔ دھول کی طرح ان پر ہستی جاری تھی۔ وہ جذبات سے ہٹ کر بھی سوچنے لگا تھا۔ مینا اور اس میں طبقاتی فرق کتنی تعارف کا محتاج نہ تھا۔ اچھی سی ملازمت کے لئے دو ڈروپ بھی اسی سلسلے میں تھی۔

لیکن

مٹھان جیسے جھادری لوگوں کی موجودگی میں اسے ملازمت کے حصول کے باوجود مینا کا حصول ناممکن نظر آنے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا مینا کی محبت میں بھی اتنی ہی صداقت ہے ویسا ہی خلوص ہے۔ لیکن طبقاتی کنوارا ایسے بندھن بندھے سے کاتی چلی آتی تھی۔ اس کی اپنی ذات لاکھ خوبیوں کا مرقع سی پھر بھی وہ دولت مند نہ تھا۔

مینا اپنی جگہ سے اٹھی اور ہاتھ ارشی کی طرف بڑھا دیا۔

ارشٰی نے ہیدل سے ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

مینا نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”آؤ اوپر چلے ہیں۔ وہاں۔ جہاں ندی موزکٹ کر گرتی ہے۔“

ارشٰی بنا کچھ بولے اس کے ساتھ ساتھ چلے گا۔

گھاس اور گول گول پتھروں کو پاؤں تلے دوڑتے دونوں تقریباً خاموشی سے راہ کاٹتے ہوئے اس موڑ پر جا پہنچے۔ جہاں ندی کوئی دس بارہ فٹ کی بلندی سے نیچے گرتے ہوئے خاصا شور مچا رہی تھی۔ لال سلوٹوں بھری چادر کی طرح اک قوتار سے پانی گر رہا تھا۔ نیچے جھاگ پیدا ہو رہا تھا۔ پبلے اٹھ رہے تھے۔ بیٹھ رہے تھے۔ ہوائیں کچھ تیز ہو رہی تھیں۔

فضائیں نمی بڑھنے لگی تھیں۔

اور

کالے کالے بادل مغرب کی جانب سے اٹھتے ہوئے فلک کے سینے پر تیزی سے پھیل رہے تھے۔ دونوں بڑے بڑے کالے پتھروں پر ایک دوسرے کے قریب بیٹھ گئے۔

”ارشٰی۔“

”ہوں۔“

”بھئی تمہاری یہ چپ مجھے بہت بری لگ رہی ہے۔“

وہ ہنسی بھری نظر دیا۔ ”اور پھر یوں۔“ مجھے بھی اپنا آپ بہت برا لگ رہا ہے۔ تمہارے ساتھ بیٹھا کچھ بچ بچ نہیں رہا۔“

”ارشٰی۔“ مینا ایک دم سنجیدہ ہو کر تیزی سے بولی۔ ”میں بہت بور کر لیا تم نے سیدھی سیدھی باتیں کرو۔ نہیں تو میں ابھی اٹھ کر چلی جاؤں گی۔“

ارشٰی نے مسکرائے کی کوشش کی۔ لیکن ناگم رہا۔

”میں نے سوچا تھا آج کمری شام ہو جائے تک تمہارے ساتھ یہاں رہوں گی لیکن تم۔“

”مینا۔“

”جاؤ میں نہیں بولتی تم سے۔“

”بیٹھو ایسا نہ کہو۔ میں مریاؤں گا۔“

”قلبی مکالے مت بولو۔“

”مینا میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ میں نے بہت کوشش کی مٹھلے کی۔ لیکن حقیقت اپنی جگہ قائم ہے۔ میں اور تم۔ ایک دوسرے کے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور ہیں۔“

”دولت کو تم اتنی اہمیت دیتے ہو۔“

”کاش اسے اہمیت نہ دیتا میرے بس میں ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ میں تمہیں جیتنے کی بازی ہار چکا ہوں۔“

”یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم میری زندگی ہو۔“

”ہاں۔“

”ارشٰی۔ تم کہتے ہو جس ہو بے رحم ہو۔“

”میں نہیں مینا۔ میرے حالات۔ یا پھر تمہارا حسب نسب تمہارا سماجی درجہ تمہاری دولت۔“

”یہ سب باتیں تمہیں پہلے بھی معلوم تھیں۔“

”جوش جنوں میں ان چیزوں کے تعلق کسی سوچا ہی نہ تھا۔“

”اب جوش جنوں اتر گیا۔“

”نہیں مینا۔“

وہ بڑے دکھ سے مینا کو دیکھنے لگا۔ مینا بھی اب سنجیدہ تھی۔ لیکن اداس قطعی نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں اعتماد کی قوی جھلک تھی۔

”تمہیں اس خبر نے متحوش کر دیا کہ مٹھان میرے رشتہ کا طلب گار ہے۔“ وہ بولی۔

”ہاں۔“ بے دھڑک ارشی نے کہا۔

”تم لاعلم ہو شاید۔ اس سے پہلے بھی کئی رشتے آپکے ہیں۔“
 ارشی نے پوری آنکھیں کھول کر دیکھا۔
 ”پھر!؟“ وہ بے صبری سے بولا۔

”تم بے فکر ہو۔ ابو میری خوشی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔“
 ارشی نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”سچ کہتی ہوں۔ میرے ابو مت اچھے ہیں۔ میری کوئی خواہش بھی رد نہیں کرتے۔“ وہ
 اتراتے ہوئے بولی۔

”تمہاری بال کٹوانے کی خواہش بھی تو شدید ہے۔“ ٹیک دم ارشی کے ہونٹوں سے یہ جملہ
 مایوسی بن کر نکل گیا۔

وہ اس کی بات سمجھ گئی۔ پھر مسکرائی۔ یوں لگا جیسے نورانی پھوار پڑنے لگی ہو۔ آہستگی سے بولی۔
 ”تم مایوسی کی انتہاؤں کو چھونے لگے ہو ارشی۔ حالانکہ میرے لئے یہ بات تمہارا ”پریشان کن
 نہیں۔ ابو میری بات بھی نہیں ٹال سکتے۔ بال کٹوانے کی بھی خوب کمی۔ میں ضد پکڑ لوں تو شاید ابو
 بھی مان جائیں۔ لیکن جانتے ہو ارشی میں اس سلسلہ میں اپنی خواہش کیوں دبا لیتی ہوں۔“
 ”کیوں۔“

”ابو کو میرے بال بہت پسند ہیں۔ اس لئے کہ یہ بال بالکل اسی کے سے ہیں۔ میں نہیں چاہتی
 ابو کی یادوں کا یہ سلسلہ بکھر جائے۔ ان کی خواہش کا احترام ہے ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔
 ارشی نے پہلی بار گہری مسکراہٹ سے دیکھا۔ بے اختیار ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور
 دوفر جذبات سے دباتے ہوئے بولا۔ ”دینا۔ مجھے مایوس نہیں ہونا چاہئے نا۔“
 ”قطعاً نہیں۔“

”تمہاری بے پناہ دولت چار کے رشتوں میں حائل تو نہ ہوگی۔“
 ”اللہ۔“ وہ اک شان بے نیازی سے مسکرائی۔ پھر اپنا سر اس کے کندھے سے ٹکاتے ہوئے
 بولی۔ ”تم سارے وہم دل سے نکال دو ارشی۔ ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ اور یہ دولت۔ جو
 تمہارے لئے ہو اپنی ہوئی ہے نا۔ وہ۔ ساری کی ساری ہماری تو نہیں۔“

”کیا؟ ارشی نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بے اختیار اسے قریب کر لیا۔

”یہ ساری دولت؟“ ”جی ہاں۔“ ”فرجاوا انکل کی ہے۔“ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔
 ”فرجاوا انکل کون۔“ ارشی بے تابی سے بولا۔

”کسی فرصت کے وقت سناؤں گی بہت لمبی کہانی ہے۔ بس اب خوش ہو جاؤ۔“
 ”خوش ہوتا۔ اس نے قدرے توقف کے بعد ارشی کی آنکھوں میں جھانک کر مسکراتے ہوئے

پڑھا۔

ارشی نے اس کی کمر میں حائل بازو کو سمیٹ لیا۔ دینا دنیا کی سب سے بڑی محتاج تھی۔ جو اس
 کی آنکھ میں سٹ آگئی تھی۔
 اپنی خوش نصیبی پر وہ نازاں تھا۔

”وہ تو پھر کابٹ تھا شاید۔ کوئی خوشی کوئی تجسّس اس کے چہرے سے ظاہر نہ ہو رہا تھا۔

ہاں کسی حد تک پچھتاوے کی جھلک اس کی آنکھوں میں ضرور تھی۔ وہ چپ چاپ سوچ رہا تھا۔ کہ وہ کیونکر واپس آگیا ہے۔ کون سی کشش تھی جس نے اسے لوٹنے پر مجبور کیا۔ کون سے بندھن تھے جو اسے یوں مدتوں بعد یہاں بھیجے لائے۔

اپنے جذبات کا پوری ایمانداری سے تجزیہ کرنے کے باوجود اسے اپنا آنا ٹھیک رہا تھا۔ اپنا وجود نادر خواہ کا بوجھ لگتا رہا تھا۔ اپنی شخصیت بیکاری نظر آرہی تھی۔

گل بانو مریچکی تھی۔

وہی کشش تھی۔

وہی بندھن۔

لیکن اب تو موت نے اس کشش کو توڑ دیا تھا بندھن کو کاٹ دیا تھا۔

اس کشش اور بندھن کا اس نے عمر بھر اعتراف نہ کرے گا لیکن کیا تھا۔ اپنے آپ سے چھپتا ہوا تھا۔ برسوں گمناہ کی زندگی بسر کی تھی۔

اب گل مریچکی تھی۔

اور

وہ واپس لوٹ آیا تھا۔ جب وہ زندہ تھی تو اس کی قربت سے دور بھاگ گیا تھا۔ اب اس نے اپنی اس کے احساس سے آنکھیں میچ لیں۔ بیس برس تک وہ فطرت سے لڑتا رہا تھا۔ اپنے آپ سے اپنی سچائی اور صفائی سے جھوٹ ہوتا رہا تھا۔

سوچوں میں ڈوبا وہ طیارے سے باہر آیا۔ خاتون نے دور ہی سے اپنے عزیزوں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ اسے خدا حافظ کہہ کر جلدی جلدی بیڑھیاں لگائی۔ اس کی بے باکی فرجادی کے لیوں کی سکر اہٹ لگتی۔

انٹر مسافروں کے استقبال کے لئے لوگ آئے ہوئے تھے۔ دور ہی سے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ ٹی ٹی سے پکار رہے تھے۔ چہرے مسرت سے ہنسا رہے تھے۔ مسافروں اور استقبال کرنے والوں کے درمیان بے انتظار کے طویل لمحے ختم ہو چکے تھے۔ اب چند گھنٹیاں تھیں۔ لیکن یہ انتظار کی شدت اب انتہا تھیں۔

فرجادی نے آخری بیڑھی پر کھڑے ہو کر دو دو پیش پر نگاہ ڈالی۔ بیس سالوں میں ہوئی اڑے کے زمین و آسمان بدل چکے تھے۔ ٹی ٹی کمرے نے بن گئے تھے۔ دیواریں اٹھ اٹھ تھیں۔ بلڈنگیں بن گئی تھیں۔ ہال بنا تھا۔ لاؤنج تھے۔ وہ آہستہ آہستہ پتلا جا رہا تھا۔

اس کے استقبال کو کوئی نہیں آیا تھا۔ آتا بھی کون۔ اس نے کون سا کسی کو اطلاع دے رکھی

طیارے سے اترنے والوں میں وہ سب سے آخری آدمی تھا۔ طیارہ انرپورٹ پر رک چکا تھا۔ بیڑھی لگ چکی تھی۔ اترنے والے مسافروں میں اک لپٹلی سی جگ لگی تھی۔ چہروں پر خوشی کا تاثر تھا۔ کوئی مدتوں پچھڑے ہوؤں سے ملنے والا تھا۔ کوئی سرزمین وطن کی قدم پوسی کے لئے بے تاب۔ کوئی ضرورتوں کا مارا وطن پہنچ کر خوشی و مسرت کے لمحوں میں اپنی پریشانیوں کو ڈوبا تھا۔

فرجادی نے ایک نظر سب پر ڈالی اور پھر فرجادی ہر ایک کا جائزہ لیا مجموعی تاثر خوشی و سکون کا تھا۔ سب طیارے سے اترنے کو بے تاب سے نظر آ رہے تھے۔ وہ ان کے چہروں سے ان گنت کمائیاں تراش رہا تھا۔ ہر فرد ایک پوری داستان ہی تو ہوتا ہے۔ خوشیوں غموں اور مایوسیوں امیدوں کا منصوبہ کمائی کے ہی تو عناصر ہوتے ہیں۔

وہ خود بھی تو اک داستان تھا۔

داستان جو مکمل ہو چکی تھی۔

نئے گل بانو کی موت نے تکمیل کو پہنچا دیا تھا۔

بیس برس تک وہ اک ادھوری کمائی تھا۔

براہر میں بیٹھی قبر حوریت اپنا بیگ جھٹلائے طیارے سے باہر آنے کو اٹھ چکی تھی۔ یونہی اس کی نظر پڑی۔ فرجادی بڑے پرسکون انداز میں بیٹھا تھا۔

”آپ نے یہاں نہیں اترتے۔“ وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

”ضرور اترتا ہے۔“ فرجادی نے ایک گہری سانس لی۔

”بڑے اطمینان سے بیٹھے ہیں آپ۔“ چھٹی سیٹ سے اٹھنے والے نوجوان نے مسکرا کر کہا۔

”بیس برس بعد آئے ہیں محترم ان کی بے باکی تو قابلِ دید ہو تا چاہئے تھی۔“ خاتون نے حیرت

بھری مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

وہ بیٹکی سی ہنسی لیوں میں دیاٹے اٹھ کھڑا ہوا۔ اک تھکن آلود انگڑائی لی۔ واقعی اس کی بے

تابائی کے قابل ہوتا چاہئے تھی۔

لیکن

تھی۔ اس نے تو آصف تک کو مطلع نہ کیا تھا۔
اور

اسی لئے دیشنگ ہال میں رک کر وہ سوچ رہا تھا کہ اسے سیدھے حویلی جانا چاہیے۔

یا

کسی ہوٹل میں قیام کرنا بہتر ہو گا۔

اس نے ہوٹل میں جانا بھی بہتر سمجھا۔ وہاں رک کر کچھ دیر آرام کر کے۔ کچھ سوچ سمجھ کر حویلی جانا بہتر تھا۔

ہوئی آٹھ بجے کی رسمی کارروائیوں کے چھٹکارا لے رہی وہ باہر نکلا۔

ٹیکسی لی اور اسے شہر کے بہترین ہوٹل میں لے جانے کا کہہ کر اپنا سوت کیس بیک اور بریف کیس رکھا۔

ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں پہنچ کر اس نے سکون کا گہرا سانس لیا ایئر کنڈیشنڈ کمرہ ہوتی چتر کے مقابلہ میں یہ حد ٹھنڈا لگ رہا تھا۔

اس نے چیزیں جگہ جگہ ٹھیک کر کے رکھیں۔ دوسرے کپڑے نکلے اور غسل خانے میں چلا گیا۔

سوچوں نے اس کا داغ چھکا دیا تھا۔ یہ ٹکٹان اس کے وجود پر بھی چھا رہی تھی۔ نمائنے سے کچھ سکون ملا۔ باہر نکلا تو وہ چائے لے آیا تھا۔

اس نے ناظمین سے چائے پی۔

تازہ دم ہو کر وہ کھڑکی کے قریب کھڑا ہو گیا۔ پردہ ہٹا کر وہ کافی دیر باہر دیکھتا رہا۔ اپنا دیس۔ اپنے لوگ۔ اپنی سڑکیں۔ اپنی چیزیں۔ اسے کوئی چیز بھی تو اپنی ہی نہ لگ رہی تھی۔ کوئی شے بھی تو غیر مانوس نہ تھی۔

میں سال دور رہنے کے باوجود یہ چیز سے قربت کا احساس ہو رہا تھا۔

اور یہ احساس یقیناً خوش کن تھا۔

سر پر زحل رہی تھی۔ وہ ایک گھنٹے کی فینڈ نکال کر اٹھا۔ اب وہ چُ سکون اور تازہ دم تھا۔ وہ حویلی جانے کے لئے تیار ہوئے گا۔

اس نے اپنا بہترین سروس پنا۔ ٹائی کی گرہ لگاتے ہوئے اس نے اپنے چہرے کو دیکھا۔

اسے اک لاشعورِ سادہ چمک لگا۔ میں سالوں نے اس کے چہرے پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑے تھے۔ اس کے بالوں میں کہیں کہیں سفید تار چمک رہے تھے۔ اس کی پیشانی پر چند سلوٹھیں تھیں۔ اس کا گوشت گالوں کے قریب ذرا بو جھل نظر آ رہا تھا۔

اسے یاد آ رہا تھا کہ بیس برس پہلے جب وہ چیتوں جیٹکس سالہ جوان تھا تو کس قدر خوبصورت

تھا۔ اس کا ہوا جسم۔ اس کی کھلی ہوئی گندمی رنگت۔ اس کی جمیل کی گمرائیاں لئے خوبصورت آنکھیں۔ اس کے سیاہ چمکیلے بال ستواں ناک جذباتی سے ہونٹ۔

آئینہ میں وہ بیس برس پیچھے لوٹ کر اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا۔

ہمت سی یادیں آنکھوں میں سمٹ آئیں۔

وہ گہرا کیا۔ یہ یادیں۔ وہ یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گیا۔

اب اس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ بوڑھا نہیں تھا۔ اس کی رنگت بھی نہیں وحند الی تھی۔ آنکھوں میں سوچ اور افکار کے گھلاؤنے اور حن بھریا تھا۔ جس میں جوانی والا تازہ نہ

تھی۔ لیکن جھکاؤ بھی نہیں تھا۔ وہ بد صورت نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس کی گوری دوستوں کا تو مشترکہ ہل تھا۔ کہ وہ انتہائی حسین مرد ہے۔ تاہم اور کھلڑے لڑکوں کے مقابلہ میں پختہ عمر مردان

گاہوں کو زیادہ مرغوب ہیں۔

میں لڑکا اسے پارے میں ریمارکس یاد کر کے دھمکاتا رہا۔

کمرے کو لاک کر کے وہ لفٹ کے ذریعے نیچے آگیا اور ہوٹل سے باہر نکل کر پلے گا۔

یہ راستہ مانوس تھے۔

یہ راہیں جانی پہچانی تھیں۔

وہ جلی شہر سے چھ میل دور تھی۔ ٹیکسی کے بغیر وہ وہاں نہیں جا سکتا تھا۔ پھر بھی وہ کتنی ہی دیر لپکتا رہا۔ وطن کی مٹی سے شاید براہِ راست مس ہونے کی خواہش تھی۔

پھر اس نے ٹیکسی لے لی۔ سارا راستہ وہ باہر دیکھتا رہا۔ بہت کچھ بدل گیا تھا۔ کئی چیزیں پرانی تھیں۔ سڑکوں کے دونوں اسیستہ درخت وہی تھے۔ وہ ان درختوں کو جانتا پہچانتا تھا۔ ان درختوں

مستحکم میں کئی عمارتیں بنی ابھرتی تھیں۔

ٹیکسی حویلی کی طرف جانے والی سڑک پر ہوئی۔ فرجاد کا دل اچھلنے لگا۔ اور جب دور سے اس کو

الی، المانی، دی۔ تو اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ اسے یوں لگا جیسے حویلی میں امان بی اپنے ہاتھ لائے اس کے والدینہ استقبال کو کھڑی ہیں۔

امان بی کا نورانی چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ اور پھر اس چہرے کے تعاقب میں کئی چہرے

وہاں میں آئے گئے۔ وہ دھمناک گاہوں سے ان کو دیکھنے لگا۔

ٹیکسی رک گئی۔

”باہری اترتا ہے صاحب بانڈر لے چلوں۔“ ڈرائیور نے گردن موڑ کر اس سے پوچھا۔

”اگر“ اس نے صرف ایک لفظ کہا۔ لیکن اس لفظ کی آوازیں کا شاہانہ پن اور دبہ ڈرائیور

نے محسوس کیا۔ غور سے اسے دیکھا اور گاڑی اندر لے گیا۔
فرجاد کے جذبات اچھل پھیل ہو رہے تھے۔ اپنا گھر اٹا، اسے پتہ نہ چل رہا تھا کیا ہے
رہا ہے۔

ٹیکسی سے اتر کر اس نے کرایہ اور کیا۔ ٹیکسی چلی گئی۔ اور وہ نگاہوں سے ایک ایک شے
مجھ سے کرتے لگا۔

حویلی پر بھی میں سال اپنے قدموں کے نشان چھوڑ گئے تھے۔ اس پر بھی وہ چمک دکھ نہ تھی
جو شباب کا خاصہ ہوتی ہے۔ وہ رونق وہ گماں بھی وہ پھل کچھ بھی نہ تھا۔ اسے تو کوئی انسان بھی نظر
آیا۔ حالانکہ حویلی کے اندر باہر انسان ہی انسان نظر آیا کرتے تھے۔ صدر دروازہ تو خالی ہونے
سوال ہی نہ تھا۔

لیکن اب یہ خالی خالی سوسائٹا ماحول دیکھ کر اسے اپنے دیران دل کا خیال آیا۔ دیرانی کہیں بھی
ہو لاؤ بیڑی ہوتی ہے۔

کئی داپے کئی دوسو سے اس کے دل میں جاگ اٹھے۔ گل پر مچکی تھی۔ کیا خبر آصف بھی۔

لیکن اس نے اپنا سر زور سے جھٹک دیا۔ ایسی بات ہوتی تو گل کے مرنے کی خبر دینے والا یہ خبر
بھی سنائے میں تامل نہ کرتا۔

اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پچھلے حصے میں کچھ بچے کھیلنے نظر آئے تو اس نے قدرے
سکون کا سانس لیا۔ پھر اس نے دامن ہاتھ کیا رویوں میں جھٹکے انسان کو بھی دیکھا اور وہ ذرا اطمینان
سے قدم آگے بڑھتا ہوا آگے بڑھتا ہوا آگے برآمدے کی طرف گیا۔

لبا چڑا برآمدہ چمک رہا تھا۔ اور اس میں کھلنے والے متعدد دروازوں اور کڑکیوں کے پھٹنے
رنگ و روغن تار رہے تھے کہ یہ جھڑ خیر آباد نہیں۔ کچھ چیزیں پرانی تھیں۔ اپنے پرانے ہی بنی کی
وجہ سے نظروں میں اتر رہی تھیں۔ کچھ نئی تھیں۔ جن کا نیا پن ذوقی نظری کی تسکین تھا۔
وہ ابھی بڑے دروازے کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ دائیں ہاتھ کا دروازہ کھلا۔

اور

اور

فرجاد جیسے سکتے میں گیا۔

”کھل بانو۔“ بے اختیار اس کے ہونٹوں سے پھسل گیا۔ اس کی آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک
کھل گئیں۔ اور ایک سیکنڈ کے جزاویں حصے میں کئی سوچیں اس کے ذہن کو داغ کیں۔ گل بانو
کے مرنے کی غلط خبر۔ اپنی واپسی کا پتہ نہ تھا۔ اس کی رگت قنق ہو گئی۔

اور

اس کے سینے سے پہلے ہی وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل آئی۔

فرجاد نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔ اور پھر سکول کر رہا گی سے اسے دیکھا۔

”میں گل بانو نہیں۔ بیٹا ہوں۔“ وہ حسب عادت خوشی سے مسکراتے ہوئے اس کے قریب
آئی۔

”بیٹا۔“ فرجاد اب تک ششدر تھا۔ لیکن اب اپنی محافت کا بھی احساس ہوا۔ گل بانو نہیں
اس پرانی بات تھی۔ اور بیٹا کا بھرپور جواں پیکر گل بانو سے مناسبت رکھنے کے باوجود وہیں سالوں کے
لاٹیلے کا ظلم کھلا اعلان تھا۔

”آپ؟“ فرجاد نے اسے سر تپا حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں یسین محترم۔ گل بانو میری امی تھیں۔“ وہ ہلکے سے تبسم سے بولی۔

فرجاد کو یہ تبسم جانا پہچانا لگا۔

”ہم۔ گل بانو کی بیٹی ہو۔“ فرجاد نے اس کے باوجود کہہ دیا۔

”ہاں۔ گل بانو میری امی تھیں۔ شاید آپ ان کو جانتے ہیں۔“ وہ فرجاد پر سرسری نظر ڈال کر
ابہر کہنے لگی۔

وہ قدرے رخ موڑنے لگی تھی۔ اس کے بال لہرا رہے تھے۔ فرجاد نے ان بالوں کو دیکھا۔ یہ بال
گل بانو کے تھے۔

”آپ کا اسم شریف۔“ بیٹا نے پوچھا۔ ”کہاں سے آئے ہیں۔ ابو سے ملنا ہو گا۔“

فرجاد تو سالوں کے پیکر میں پیکر ا رہا تھا۔

اسے یوں کھویا ہوا دیکھ کر وہ کھٹکنا کر ہنس پڑی۔ ہنسی کی یہ کھٹک فرجاد نے پورے بیس سال
ہی۔

”آپا ہے آپ پہلی بار یہاں آئے ہیں۔ مجھے آپ سے پہلے نہیں دیکھا۔“ وہ مسکراتی۔

فرجاد نے نئی سے انداز میں سر ہلایا۔ لیکن اثبات اس کے انک اٹک سے پھوٹ رہا تھا۔

وہ کچھ نہیں سمجھی۔ بے تکلفی سے بیٹے ہوئے بولی۔ ”اسی لئے اسی لئے.....“

فرجاد گل بانو کے سارے انداز دیکھ رہا تھا۔

وہ بولی۔ ”میں اپنی ماں کی ڈپلکریٹ کاپی ہوں محترم۔“

”ہاں تو اندر چل کر بیٹھنے دینے ابو شاید آج رات گاؤں ہی رہیں گے آپ نے ان ہی سے ملنا
کا۔“

وہ گل بانو ہی کی طرح باتیں کہنے جاری تھی۔

اور خوف کا احساس فرجاد کو اپنے رگ دوپے میں پھیلتا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ ابھی تک یقین اور بے یقینی سے ٹینا کو دیکھ رہا تھا۔ اسے سمجھ نہ آ رہا تھا کہ رک جائے یا واپس لوٹ جائے۔

لیکن

گردش میں آئے ڈرے کو قیام کمال۔ بھونچکا ششدر اور حواس باختہ سا ہو رہا تھا۔ میں برس فرار کی ریاضت خاک میں مل رہی تھی۔

ٹینا بڑے دروازے کی طرف بڑھی۔ "تشریف لائیے۔" اس نے پلٹ کر قدرے جھک کر کہا۔

"دہنیں۔" وہ جلدی سے مڑا۔

"ایلو کو کیا نام بتاؤں۔" وہ بولی۔

"کچھ نہیں۔ میں کل صبح آجاکوں گا۔" وہ تیز قدم اٹھاتے ہوئے بنا اس کو دیکھے بولا۔ وہ اس آواز کو میں برس بھلا رہا تھا۔ لیکن یہ آواز پھر کاکر کچھ اس کے قریب سے آ رہی تھی۔ وہ اس سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔

اور

وہ تیز قدم اٹھاتے واپس جا رہا تھا۔ آصف صاحب کا ملنے جلنے والا جان کر حمو نے اسے تشویش سے سلام کیا۔ اور کیا روں میں جھگے والی نے بھی خیدہ کر کر سیدھا کرتے ہوئے ہاتھ ماتھے پر رکھ کر تشویش دی۔

وہ دونوں اس کو پہچان نہ پائے تھے۔ حالانکہ اس نے دونوں کو پہچان لیا تھا۔ لیکن اپنے متعلق بتایا کچھ نہیں۔

کچھ بتانے کی اسے فرصت ہی کمال تھی۔ اس کے من میں الجھن بچی تھی۔ ذہن منتشر ہوا جا رہا تھا۔ ایک ہی تصویر کئی رخ سے سامنے رہی تھی۔

گل بانو کی تصویر

گل بانو

جو

اب

ٹینا تھی

جائے کہ دیکھے ہوٹل تک پہنچا۔

اور جب وہ اپنے بید پر چٹ پڑا۔ خالی خالی نظروں سے چھت کو گھور رہا تھا۔ تو بائیں اک ٹو اتار سے بوند بوند اس کے ذہن میں جھک رہا تھا۔

حویلی نئی ٹوبلی دہن کی طرح آرامستہ تھی۔ رنگا رنگ روشنیوں سے فضا جھنڈ نور بنی تھی۔ فائذی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ چمن آرامستہ تھے۔ دروایم سجے ہوئے تھے۔ حویلی کے خدام غلے پلٹ چیتے لباسوں میں ادھر سے ادھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ لذیذ کھانوں کی مک فضاں رہی ہوئی تھی۔

پچھلے وسیع و عریض محن میں دعوت کھلانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ حویلی میں پہلی بار کرسیوں بھروں پر کھانا کھایا جانے والا تھا۔ اس علاقے میں یہ نئی چیز تھی۔ دور دراز کے بڑے گھروں سے دورے خانہ سالانہ پائے گئے تھے۔

حقہ چمن میں دھول ہا ہے والے بیٹھے تھے۔ میرا میں نے عورتوں کے لباس پہن رکھے تھے۔ اور وہ حاضرین کو اپنی نسوانی ساختہ حرکات سے محفوظ کر رہے تھے۔

دوسری طرف شہرے کو اپنی ہوائی ایندینج رہا تھا۔ دیمائیوں کے لئے یہ بیڑی نئی چیز تھی وہ بڑے شوق سے بیڑی کی خوبصورت دھنوں پر سر درجن رہے تھے۔

عورتیں اپنے جھلمل کرتے لباسوں میں حویلی کے اندر محن میں بیٹھی تھیں۔ یہ ریشیں دھولک کی قہار پر یہاں بھی خوشی کے گیت گارہی تھیں۔ روشنیوں کا سیلاب یہاں بھی امنڈا ہوا تھا۔ رشتہ داروں اور دوست و احباب کے علاوہ گاؤں کی دیمائی عورتیں بھی حاضر تھیں۔ نئی بیاتہا دہنیں اپنے عروسی جوڑے پہن کر آئی تھیں۔ ہاتھ پر بھو مرچے تھے۔ ناک تھ سے خالی نہ تھی۔ نیلے پیلے کونے والے لباسوں میں اترا بیڑی پھر رہی تھیں۔ ان کے لئے یہی اعزاز کیا گیا تھا۔ کہ حویلی کے مالک مالی نور محمد نے دعوت میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ اور اس دعوت میں شہری دیمائی کا کوئی امتیاز روانہ نہ رکھا تھا۔ رشتہ داروں اور عزیزوں کی تیز بھی نہ تھی۔

اندرونی محن میں کئی تہت بچے تھے۔ محن میں سرخ قالینوں کا فرش ہو رہا تھا۔ جتوں پر سفید بکری جاوڑی بھی بچھی تھیں۔ کھونٹے بڑے تھے۔ طویل و عریض محن ایسے بے شمار جتوں۔ بھرا دار تھا۔ عورتیں ٹوبلیوں کی صورت بنی تھیں۔ درمیانی غار تک بچوں نے پر کر رکھی تھی۔ کوئی بیٹھا تھا۔ کوئی دوڑ رہا تھا۔ کوئی تلایا زباں لگا رہا تھا۔

دائیں ہاتھ طویل بکدے کے سامنے مسند نما بہت بڑا تخت بچھا تھا۔ زر نگار گاؤں جیتے پڑے

تھے۔ اور کاندانی جھاروں والی چادر اس تخت پر چمک رہی تھی۔

اسی تخت پر اماں بی بی بیٹھی تھیں۔

سفید برقع بے داغ لباس میں اس کا مقدس چہرہ کسی آسمانی مخلوق کی طرح تھا۔ ان کے ارد گرد معزز خواتین برساتن تھیں۔ اور وہ بڑے سلجھے ہوئے انداز میں ان سے باتیں بھی کر رہی تھیں اور ہر آنے والی کا سلام قبول کرتے ہوئے حال احوال بھی پوچھ رہی تھیں۔

ان کی گود میں پانچ سالہ آصف تھا۔ سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والا سرخ و سپید صحت مند بچہ۔

یہ سارا جشن اسی بچے کے لئے تھا۔ اماں بی بی نے اسے آج باقاعدہ طور پر گود لیا تھا۔ یہ صرف قانونی کارروائی نہ تھی۔ دل کے ناٹے اور درد کے رشتے بھی پورے غلوں سے اس بچے سے استوار کئے تھے۔

یہ بچہ ان کے دودرواز کے ایک غریب عزیز کا بیٹا تھا۔ اس عزیز کا نام بھی عزیز تھا۔ اور اماں بی کو اپنی پُر غلوں عادات کی وجہ سے عزیز بھی تھا۔

عزیز حویلی ہی میں رہتا تھا۔ اور اماں بی کے اکوٹے بیٹے عالی نور محمد کا معتد خاص بھی تھا۔ عالی نور محمد ایک بہت بڑی جاگیر کے تھاندارت تھے۔ بے شمار دولت تھی۔ پُر غلوں انسان دوست اور شائستہ ہونے کے باوجود دولت کے واسطے سے انکے دشمن بھی تھے۔ جو ہر لمحے ان کی جان کے روپے روپے تھے۔

اماں بی بہت نیک خاتون تھیں۔ کبھی کسی کا برا چاہنے کا سوال ہی نہ تھا وہ تو دشمنوں کو بھی فراخ دلی سے معاف کر دینے کی عادی تھیں۔ اپنے بچے کی سلامتی کے لئے انکے حضور ہمہ وقت غجر سے دعائیں کرتی رہتیں۔

اور

شاید ان کی دعاؤں ہی کا نتیجہ تھا کہ پچھلے دنوں اللہ نے انہیں بال بال بچالیا۔ اگر عزیز اپنی جان پر نہ کھیل جاتا تو عالی نور محمد کی موت یقینی تھی۔

نور محمد بچ گئے۔

عزیز نے اپنی جان ان پر قربان کر دی۔ اس کا بیٹا آصف دنیا میں تیار ہو گیا۔ چند ماہ پیشتر اس کی امی مر چکی تھی۔

عزیز کی موت کا سبب کو دکھ تھا۔ لیکن جو دکھ اماں بی کو ہوا۔ اس کا اندازہ نہ تھا۔ انہیں سمجھ نہ آتی تھی۔ کہ عزیز کی اتنی بڑی قربانی کا بار سر سے کیسے اٹائیں۔

انہوں نے عزیز کے نام پر غراء میں کھانا تقسیم کیا۔ محتاج خانوں میں اس کے ایصال ثواب کے

لئے ہزاروں روپے دیئے۔ گاؤں کی مسجد کی کروائی۔

لیکن اس کی موت کا صدمہ کسی طور پر کم نہ ہوا۔

بالآخر انہوں نے آصف کو گود لینے کا فیصلہ کیا۔ اپنی ذاتی جائیداد میں اسے اپنا قانونی وارث بنایا اور اس کی پرورش کا ذمہ اپنے کندھوں پر اسی طرح اٹھایا۔ جس طرح فرجاد کا۔

فرجاد کی اماں بی ناٹے کے اعتبار سے وادی تھیں۔ لیکن اس نے بیش اماں بی کو ماں کے روپ میں دیکھا۔ ماں!

جو ملٹن کے الفاظ میں آسمان کا بہترین اور آخری تحفہ ہے۔ اماں بی فرجاد کے لئے دنیا کی حسین ترین شے تھیں۔ اپنی اماں کو اس نے دیکھا تک نہ تھا۔ اس کے پیدا ہوتے ہی شاید اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔

اماں بی اس کے لئے بہت کچھ تھیں۔

سب کچھ تھیں۔

جشن میں وہ بھی شائد لباس پہنے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ چار ساڑھے چار سال کا تھا۔

سایہ آنکھوں والا خوبصورت شہزادہ تھا۔ اپنے مرتبے اور خوبصورتی کے لحاظ سے ہر آنکھ کا آرا تھا۔ چادر اس اور پیاری پیار تھا۔

وہ صحن میں کچھے قاتیلوں پر دھماکتی اور شہری بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اس کی آیا عہداشت کے لئے ساتھ ساتھ تھی۔

اچانک فرجاد کی نظر مندر پر پڑی۔ اماں بی کے پہلو میں نیم درواز آصف تھا۔ اور اماں بی اسے پیار کر رہی تھیں۔

شہری اچکنی کڑواہ کی ٹوپی چوڑی دار پاجامہ پہنے وہ بھی کسی شہزادے کا روپ دھارے تھا۔ فرجاد کو اس کے لباس نے متاثر کیا نہ ہی اسے اس عمر میں اس بات کی تیز تھی کہ اس کی طرح

شائدانہ لباس پہننے والا دوسرا کوئی نہیں ہونا چاہئے۔ اسے تو ذہنی دچکے اس بات سے لگا کہ اس کی اماں بی کی گود میں کوئی دوسرا برائمان تھا۔ اماں بی اسے پیار کر رہی تھیں۔

فرجاد نے آؤ دیکھا نہ ناؤ۔ بچوں کی فوج ظفر موج کو دہیں چھوڑ تھیں کی تیزی سے سمن کی طرف گیا۔ تین فٹ اونچی مندر پر وہ ہلا تردد کو درجہ ادا رہیں کسی نوش کے آصف پر جھپٹ پڑا۔

اماں بی کے کچھ جاننے سمجھنے اور دیگر خواتین کے سوچنے سے پہلے اس نے آصف کو اماں بی کی گود سے کھینچ لیا تھا۔

”تم دونوں بھائی ہو۔ آصف بڑا ہے۔ فرجاد تم چھوٹے ہو۔ ہمیشہ آصف کی بات مانو گے۔ وہی کرو گے جو وہ کہے گا۔ اور آصف تم۔ فرجاد سے ہمیشہ محبت سے پیش آنا۔“
اماں بی نصیحتیں کرتی رہیں۔ فرجاد کا ذہن انہیں قبول کرنا گیا۔ محض اس لئے کہ یہ نیسیجیں اماں بی کی کر رہی تھیں۔ ورنہ وہ سمجھ تو لایا ہی رہا تھا اور اماں بی کی گود میں بیٹھا آصف اسے اچھا تو لایا ہی لگنے لگا تھا۔

آصف قدرے سمجھ دار تھا۔ لیکن فرجاد سے ڈر رہا تھا۔ سہا ہوا بیٹھا تھا۔ فرجاد کی غصیلی دکھوں سے اس کا منہ سادہ جو کانپ کانپ جاتا۔
اماں بی نے انہیں کھانا بھی اٹھنے کھلایا۔ ایک ہی پلیٹ دونوں کے سامنے رکھ دی۔ محبت بدھانے کے یہ پرانے اور آزمودہ اصول تھے۔ اماں بی نے اسی دن سے ان کی تربیت اپنے اصولوں کے مطابق شروع کر دی۔

اپنے دانت آصف کی کھائی میں پوری قوت سے گاڑ دیے تھے۔
اللہ! کتنی مشکل سے آصف کی شیر دانی اس کی گرفت سے چھڑائی گئی تھی۔ اور اس کے پھنکارنے سے کو کم کرنے کے لئے اماں بی کو کیا کیا جتن کرنے پڑے تھے۔
آصف سہم گیا تھا۔

درو کی اذیت سے بلبل کر روئے لگا تھا۔
پاس بیٹھی خاتون نے اسے گود میں بھر کر چار کر لیا۔
فرجاد خشکیں لگا ہوں سے اس عورت کو دیکھنے لگا۔ وہ آصف پر ہل پڑنے کو پہلے لگا۔
”نہ بیٹے۔“ اماں بی مجسم شفقت تھیں۔ ”آصف تمہارا بھائی ہے۔“
”نہیں ہے۔“ وہ غصے سے پھنکارا۔ اور گرد بیٹھی عورت میں مسکرائے گئیں۔
”ایسے نہیں کہتے۔“ اماں بی تنبیہ کی سے بولیں۔ ”آصف تمہارا بھائی ہے بیٹے۔“
فرجاد نے مدد سے انکار کیا۔
”کہنا نہیں مانو گے۔“ اماں بی مخصوص انداز میں بولیں۔ ”میں چلی جاؤں کہیں۔“
فرجاد ڈر گیا۔

وہ جب بھی زیادہ مدد کرتا تھا۔ اماں بی سپاٹ چہرے سے صرف اتنا ہی کہا کرتیں۔ وہ ڈر جاتا۔
اور بڑا چون و چراں حکم مان لیتا۔
”اٹھو آصف کو ادھر لاؤ۔“ اماں بی کا حکم تھا۔ دبے دبے ہنسنے اور مسکرانے والی عورتوں کو انہوں نے آنکھ کے اشارے سے چپ رہنے کو کہا۔
”جاؤ شاہاں،“ بھائی کا ہاتھ پکڑ کر ادھر لاؤ۔ ”اماں بی نے اسی انداز میں کہا۔
فرجاد بے حس و حرکت کھڑا رہا۔
”چلی جاؤں میں۔“ اماں بی نے انہیں کی حرکت کی۔
فرجاد ان کے گلے میں بانٹیں ڈال کر ان سے پھٹ گیا۔
”میرا کہنا مانو گے تو پھر نہیں جاؤں گی، چھوڑ دو مجھے۔“ پہلے آصف بھائی کو ادھر لاؤ۔“
وہ چند لمحوں آصف کو دیکھتا رہا۔ ایک طرف اماں بی کا پیار دوسری طرف آصف کی نفرت پیچھے ہی

تو تھا۔ تذبذب میں رہا۔

”میں جارتی ہوں۔“ اماں بی انہیں کو:۔ کہیں۔

فرجاد ہانگ کر آصف سے لپٹ گیا۔

پھر دونوں اماں بی کی آغوش میں تھے۔ ایک طرف فرجاد دوسری طرف آصف۔ اماں بی باری

باری دونوں کو پیار کر رہی تھیں۔

الماں بی کے من میں خوشبو نہیں پھیل گئیں۔ آصف کا یہ امتزاج ان جذبوں کا اظہار تھا۔ جو اس کے دل میں فرجاد کے لئے پرورش پا رہے تھے۔ یہ جذبے خوش کن تھے۔ اور ان جذبوں کی تقویت کے لئے الماں بی اکثر ان دونوں کو چھٹیوں میں جدا کر دیا کرتیں۔ محبت کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔

الماں بی کا طریق کار کامیاب رہا۔ محبت نے اپنی جڑیں دونوں کے دلوں میں اس قدر مضبوط کر دیں کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہو گئے۔ نفرتوں کا کچھپاؤ اور ٹھنڈا پین جو اماں بی نے لے کر تھوڑی سی کاغذ بن جانا تھا۔ اب بالکل ختم ہو چکا تھا۔

اور

پھر

توفیق یہاں تک آئی کہ چھٹیوں میں الماں بی دونوں کو جدا کرنے کی کوشش کرتیں۔ تو دونوں رد در رد بکھن ہو جاتے۔ ضد کرتے۔ ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ جاتے۔ ہماڑ جانا ہو تا تو اکٹھے۔ گاؤں کی سیر ہوتی تو اکٹھے نضیاں جاتے تو مسک نہ ٹوٹتا۔ سیر و تفریح ہوتی تو انہیں۔ گھوڑ سواری۔ تیراکی۔ پڑھائی کہیں بھی دونوں کا ساتھ نہ ٹوٹتا۔

ایک دفعہ فرجاد گھوڑے سے گر گیا۔ ٹانگ کی پچھلی ہڈی میں ضرب آگئی۔ سال بھر ڈاکٹروں نے اسے ہماگ دوڑا اور گھوڑ سواری کی اجازت نہ دی۔ آصف نے خود بخود یہ شغل ترک کر دیے۔ رائیڈنگ اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ لیکن اس نے سال بھر گھوڑوں کی شکل تک دیکھنا گوارا نہ کی۔

کچھ ہی حال فرجاد کا کچھ تھا۔

وہ نوئیں جماعت میں تھا اور آصف دسویں میں۔ انہیں دونوں آصف کو بخار ہو گیا۔ جس نے تپ بخرد کی صورت اختیار کر لی۔ آٹالیس دن کے بعد جب بخار ٹوٹا۔ تو وہ قبر سے اٹکے ہوئے مردے کی طرح تھا۔

فرجاد کو بخار نہیں تھا۔ لیکن غم و فکر نے اس کا چہرہ بھی کھلا دیا۔ کتنی ہی راتیں اس نے جاگ کر گزاریں۔ کتنے ہی دن سکول سے غیر حاضری کی۔ کھانا پینا تو ترک ہی کر دیا۔ اسے جو کوئی بھی دیکھتا ہی کہتا۔ کہ آصف کی آدمی بیماری اس نے اپنے سر لے رکھی ہے۔

وقت گزرا رہا۔

سکول کا دور گزرا۔ دونوں شہر کا رخ میں چلے گئے۔ محض ہفتہ سنا سے نکل کر لا محدود سعتوں میں کھو گئے۔ وقت نے شہور کو بھی پچھلی جھنڈی۔ جبکہ یہی حدود میں سمٹ گئے۔ اب محبت کا لاابالی اظہار نہ ہوا تھا۔ نہ ہی ایک کے پیار پر پلے پڑا دوسرا اپنی مصروفیات تیاگ دیتا تھا۔ پھر بھی ہندھن مضبوط اور پرانے تھے۔

محبت و نفرت شاید ایک ہی جذبے کے دو نام ہیں۔ کبھی کبھی "آنا" "لانا" محبت کی انتہا نہیں نفرت میں جاتی ہیں۔ اور کبھی یوں بھی ہو سکتا ہے۔ ہم نے نفرت کا نام دیتے ہیں۔ وہ محبت کی انتہا ہوتی ہے۔ آصف اور فرجاد ایک تن ماحول میں پچھے پھرتے رہے۔ الماں بی کی تربیت اپنی جگہ۔ لیکن وہ اس کچھپاؤ کو صاف محسوس کر رہی تھیں۔ جو دونوں کے درمیان تھا۔ یہ کچھپاؤ بڑھ رہا تھا۔ نہ پھیل رہا تھا۔ لیکن اپنے ہونے کا احساس ضرور دلا آ رہا تھا۔ الماں بی کی سبک دوشیوں چاہتی تھیں۔ عزیز کی قربانی کو وہ نہ بھول سکتی تھیں۔ اور پھر اس پھول سے بچنے سے انہیں بھی تو ہو گیا تھا۔ وہ اس کچھپاؤ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی کوشش میں لگی رہیں۔ "انہیں خوشی ہوئی کہ ان کی کوششیں رائیڈنگ نہیں گئیں۔ دونوں بچوں میں گھل مل کر رہنے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ ایک دوسرے کے بغیر رہنا ان کے لئے مشکل ہو گیا۔ آصف کو اماں بی نے چند دنوں کے لئے ہماڑ پر بھیجا تو فرجاد کو حویلی سوئی سوئی لگنے لگی۔

اور

جو فرجاد کچھ دنوں کے لئے نضیاں کیا تو آصف اور اس رہتے لگا۔ تیسرے ہی دن اس نے الماں بی سے فرجاد کو واپس بلانے کو کہہ دیا۔

الماں بی موقع شناس تھیں۔ من ٹوٹنے کو بولیں۔ "تم دونوں ہر وقت لڑتے رہتے ہو۔ اچھا ہے اب لگ لگا کر رہو۔"

"نہیں الماں بی اسے واپس بلالیں۔" وہ روٹھ کر آواز میں بولا۔ "مجھے اس کے بغیر اپنے کمرے میں ڈر لگتا ہے۔"

الماں بی بس کر بولیں۔ "تو اپنے ڈر کی وجہ سے اسے بلوانا چاہتے ہو۔"

وہ پریشان ہو کر الماں بی کو کھینچ لگا۔

"اب تو ماشاء اللہ اتنے بڑے ہو گئے ہو۔ ڈر کس بات کا۔" وہ بس کر بولیں۔

"الماں بی بس آپ فرجاد کو بلا بھیجیں۔ مجھے ڈر نہیں لگتا۔

"تو پھر کیا ہو سکتا ہے۔"

"وہ یاد آتا ہے تو غصہ نہیں آتی۔"

آصف کے رویے میں شفقت اور نرمی اس کے بڑے پن کو نمایاں کرتی تھی۔ فرجاد کو کبھی کبھی وہ کچھ کہہ کر ٹوٹ کر پناہ دے لگتا۔ اسے یوں محسوس ہوتا۔ جیسے فرجاد کے لئے وہ جان تک کی قربانی دے سکتا ہے۔ وہ اسے دنیا کی ہر شے سے عزیز اور پناہ دیتا تھا۔

فرجاد کے دل میں بھی کچھ ایسے ہی جذبے تھے۔ لیکن اس نے آصف کی طرح مکمل کران کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا۔ وہ شاید اظہار کا قائل نہ تھا۔ اور شاید دیکھنے والے یہ بھی سمجھتے ہوں کہ اسے اپنے برتر ہونے کا شعور ہی احساس بھی ہے۔

لیکن یہ بات نہ تھی۔ قدرت نے اسے ایک وسیع دل اور گہرا ذہن ودیعت کیا تھا۔ جس سے کوئی جذبہ نہ آسانی سے اہل کر پناہ نہ آسکتا تھا۔

(زندگی رست گھڑی ہے۔

ذہن ذہ رست اس کی تنگ گردن سے گزرتی رہتی ہے۔ یوں ہی زندگی کے لمبے اترتے رہتے ہیں۔ ہر ایک لمحہ الگ کیفیت لئے ہوتا ہے۔ ہر لمحے کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔ یہ دنیا بے کیف بھی ہوتی ہے اور کیف ڈال بھی۔

یوں ہی چکر چلتا رہتا ہے۔

یوں ہی چکر چلتا رہا۔

حال کالمحہ زندگی کی تنگ گردن سے گزرتی رہتی ہے۔ آصف اور فرجاد تعلیمی فراغت کے بعد واپس چلی لوٹ آئے۔

خوبصورت، خوب سیرت اور شائستہ سے نوجوان چلی کی روشتی تھے۔ آصف مجبور سے بالوں اور نیلی آنکھوں والا اونچا لانا نوجوان تھا۔ اس پر غیر ملکی ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ طبیعت اشطرابی تھی۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ ہونا چاہتے۔ اس کا سن بیک چاہتا تھا۔ جوانی بذات خود اشطراب ہے کچھ اس پر فطرت بھی اشطرابی۔ تک کر بیٹھتا تو اسے آسانی نہ تھا۔ رک جانا زندگی کی موت ہے۔ اسی لئے وہ رستائیں نہیں تھا۔ ٹھہرتا نہیں تھا۔

اور

جہاں دونوں کی صورتیں جدا تھیں۔ فرجاد سیاہ بالوں سیاہ جمیل ایسی گہری گہری آنکھوں اور کھلتی ہوئی گندی رنگت والا حسین انسان تھا۔ ہاں عادات میں بھی فرق تھیں۔ شرافت مشترکہ بنیاد ضرور تھی۔ لیکن فرید ٹھنڈے اور پرسکون دل و دماغ کا آدمی تھا۔ رک کر سوچتا اور ٹھہر کر سمجھتا اسے خوب مرغوب تھا۔

قدر مشترک محبت تھی۔ جو دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے بے پایاں تھی۔

وقت گزر گیا۔ اس نے بہت کچھ جیتنا بہت کچھ دیا۔

امان بی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ عالی نور محمد ایک ہوائی حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ چولی اپنی پناہ اور بے پناہ ذمہ داریوں کے ساتھ ان دونوں کے کندھوں پر آ رہی۔

بہت بڑی قلعہ محاصرہ چولی میں دور پار کے کئی خاندان امان بی کی شفقتوں کے سہارے آباد تھے۔ بظاہر تو کر تھے۔ جو صدیوں سے نوکر چلے آ رہے تھے۔ زمینداری تھی۔ تین گاؤں میں پچھلی اراضی تھی۔

کام ہی کام تھا۔ ذمہ داری ہی ذمہ داری تھی۔

فرجاد تو خاصا بوکھا گیا۔

لیکن

آصف نے جلد ہی ساری ذمہ داری سنبھال لی۔ چولی کا انتظام تو اس نے واروہ جی کے ہالے کیا۔ فرجاد کی سرپرستی محض نام ہی کی تھی۔ باہر کے سارے فرائض اس نے اپنے ذمہ لئے۔ یہ کام اس کی فطرت سے بڑی مطابقت رکھتے تھے۔ انہیں اس نے بوجھ نہیں سمجھا وہ علی اندکی میں پوری طرح جٹ گیا۔

فرجاد کا جٹل مطالعہ تھا۔ فکر روزگار نہیں تھا۔ ذمہ داریاں آصف کے کندھوں پر تھیں۔ اس لئے اس نے اپنی خاندانی اور پرانی لائبریری کو سنے سرے سے ترتیب دیا۔ مطاہیر عالم کی کتب جمع کرنے کے شوق میں وہ ملک کے ہر بڑے شہر میں گھومنا۔

نئی الماریاں بنوائیں۔ شریکس منگوائے۔ صوفے بدلوائے۔ اور لائبریری کو جدید ترین بنانے اور نشوون میں لگا دیا۔ دونوں اپنے اپنے دائرہ عمل میں گھومتے رہتے۔

ذہن کبھی خدمت کے لئے ملنے تو آصف نے فرجاد سے کہتا۔

”کتابی کڑھ جیتنے چاہے رہے۔ کبھی باہر بھی نکلا کرو۔“

”میں ہر روز باہر جاتا ہوں۔“ وہ مسکرا کر جواب دیتا۔

”میں شہر کا کلب جانے کی بات نہیں کرتا۔“

”تو اور۔“

”کبھی گاؤں بھی آیا کرو۔“

”اکی شش کروں گا۔“

”فرجاد۔ گاؤں کی اپنی ہی دنیا ہے۔ اپنی ہی زندگی۔“

”جو کسی طور خوبصورت نہیں۔“

”یہ کیسے کہا تم نے۔“

”میرا تو یہی خیال ہے۔“

”کتنا غلط خیال ہے۔“

”ہو گا۔“

آصف فرجاد سے بیوشہ سے اصرار گاؤں کا پکڑ گانے کا کتا۔ فرجاد حامی بھر لیتا۔ لیکن وہاں جانے کی کبھی اس نے خواہش محسوس نہ کی۔ اس کے ذہن میں گاؤں کی کچی گلیاں۔ سلیٹی لمبوعے بھری ٹالیاں۔ کچے گھر۔ لمبی کی بسانہ۔ گوبر کی سڑانہ۔ اور چار سو تھفن کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

گاؤں کے لوگ بھی اسے کبھی من نہ بھاتے تھے۔ محنت و مشقت سے پرانے تانبے کی رنگتوں والے لوگ مسلسل سختی برداشت کر کے قبل از وقت بوڑھی ہو جانے والی عورتیں۔ بے رنگ اور کھردرے چہرے اسے کبھی نہ بھاتے تھے۔ گاؤں کی لڑکیاں جن کے قصے اس نے کتابوں میں اکثر پڑھے تھے۔ اسے کم از کم اپنے گاؤں میں تو کبھی نظر نہ آئی تھیں۔ اس نے تو ضرورت و احتیاج کے جھلے ہوئے پیکری دیکھے تھے۔

وہ تو اکثر آصف پر حیران ہوتا تھا کہ وہ اس کام میں کس لگن سے مگن ہے۔ کس قدر خوش ہے۔

جب اس نے پہلی بار اسے دیکھا تو شام دھل رہی تھی۔ آسمان کی نیلا نہیں سیاہی مائل ہو رہی تھی۔ اور اس کا مغربی کنارہ سورج ہو رہا تھا۔ گندم کی فصل کٹ چکی تھی۔ کڑواری خوشبو نہیں پھیل رہی تھی۔ کڑکٹی دھوپ میں مسلسل دھم کرنے والے کسانوں کے جسم کاسی کے بن گئے تھے۔ اور ان کے اودھ دھکے جسوں سے مشقت کی سختی پورے طور پر عیاں تھی۔

عورتیں اور مردان کے تنگ دھڑنگ بچے کھیتوں میں ہی تھے۔ کٹے ہوئے کھلیان کی رکھوالی اڑا تھی، کھری بان کی چارپائیوں پر چھٹے جسم ستر رہے تھے۔ بچے کی منہ میں لٹے گڑگڑاہٹوں میں اپنی سوچیں سمور رہے تھے۔ عورتیں میلے میلے دسر خوان میں دوپہر کی روٹی کے برتن باندھے گھر جانے کو تیار ہو رہی تھیں۔ فصل کی کٹائی سے ان کی آنکھوں میں امیدوں کے سنہری خواب پکھیل رہے تھے۔ ان کی محنت کا بہت بڑا حصہ مالک کے خزانے میں جانے والا تھا۔ پھر بھی محنت کا صلہ انہیں بھی ملنے والا تھا۔ نئے ہواں سال مالک نے تو آکر بہت سی پرانی قدریں بدل ڈالیں تھیں۔ ان کی آنکھوں سے خوف کے لرزاں سانسے مٹ گئے تھے۔ وہ اپنا دکھ درو اب بڑلا مالک سے کہہ لیتے تھے۔ اپنی ضرورتوں کے دامن اس کے سامنے پھیلانے کی انہیں جرأت ہو گئی تھی۔ اپنا حق طلب لانے کا احساس بھی جاگ اٹھا تھا۔

فصل کی کٹائی امیدوں اور آسوں کو رنگین بنا دیتی تھی تو کد اور جوتاں سفید کرتے، نیلے تہندے کی لٹکی تو قہقہ ہو جاتی تھی۔ کوئی بیٹے کے شکر اور کوئی بیٹی کے بیاہ کے لئے پڑا امید ہو جاتا تھا۔ بی بی بڑا نا انہیں لال اوڑھنیاں اور ہری چھن چھن کرنی چوڑیوں کا قصور سجا سجا کر مصروف ہوتی تھیں۔ حق گڑگڑا رہے تھے۔ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ بچے کھیل رہے تھے۔ لڑکیاں بالیاں جھولے سوال رہی تھیں۔

دوران کھیتوں سے ہٹ کر ندی بہہ رہی تھی۔ کچلی ہوئی چاندی پر ڈوبتے سورج کی لالی کی ہمارے کبھر گئی تھی۔ یہ ندی دھرتی کی ممتا تھی۔ یہ راب کرنا پیاس بجھانا ٹھنک دینا اس کا کام تھا۔ اس کے کنارے کناؤہ دار تھے۔ کہیں کہیں کھنے درخت سایہ فگن تھے۔ کہیں دلدلی ریت تھی۔ اور

کسی جگہ لمبی لمبی ہیز بزرگ اس موٹے موٹے پتھروں سے سر نکالے تھی۔
 آصف کسانوں سے مل کر ندی کی سمت نکل آیا تھا۔ ان دونوں کام بہت تھا۔ گرمی بھی بہ
 تھی۔ ندی کنارے چل قدمی کر کے وہ اپنے جسم و ذن کو سکون دینا چاہتا تھا۔ کل اسے ندی کے
 والے گاؤں میں جانا تھا۔ وہ بھی ندی کنارے ٹھٹھکے ہوئے وہ اس پار دیکھ کر فاصلوں کا جائزہ لینے
 خیال سے اوجھ رہ گیا تھا۔

آصف غریب کسانوں اور مزارعوں میں بہت مقبول تھا۔ ہر دلعزیز بھی۔ جب سے اس نے
 ذمہ داری سنبھالی تھی۔ لوگ اس کی شفقت کا اعتراف کرتے لگے تھے۔ انہیں بھی اپنے ہونے
 احساس ہوا تھا۔ وہ صدیوں سے جانوروں کی طرح چلے آ رہے تھے۔ ان کی محنت۔ ان کے خون پس
 کی کمائی سے زمیندار کے خزانے بھرے تھے۔ ان کے بدلوں کی ستر پوچی اور پیٹ کی روٹی بھج
 پورے طور سے ملتی تھی۔ گواہ بھی بڑا حصہ مالک کو جاتا تھا۔ پھر بھی اس نے مالک نے ان کے
 لئے بہت کچھ کیا تھا۔ ایک ہاتھ لے کر دوسرے ہاتھ دینے کی صورت پیدا کی تھی۔ قیہوں اور
 بیواؤں کے وظائف مقرر کیے تھے۔ محتاجوں اور بے سہارا لوگوں کی دل کو کھرا د کرتا تھا۔ بے
 آسرا لوگوں کی شادیوں میں اپنی گھر سے مدد دیتا تھا۔ اس نے کلو کمار کے لوہے کو شہر سکول میں
 داخل کرا کے خرچہ اپنے ذمہ لیا تھا۔ شریف لہار کے دو لوگوں کو شہر میں ایک خانہ میں ملازمت
 دلائی تھی۔ جیراں کے بابا کو ہسپتال داخل کروایا تھا۔ کئی بے گلوں کی آنکھوں کا علاج اپنے خرچہ پر
 کروایا تھا۔

”زمینداری نظام کی یہ تبدیلیاں گاؤں والوں کے لئے خوش کن تھیں۔ اسی لئے وہ آصف کے
 سگن گاتے تھے اور اس کی درازی عمر کی دعاؤں میں کیا کرتے تھے۔
 اس کی خدمت کے لئے ہمہ وقت کمر بستہ رہتے تھے۔

اور جب کبھی آصف گاؤں میں رات گزارتا تو ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی کہ سمانداری کے
 فرض وہی انجام دے۔ حالانکہ آصف اپنے جبرے میں ٹھہرتا اور کسان پانے کے لئے اس کا پنا
 آدمی ہوتا ہے۔ پھر کوئی مرغ بھون لگا۔ کوئی اصلی گلی کے پر اٹھے لے آتا کسی نے حلوے کی
 کڑائی اٹھائی ہوتی۔ اور کوئی گاڑھا گاڑھا دودھ لے آتا۔ آصف کے منع کرنے کے باوجود لوگ
 عقیدت کے اس اظہار سے باز نہ آتے۔

آصف نے آج رات بھی گاؤں میں رہنا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ لوگوں کی عقیدت آج بھی مرغ
 پر اٹھے اور حلوے کی صورت میں اظہار پائے گی۔ اس لئے ذاتی ملازم کو اس نے کہہ دیا تھا کہ کھانا
 نہ بنائے۔

خود سنانے کے لئے ندی کی طرف نکل آیا تھا۔

اپنے اس احساس کا اس نے کل فرجاد سے بھی ذکر کیا تھا۔ رات کھانے کے بعد وہ نکھری ہوئی
 آصف نے آلف لینے حویلی سے باہر گھوم رہے تھے۔
 آصف نے اچانک کہا تھا۔ ”ہم کتنے نمایاں فرجاد۔“
 فرجاد نے چونک کر اسے دیکھا تھا اور پھر دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ ”ارادے کچھ
 بڑے ہیں۔“

”کیوں۔“ آصف نے پوچھا۔
 ”یہ ہے۔ جب کوئی نوجوان نمایاں محسوس کرنے لگے۔ نمایاں کا ڈھنڈلا پٹنے لگے۔ تو اس کا
 ہاں ہوتا ہے۔“ فرجاد نے خوشی سے اسے تجھڑے ہوئے بولا تھا۔ ”بڑی بات ہے کیا۔“
 ”نہیں تو۔“

”یہ بات کیوں اڑاتے ہو۔“
 ”یہ تو یہ۔ میں مذاق کیوں اڑانے لگا۔ کروڑوں شادی۔ بھائی لادو ہمیں گھر میں کچھ رونق تو ہو
 گی۔“

”لوگوں اکیلے ہیں۔ یہ فریضہ انجام کون دے گا۔“
 ”تمہاری شادی میں کراؤں۔ میری تم۔ قصہ ختم۔“
 فرجاد نے ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا تھا۔ اور آصف نے ”ٹھیک ہے“ کہہ کر اس کے
 دھڑکے زور سے دیا تھا۔

اپنے دل پر جھکا وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھا۔ من کے اندر خود درجہ جھانپوں کی طرح آگئی تھائی
 رہی تھی۔ اور فرجاد کا تجزیہ ذہن میں گھوم رہا تھا۔

کیا واقعی شادی کی ضرورت اس قدر شدید ہوتی ہے۔ کہ وہ اپنے آپ کو اس قدر تماحمہ کرنے لگا ہے۔

شادی اسے کربنا ہی تھی تو پھر انتظار کس کا۔

لیکن

شادی کرنا کس سے تھی؟

کئی چہرے اس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ فوزی، فروزانہ، کریم، سونیا، فریدہ، احسن، ماہ لقا، بدر النساء، چاندی، تانبے اور سونے کی رنگت والی یہ حسین لڑکیاں اس کے ارد گرد ہی تو پھیلی؟ قصیں۔ کوئی عزیزہ قصیں کوئی خاندانی دوستی کے بندھن کے ناطے میں بندھی تھی۔ کوئی کالج دوست کی بہن تھی۔ کوئی اماں بیل کے ناطے ملانے والوں کی دختر یک اختر تھی۔

چناؤ کا مرحلہ خاصا درشار تھا۔ یہ بھی اچھی شکل و صورت کی تھیں۔ طور و اطوار بھی شائستہ۔ گھر نہ بھی اونچے تھے۔ لیکن جانے کیا بات تھی۔ کہ آصف کو شادی کے نظریے سے یہ نامکمل تصویریں کی طرح لگتی قصیں۔ ایسے مجھے جن کی تکمیل میں ابھی لمبا عرصہ پڑا ہو۔ ان تصویریں۔ جن کی لوک پک سنوارنے کے لئے ابھی مفکار کے برش کو مسلسل کام کرنا ہو۔

انتظار کا طویل عرصہ۔

لیکن اپنے اندر کے جنگل میں ٹلک کی طرح بھیجی تھائی اس طویل عرصے پر پھیلے انتظار، متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ تھائی کا سلسلہ جلد مل ہونا چاہئے تھا۔

وہ مضطرب و بے چین سانڈی کے سینے پر ٹکلتے پل سے اتر آیا۔ اور ایک بڑے سے چکر کا کرکڑنگھاس پر نیم درواز ہو گیا۔ تھائی اسے طے طے دس رہی تھی۔ لیکن لوگوں میں مل بیٹھنے کو جی نہ چاہ رہا تھا۔ وہ سرستے ہاتھ باندھے دم بدم رنگت بدلے آسمان کو دیکھتے ہوئے سوچوں میں تھا۔

کہ

چھپاٹک چھپاٹک

بائی اڑنے اور چھیننے پڑنے سے چونک گیا۔ کشتی کھینے کی آواز قریب ہوتی جا رہی تھی۔ اس ویسے ہی پڑے پڑے گردن موڑ کر دیکھا۔ چھوٹی سی کشتی کھینے ہوئے کوئی ادھر آ رہا تھا۔

دور سے پہچان مشکل تھی۔ لیکن دب فاصلہ سنا۔ تو اس نے دیکھا۔ کشتی میں اک لڑکی تھی۔ جس کی اوڑھنی ہوا کے رخ پر پھڑپھڑا رہی تھی۔ نیلے پیلے کپڑے شام کے پھیلنے دھندلے سیاہی مائل نظر آتے تھے۔ وہ اپنی دھن میں کشتی کھیتی آ رہی تھی۔

آصف کو اس نے دیکھا نہیں تھا۔ ورنہ اس کا رخ یقیناً یہاں سے کسی آڑے تر جیسے زاویہ

ہو جاتا۔ یہاں کنارے میں ندی کے اندر کھڑے دو تین درخت تھے۔ اس نے کشتی کی ری اس اور اڑنے سے باندھا تھا۔ اسی لئے وہ اس طرف آ رہی تھی۔

آصف کی اس رخ مڑی گردن مڑی کی مڑی رہ گئی۔ حیرت زاش شدہ سا وہ اس وجود کو دیکھتا رہ گیا۔ جو اک شان استغنا سے کشتی سے اتر اور دسر گھسیٹتے ہوئے درخت کے قریب آ گیا۔

وہ وجود کیا تھا۔ سر پائیا قیامت تھا۔

گرد و پیش کیا۔ وہ تو شاید اپنے آپ سے بھی بے خبر تھی۔ سہری چمکی رنگت، سیاہ لائے بال، ہانی کالی وشت زرد آنکھیں۔ ڈیلے وصالے کوستانی لباس میں اپنا اس کا جسم گوشت پوست کا نہیں لاپیدا رہی کی شے سی کا بنا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ درواز قیامت تھی۔ اور اس کے جسم کی قومیں زاویے اور دائرے بڑے ہی جذبات انگیز تھے۔

وہ اتنی حسین تھی کہ آصف کو اس پر کسی اور ہی دنیا کی خلق ہونے کا گمان ہو۔

درخت سے کشتی کا رسمہ باندھ کر وہ مڑی۔ خراباں خراباں جانے لگی۔ آصف ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

متحرک وجود ساکت ہو گیا۔

”کون۔“ اس کے لبوں سے شاید بلا ارادہ ہی نکل گیا۔ اس استغنائی لفظ کے ساتھ ڈیرا خوف کی کوئی آلاش نہ تھی۔ وہ آصف کے عین سامنے رک کر اسے سر پائیا دیکھ رہی تھی۔

”تم کون ہو؟“ آصف نے اس کی طرف دیکھا اور یہ جملہ اس کے لبوں سے پھسل گیا وہ چند لمبے چپ چاپ اسے نکلے گئی۔

آصف کی نگاہیں بھی اس کے خوبصورت چہرے پر جم سی گئیں۔ وہ اس کی خوبصورت آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو دشنی ہوتی کی طرح تھیں۔ جن میں وہ کشوں کے ساتھ خوشیاں بھی ناچ رہی تھیں۔ کھلے ہوئے خوابوں کے عکس بھی تھے۔ آصف نے اپنی زندگی میں ایسی حسین آنکھیں پہلے نہیں دیکھی تھیں۔

اس نے مسکراتے ہوئے اپنی پچلیں جھپکائیں۔ آصف کی دنیا تہہ وبالا ہونے لگی۔ وہ بوکھلا یا ہ لکھایا اسے نکلے سے کہیں زیادہ گھورے جا رہا تھا۔

وہ جانے کیوں سے ساختہ ہنس پڑی۔

اور بتا کچھ کہ آگے بڑھی۔

”ٹھہرو۔“ آصف بے اختیار سا ہو گیا۔

”کیوں؟“ اس نے گردن موڑ کر کہا۔

”وہ۔ وہ۔“ آصف ہلکا گیا۔

”وہ۔ وہ۔“ اس نے منہ بنا تے ہوئے آصف کی نقل اٹاری۔ اور پھر تھکے کھینچی وہاں سے بھاگ گئی۔
آنکھوں کے فموں سے اگر وہ لٹنے سے کچھ بچ گیا تھا۔ تو حسن کی اس شرح ادا کی سے بالکل ہی لٹ پٹ گیا۔

جب تک وہ نظر آتی رہی وہ اسے دیکھتا رہا۔ وہ ایک بار اس نے بھی مڑ کر دیکھا تھا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا۔ کہ اب بھی منہ چڑا رہی ہے آصف کے لبوں پر تبسم بکھریا۔ اور وہ اس کے بارے میں وہیں پتھر بیٹھ کر سوچنے لگا۔

دم بھر میں اس کے من کے اندر تھانویں کا پھیلا جنگل بہاروں کے جوں سے سرشار اعلیٰات چمن میں بدل گیا۔ رونق گھما گھما اور پھل کا احساس ہونے لگا۔ اکیلیاں اور بھری مغل میں بھی ڈسا کر آ تھا۔ اس دیرانے میں بھی محسوس ہو رہا تھا۔ مٹگنا نہیں بکھری تھیں۔ لٹھا محترم تھی اور کائنات کا وسیع دامن خوشیوں اور مسرتوں سے بھر پور محسوس ہو رہا تھا۔
اپنے آپ میں ایسا ایسا اتنی زبردست تبدیلی پر وہ خود بھی حیران تھا۔ وہ آئی تھی۔

اور
چلی گئی تھی

چند لمبے تھے۔ جو بے کیفی سے مڑتے مڑتے اچانک ہی لطف و انبساط کے امین ہو گئے تھے۔
آصف کو چاہنے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ اب تک وہ اسی وجود کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اسی بیکر کی جستجو کو ہمیشہ سے تھی۔ وہ اسے جانتا تھا نہ پہچانتا تھا۔ وہ کون تھی؟ اس کا نام کیا تھا؟ اس کے والدین کون تھے؟ وہ کس خاندان کی چشم و چراغ تھی؟ اس کا مزاج کیسا تھا؟ اس کی عادتیں کیسی تھیں؟ اسے کچھ پتہ نہ تھا۔

پھر بھی

اسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس کا اس کے ساتھ برسوں کا ساتھ ہے۔ صدیوں سے وہ اس سے آشنا ہے۔ قزوں سے اس کی قبروں کے حرم میں کھویا ہوا ہے۔ اس نے اس وجود کے لئے کئی جنم لئے ہیں۔ اس کے لئے بار بار مرا اور بار بار جینا ہے۔

شام نے رات کا لہارہ اوڑھ لیا۔ ہوا میں خنکی سی ہو گئیں۔ ندی کا پانی پتیلی ہوئی جماندی کی طرح لگنے لگا۔ چھوٹی چھوٹی ٹھانیاں اور اونچے اونچے درخت چار سو پتیلی ہوئی جماندی کے باوجود پر اسرار لگنے لگے۔

آصف نے شام سے رات وہیں ٹھٹھٹے ٹھٹھٹے اس کے انتظار میں کر دی تھی۔ وہ کشتی وہیں باندھ کر رہی تھی۔ اس کی واپسی کا امکان تھا۔ اسے ضرور آتا تھا۔ آصف تو برسوں اس کا انتظار کر سکتا تھا۔ یہ تو چند گھنٹوں کی بات تھی۔

کبھی وہ ٹھٹھٹے لگتا اور کبھی بوسے سے پتھر پر بیٹھ کر ننھے ننھے گول پتھر اٹھا کر ندی میں پھینکتے لگتا۔ کبھی ستاروں سے نظریں ملتیں۔ اور کبھی پر اسرار درختوں کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگتا۔ اس آبی کے بارے میں جو ہوا کے نرم و لطیف جھونکے کی طرح آئی اور چلی گئی تھی۔
اور جو پتیلی پایا ہوا مجسمہ تھی۔
جو مکمل ہوئی تصویر تھی۔

اسے یقین تھا وہ ضرور لوٹ کر آئے گی۔ اس کے جذبے بے کشش نہ ہو سکتے تھے۔ یہ تو ایسا نہایتیں بن گئے تھے۔ جو اس لڑکی کو وہ جہاں کیس بھی ہوئی اپنی طرف کھینچ سکتے تھے۔

وقت گزر رہا تھا۔ انتظار کی شدت بڑھ رہی تھی۔ وہ بے چینی سے ٹپ رہا تھا۔ ٹھٹھٹے ٹھٹھٹے پر ندی کے سینے پر لٹکتے اس شکست پرلے پر چاہتا تھا۔ یہاں سے ہر آنے والے کو بخوبی دیکھا جاسکتا تھا۔ اس طرف آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ پل بہت پر آتا تھا۔ لوگ ڈرتے ہوئے یہاں سے گزرتے تھے۔ زیادہ تر پہلے مل سے آتا جاتا ہوا تھا۔ شکست پل چھوڑتا رہتا تھا۔ اس کے ٹوٹ کر نہ کا کسی لمحے بھی مسلمان ہو سکتا تھا۔

آصف نے گاؤں کی جانب دیکھا۔ ہر دور سے لمبے اس کی نگاہیں ادھر اٹھ رہی تھیں۔ درختوں کے اندر سے مایوں تھے اسے کوئی وجود متحرک نظر آیا۔ تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ آ رہی تھی۔ آصف کو جانے کیا ہو لگا۔ خوشیوں کا بے پناہ احساس تھا۔ لذت انبساط تھی۔
خبر بہت میں بھی سرور تھا۔

لیکن اسے ایسی ہوئی۔ وہ لڑکی نہیں تھی۔ اس کا ملازم تھا جو شاید اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔
 ”مالک۔“ اس نے چل پڑے۔ آصف نے سمجھ کر پچھان کر رو رہی سے پکارا۔
 ”کیا ہے۔“ شیدے۔ ”آصف نے جھنجھلا کر کہا۔
 ”کھانا آتیا رکھا ہے مالک۔ بہت دیر سے انتظار کر رہا تھا۔ سارے گاؤں میں آپ کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔“ شیدے نے مسکرا کر کہا۔
 ”تم جاؤ۔“
 ”اور آپ۔“
 ”میرا انتظار نہ کرنا۔ میں جب جی چاہا آجاؤں گا۔“
 ”اور کھانا۔“
 ”جب بھوک لگے گی کھاؤں گا۔“
 ”آپ اکیلے۔“
 ”اوپر شیدے۔ زیادہ باتیں نہیں کرو۔ تم جاؤ۔ میں آجاؤں گا۔ کبھی تو سکون لینے دو کرو۔“
 ”اچھا مالک۔“
 شیدا واپس پلٹ گیا۔ اور آصف پھر چل کی رسیوں پر جھک گیا۔ اور پستے پانی میں لڑواں ستاروں کا ٹکس دیکھنے لگا۔

اور

پھر

آوارہ پار وہ چونک گیا۔

کوئی خراباں خراباں چلا آ رہا تھا۔

فضا کی تھک نے پتہ دیا۔ کہ یہ وہی چار سو پچیس کی چاندنی مسکرائی۔ کہ وہ آگئی۔ دل کی دھڑکنوں نے بتایا۔ کہ وہی رہزن دینا دیا ہوا ہے۔
 آصف نے سیدھے کھڑے ہو کر دیکھا۔ چاندنی کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی میں وہ سرخ سا بیولہ لگ رہی تھی۔ لیکن اس کے انداز اس کی چال سے وہ جان گیا تھا۔ کہ وہی ہے۔
 لیکن وہ کبھی کی طرف جانے کی بجائے چل کی طرف آ رہی تھی۔

کیوں؟

کیا اس نے آصف کو چل پر کھڑے دیکھ لیا تھا اور جھڑپوں کی کشش اسے سمجھ لائی تھی؟
 اللہ

جذبے اسنے صاف ہی بھی ہوتے ہیں۔
 آصف ابھی سوچوں کے سمندر ہی میں تھا۔ کہ وہ انصاف کی بل کھاتی اپنی چٹیا کو دائیں ہاتھ سے تھماتی چل پڑ آگئی۔
 کسی کو چل کی رسیوں پر جھکے دیکھ کر وہ ٹھٹھکی لیکن ڈری نہیں۔
 ”کون۔“ اس نے بے دھڑک پوچھا۔
 آصف سیدھے کھڑے ہو کر رسیوں نے پشت ٹکا کر اسے نکلے لگا۔
 اس نے فورے آصف کو دیکھا اور اس کے لبوں سے ”اوہ“ نکل گیا۔ جانے کے لئے اس نے قدم بڑھایا۔
 ”ڈر گئیں۔“ آصف بلا ارادہ کہہ رہا تھا۔
 ”ہاں۔“ وہ انہی ضبط کرتے ہوئے بولی۔
 ”پہچانا مجھے۔“
 ”اب پہچان لیا۔ پہلے سمجھی تھی۔ کہ۔“
 ”کیا۔ کیا سمجھیں۔“
 ”کہ کوئی بھوت ہے۔“ وہ کھکھلا کر بے ساختہ قہقہے لگاتے ہوئے بھاگی ”بھوت لگ رہے ہو بالکل۔“
 ”مضمود۔“ آصف قدم اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے آیا۔ وہ عرصہ لو اپنی بر مری تو مٹا تھا۔
 وہ رک گئی۔ مسکراہٹ اس کے لبوں پر اب بھی مسکرا رہی تھی۔
 ”تم کون ہو۔“ آصف کے لیے جس میں استفسار کے ساتھ اتنی پاکیزگی اور اتنا بجز تھا۔ کہ وہ چند لمبے ننگ کر اسے دیکھتی رہی۔
 ”میں گل بانو ہوں۔“ در لڑکیوں کے سحر کی امیر تھی۔
 ”گل بانو۔“ آصف کے لبوں سے نکلا۔ وہ بے سندھ سا ہو رہا تھا۔
 ”تم میرا نام کیوں پوچھ رہے ہو۔ تم کون ہو۔“ وہ سادگی سے بولی۔
 ”آصف۔“ آصف ایک تک اسے نکل گیا۔
 ”آصف! اس کی حسین آنکھوں کی دھستیں اور وحشی ہو گئیں۔“
 ”کیوں۔“ آصف پورے اطمینان سے اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔
 ”تم۔ تم وہ آصف تو نہیں۔ جو۔“ وہ ششدر رہی تھی۔
 ”جو مالک کہتا ہے۔“ آصف مسکرایا۔
 ”ہاں۔“ وہ بولی۔

”ترے میرا نام سنا ہے۔ مجھے پہلے دیکھا نہیں تھا۔“
اس نے خوبصورتی سے سرفنی میں ہلادیا۔
چند لمحوں سکوت طاری رہا۔ گل بانو کبلی کے کھمبے کی طرح گڑی گڑی تھی۔ آصف کی پرفسوں
شخصیت اس پر اپنا اثر کر چکی تھی۔

پھر اس نے آہستہ آہستہ سے حرکت کی۔ جانے کو اس نے قدم اٹھایا۔

”گل بانو۔“ آصف نے بلتی میں سے کہہ دیا۔

”وہ رکی نہیں۔ دھیرے دھیرے بڑھتی چلی گئی۔“

آصف تیز قدم اٹھا لے کر اس کے برابر آگیا۔

”چند لمحوں تک جاؤ گل بانو۔“

”کیوں۔“

”جانا کہاں ہے ہمیں۔“

”میں کے پار اپنی سہیلی کو بلائے۔ چاندنی رات میں کشتی میں گھومیں گے۔“

آصف اس کے حسن کے بحرِ ذخار میں ڈوب رہا تھا۔

”مجھے لے چلو اپنی کشتی میں گل بانو۔“

آصف نے بے تکلفی سے کہا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی نرم نرم پھوار بن کر

آصف کو اپنی شخصیت پر برسی بے حد بھلی لگی۔

جذبے واقعی صادق ہوتے ہیں۔ یہ اپنی پہچان آپ ہی کر دیا کرتے ہیں۔ جذبوں نے جذبول کو

پہچان لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گل بانو کے میں قدموں آصف کی التجا زنجیر بن گئی تھی۔

جب گل بانو جاری تھی۔ تو آصف کے لب پر کہنے کو کئی باتیں تھیں۔

لیکن

جب وہ رک گئی۔ تو زبان پر کوئی لفظ آیا ہی نہیں۔ وہ چپ چاپ اسے کئے گیا۔

”میں جاؤں۔“ کئی لمحوں کی براسر اسی خاموشی میں جب گل بانو کی ذات گھل کر اک نئے

سانچے میں ڈھل گئی۔ تو اس نے آہستگی سے کہا۔

”سہیلی کو بلائے۔“ آصف نے بھی آہستگی سے کہا۔

”وہ نہیں۔ اب گھر جاؤں گی۔“ وہ مڑی۔

”گھر کہاں ہے تمہارا۔“ سرگوشی ابھری۔

”ہاں۔ گل بانو نے گاؤں کے آخری سرے کی طرف اشارہ کیا۔“ مٹی کا چھوٹا سا کچا گھر ہے

”ہاں۔“

آصف کو یوں لگا جیسے گل بانو اسے اپنے گھر کا پتہ نہیں بتا رہی۔ اپنی حیثیت کا احساس دلا رہی
ہے۔ ایک سیدھی سادی البرسی دو ٹیڑھا لٹنے پٹنے زہن کی مالک اور اشاروں کنایوں میں بہت بڑی
حقیقت کو سامنے لانے کی اہلیت رکھتی تھی۔ آصف اگر جان سے لانا تھا تو اب روح سے بھی گیا۔

پھر۔

دونوں

کتنی ہی دیر ستاروں کی ٹھنڈی چھاؤں۔ چاندنی کے پرفسوں غبار اور شبنمی ہواؤں میں ایک

دوسرے کے قریب کھڑے رہے۔ جان تھی نہ پہچان۔ لیکن یہ سب ٹکٹائی مرسلے دونوں منٹوں میں

پھلانگ چکے تھے۔ دلوں کے بندھن کوئی باتوں سے ٹھوٹے ہی بندھتے ہیں۔ یہ سب کچھ تو آپوں

آپ ہو جاتا ہے۔ ”آنا“ ”فانا“۔ کوئی لمحہ ہی ایسا حساس ہوتا ہے۔ کوئی گڑی ہی اتنی جاذب ہوتی ہے۔

کہ دوا جنسی یوں مل جاتے ہیں۔ جسے صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ پہچانتے ہوں۔

بادل بہت نیچے جھک آئے تھے۔ مغربی ہوائیں منہ زور ہو گئی تھیں۔ آسمان کے سرے کالے ہو رہے تھے اور بحورے کالے بادل سینہ چرخ پر دھناتے پھر رہے تھے۔ کسی دم بوندیں پڑنے کا امکان تھا۔ گرج ہولناک تھی اور جلیوں کی کڑک سے ماحول کسی وقت لرز اٹھتا۔ ان سب باتوں کے باوجود سال حسین تھا۔ جسموں کو جھلسا دینے والی گرمی کے بعد بادلوں کی آمد خوشیوں کا پیش خیمہ تھا۔

گل بانو زہری کے کنارے ایک بڑے سے پتھر پر بادل لٹکائے بیٹھی تھی۔ گاہے گاہے ندی کے پانی کی کوئی تھیل چلی۔ لہراس کے حسین پاؤں چومتی تو وہ لا شعوری طور پر پاؤں جھٹک دیتی۔ جس سے چھینٹے اڑتے اور پر شور فغاںیں ہلکا سا ارتعاش اور شامل ہو جاتا۔

وہ کچھ دیر پہلے اپنی بھجیوں کے ساتھ آموں کے باغ میں کچی ایمیاں توڑ توڑ کر نمک اور لال مرچ لگا لگا کر کھا رہی تھی۔ جھینس بھی نہ پڑ پڑھائی تھیں اور بیرو کے ساتھ نکلن میں بھی حصہ لیا تھا۔ وہ ڈیں بھی لگاتی تھیں اور پچھلے چھ ماہ سے فضا کو اپنے قہقروں سے زعفران زار بھی کرتی رہی تھی۔ لیکن ان دنوں اسے جانے کیا ہو جاتا۔ کھیلنے کی طبیعت اچاٹ ہو جاتی۔ بھجلیوں سے اٹکا ہٹ ہوتی۔ کھانے پینے سے ہی متفر ہو جاتا۔ الگ تنہا ہو کر چپ چاپ پر رہنے کو بھی چاہتا۔ اپنے آپ میں گم ہو جاتی۔ اپنے آپ کو ڈھونڈتی پھرتی۔

چند دنوں میں وہ اس قدر بدل گئی تھی کہ اس کی سیلیاں شکر ہو گئی تھیں۔ جڑو نے اسے کرینے کی کڑی کار کو شش کی تھی۔ بہت کچھ پوچھا تھا۔ لیکن وہ اسے کچھ بتانا سکتی تھی۔

بتاتی بھی کیا۔ کج بھی کھیلنے کھیلنے اس کی طبیعت ادھیڑ گئی تھی۔ وہ سب سے الگ تنہا ہو کر ندی کی طرف آگئی تھی۔ یہاں پانی کا شور تھا۔ بادلوں کی گرج اور جلیوں کی کڑک تھی۔ پھر بھی خاموشی تھی۔ سکون تھا۔

وہ سوچوں میں مستغرق تھی۔ کبھی اچھ جاتی۔ کبھی گھبرا جاتی اور کبھی اس کے لبوں پر نرم نرم مسکراہٹ کھڑ جاتی۔

بحورے بالوں اور نیلی آنکھوں والا اجنبی کتا اپنا بونگیا تھا۔ گل بانو انبایت کے احساس سے مغلوب ہو کر اس کی قیمت کی تمنا کر رہی تھی۔ وہ اس رات کے بعد دو دفعہ اس سے مل چکی تھی۔ کاش وہ ہمیشہ اسے نظر آتا رہے۔ وہ ہمیشہ اسے دیکھتی رہے اس سے باتیں کرتی رہے اور۔

اور۔

جانے وہ کیا سوچ رہی تھی۔

کہ

”گل بانو“ ایک مانوس سی آواز اس کے کانوں میں آتی۔
”گل بانو نے پلٹ کر دیکھا۔ کنارے پر چند گھر کے فاصلے پر آصف کھڑا تھا۔
”ہاں۔“ وہ اچھل کر پتھر سے پانی میں کھڑی ہو گئی۔
”آصف کو اس پر جل پڑی کامان ہوا۔
”آپ۔ یہاں۔“ وہ گھٹنے گھٹنے پانی میں کھڑی تھی۔
”ہاں۔ یہاں آنا منع ہے کیا۔“
”نہیں تو۔“

”ہر کیوں پوچھ رہی ہو۔“

”یہ۔“

”اہر تو۔“

”یہ۔“

”ایسے ہی۔“

وہ کھانکھلا کر ہنس پڑی یہ ہنسی بھر پور مسرتوں کی آئینہ دار تھی۔

بچے کو جھک آنے والے بال متناہد وار چھونے لگے ان کی گرج کسی مترنم نغمے کی سی ہو گئی۔

”اے! دلی بوندیں اترنے لگیں۔ کنارے کے رکے رکے پانی میں نغمے سننے گرواب پڑنے لگے۔

گل بانو پانی سے باہر نکل آئی اسے آسمان کی طرف دیکھا۔ ”آج بہت پانی پڑے گا۔“

”آصف نے بھی آسمان کو دیکھا واقعی زور دار بارش کے آثار تھے۔“ یہاں تو کوئی پناہ گاہ بھی

”اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

”وہ پھر بے اختیار ہو کر ہنس پڑی۔“ ”بھیگتے سے ڈرتے ہو۔“

”تم نہیں ڈرتیں؟“ آصف پیار بھری آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”بالکل نہیں“ اس نے سر کو اوپر سے ادھر بہنیں دے کر غرض نظروں سے آصف کو دیکھا۔

”تو یہاں بہت اچھا لگتا ہے۔ اللہ کرے زوروں کی بارش ہو۔“

”نہ بھئی نہ۔ ایسی دعا نہ کرو۔ پہلے کوئی دھوکہ دے دینے دو مجھے جہاں رک کر میں بھینگنے سے بچ

”اے۔“ آصف نے پھر گرد و پیش دیکھا۔

اور

گل بانو کو جانے کیا سوچتی۔

جب تک کہ اس نے آصف کی کلائی پکڑی اور اس کے کچھ سوچتے سمجھتے سے پہلے سمجھ کر پانی میں

سلاں دیا۔ اور خود ہنستے دہری ہو گئی۔

آصف کی پتلون کے پانچے بھگ گئے۔ وہ حسن کی اس کافراور شوخ ادا پر دل تھام کر رہ گیا۔ گل بانو ہنسی جاری تھی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں سحرانہ چمک تھی اس کے معصوم لبوں؛ معصوم قہقہے۔

آصف جبرو صبر کو کر سکتا تھا۔ کھیانی ہنسی ہنسنے پانی سے باہر نکلا اور گل بانو کو پکڑنے کے لے بھینا۔

گل بانو بکلی کی سی تیزی سے بھاگی۔

آگے آگے وہ

اور

پچھے پیچھے آصف۔

دونوں ہنس رہے تھے۔

ندی کنارے پرستی بوندوں میں حسن و عشق کی دوڑ جاری تھی۔

گل بانو آصف سے صرف ایک ہاتھ کے فاصلے پر رہ گئی۔

لیکن آصف کے ہاتھ آنے سے پہلے ہی اس نے واؤ مارا۔ دوسرے لمحے وہ پھسلتی پھسلتی کی طرح غراپ سے پانی میں کود گئی وہ اب پانی میں بڑے سہل انداز سے تیر رہی تھی۔ آصف کا منہ چڑا چڑا کر ہنسے جاری تھی۔

”مجھے یوں چلتی نہ کرو۔ گل بانو۔ تم نہیں جانتیں کہ میں بڑا ماہر تیراک ہوں۔“ کنارے پر کھڑے آصف نے کہا۔

”محبوب۔ گل بانو نے چہرہ اٹھا کر شوشی سے کہا۔“ پانی سے ڈرنے والا تیراک۔ واہ واہ۔“ چیتھ زبردست تھا۔ آصف نے بوٹ اتارے اور پانی میں کود گیا۔

دونوں پانی میں کشتی ہی دور نکل گئے۔ ہنسنے کیلئے ایک دوسرے سے آگے بڑھتے پیچھے رہتے۔ پانی اڑاتے دھکے دیتے کشتی ہی دیر گرو پیش بے خبر رہے۔

عشق نے مندریں تیزی سے پھلا گنا شروع کر دیں۔

محبتیں جوان ہونے لگیں۔

گل بانو اور آصف ایک ہی تصویر کے دو رخ بن گئے۔ ایک ہی وجود کے دو نام ہو گئے۔ دونوں گھنٹوں ساتھ رہتے۔

لمن کی گھڑیوں کا انتظار زندگی کا حسین ترین شغل بن گیا۔

کبھی سہ پھر ڈھلتے سائوں میں ایک دوسرے میں کھوئے کسی چٹان کا سہارا لے کر ان گنت باتیں کرتے۔

کبھی اصلی سنہری مسکین محبت کی امین ہو تیں۔

کبھی سائیلی شاہیں تنہائیوں کی ضامن ہو تیں۔

اور

کبھی چاندنی کی براق چادور اوڑھے چمکتی راقش ان کی قہقروں اور خاموش تنہائیوں کی رازدار ہو تیں۔

کبھی دونوں دیوانہ وار بولنے چلے جاتے ہنسنے رہتے۔ بے باک قہقہے لگاتے۔

اور

کبھی

خاموش

چپ چاپ

صرف ایک دوسرے کی قہمت کے احساس سے مغلوب راہ محبت کی مسافرتیں طے کرتے۔

یہ رفاقتیں۔

یہ صحبتیں۔

روز کا معمول نہ تھیں۔ کبھی کبھی تو مہینہ مہینہ مقرر جاتا۔ لمن کے لمحے گرفت سے نکلے رہتے۔

آصف کو جلی آجاتا۔ یا دوسرے کاموں کے سلسلے میں گر گھر گھومتے چلا جاتا۔

گل بانو اپنے پیار بابا کی وجہ سے گھر سے نکل نہ پاتی۔ لمن کے وقفے یوں طویل ہو جاتے۔

لیکن

یوں محبت کی پرکھ ہوتی۔ آزمائش ہوتی۔ تو جذبہ اور شدید ہو جاتے بندھن انوث اور عشق

مستحکم ہو جاتا۔ ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ تھا۔ دونوں جدائی کی گھڑیاں خوش گووار طریق سے

نزار دیتے۔

رحمان گل کے مٹی کے گھر میں بھی دونوں تہذیبوں کا استخراج صاف طور پر نظر آتا تھا۔ انہیں کوئی مرغوب تھی۔ مٹی کی چائی صحن کے کونے میں ہمیشہ نظر آتی۔ رحمان گل چاہے کا ہاتھ دھوئے یا نہ دھوئے، ہاں اور چینی کے چالے کارنوں پر ہمیشہ بے ریتے۔ مونے مونے پاپوں والے ہاں نے چنگ بھی رحمان گل کی پسند کے تھے۔ ان پر گاؤں کی بڑے رہتے۔

رحمان گل ابھی تک گریمر کی قید سے آزاد اردو ہوتا تھا۔ اور مرے تک رحمان بھی تھوڑی مدت پشتو سے آشنا ہو چکی تھی۔ ہاں گل ہاں سے دونوں زبانیں سیکھی تھیں۔ پشتو بولتے وقت اس کا لہجہ باپ کا سا ہوتا تھا۔ وہ اپنی باتیں کرتی تو اپنی ہی دھن سے لہجہ کی کما کرتی تھی کی طرح انداز اختیار کر لیتی۔ اردو بھی ٹھیک بولتی تھی۔ باپ جابجا تھا تو قہقی اور قہقی کو تھا تا تو وہ کھکھلا کر ہنس لاتی اور قہقہی ہی دہرایا کو ٹھیک بولتے رہتی تھی۔

پچیس سال رحمان دوبارہ کی طویل بیماری کے بعد واپس اسی کو لبیک کہہ گئی تھی۔ تو رحمان گل نے بیسے دینا اندر ہو گئی تھی۔ گل ہاں نہ ہوتی تو شاید وہ رحمان کے ساتھ ہی مر جاتا۔ وہ مرتو نہ سکا۔ ہاں اس کی صحت یک لخت خراب ہو گئی۔ کبھی بخار آ جاتا کبھی دم گھٹنے لگتا۔ ایسی باتیں میں کھچاؤ آ جاتا۔ تو کبھی شدت کی کمزوری محسوس ہونے لگتی۔

سب جانتے تھے کہ یہ رحمان کا روگ ہے۔ اس کی جدائی کا روگ۔ گل ہاں اسے بسلانے لایا۔ کسی کو شش کرتی۔ لیکن رحمان گل کی صحت جواب ہی دیتی گئی۔

رحمان گل کے کندھوں پر گل ہاں کا ہوتا تھا۔ اپنی کرتی صحت کے پیش نظر وہ چاہتا تھا کہ گل ہاں شادی کا فریضہ جلد از جلد اکر دے۔ لیکن آسمان اسے اپنی پسند کا فیصلہ نہیں ملا تھا۔ گل ہاں نے مدت تھی۔ خوب سیرت تھی۔ ذہین و فطین تھی۔ بہت چھوٹی عمر میں اسے قرآن پاک ختم کر لیا تھا۔ فارسی کی کتنی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ اردو کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ لیکن رحمان گل اور رحمان کے شوق نے اسے اتنا قائل کر دیا تھا کہ بلاشبہ اس کی لیاقت ساتویں آسمانوں آٹھویں طرف سے برستے تھے۔ اسے اذیت پاتی رہتی تھی۔

رحمان گل نے رحمان کی یہ حالت دیکھی تو سب کچھ چھوڑ کر سب کو چھوڑ کر میدانوں میں اتر آیا۔ رحمان اسکی زندگی تھی۔ محبت کا اٹوٹ تار تھا۔ دونوں نے اپنا گھر بنایا۔ اور آزاد خضامیں آزادی کی زندگی گزارنے لگے۔

اس گاؤں میں آسے بابا کو سولہ ستر برس ہو چکے تھے۔ یہاں اس نے چھوٹی سی دکان لے رکھی تھی۔ اور معمولی سا کاروبار تھا۔ مٹی کا گھروندا بھی بنایا تھا۔ گل ہاں ان کی ازدواجی پرست زندگی کا ان تھی۔ باپ کی تومندی سرفی پیدہی اور ماں کی نزاکت اور خوشی کا امتزاج گل ہاں کے بیکر میں

رحمان گل کو بہانوں کا ہاں تھا۔ مدتوں پہلے وہ کپڑے کا چھوٹا سا بیوپاری تھا۔ غیر ملکی ریشمی کپڑے کا گھروندا سر پر اٹھائے وہ ہاڑی علاقے سے میدانوں میں آ جاتا۔ گلی گلی پکڑا بیچتا اور اچھے خاصے پیسے بنا کر لوٹ جاتا۔ کچھ عرصہ لکڑی کا کام بھی کیا۔ اور محنت مزدوری بھی کرتا رہا۔

جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ رحمان گل کی جوانی نے بھی دیوانگی دکھائی۔ اور ہاڑوں کے ہاں کو میدانوں کی رحمان پسند آ گئی۔ دونوں ایک دوسرے کی زبان بھی نہ جانتے تھے رحمان گل کو کوئی پشتو اردو آتی تھی۔ لیکن بھائی بولے والی رحمان گل کی پشتو کا ایک لفظ نہ آتا تھا۔ پھر بھی لگا ہوں کی زبان دونوں سمجھ گئے۔

رحمان گل نے رحمان سے شادی کر لی۔ یہ شادی کیسے ہوئی۔ یہ ایک لمبا خیال تھا۔ لیکن بات کے دھنی رحمان گل نے اپنی پسند کی دلہن حاصل کر لی والی۔

وہ رحمان کو بیاضی کا گھٹن لے گیا۔ تو اس کے کنبے قبیلے نے ایک طوفان پا کر دیا۔ باپ نے ماں نے بھائی بہنوں نے رشتہ داروں عزیزوں نے کسی نے بھی رحمان کو قبول نہ کیا۔ ان کی روایات مجروح ہوئی تھیں۔ ان کے رسم و رواج کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہوئی تھی۔ رحمان گھبرا گئی۔ وہاں ٹھہرنے اور دواؤں کے احساس سے وہ چند دنوں میں میں بیٹی پڑ گئی۔ وہ ان لوگوں میں گھر گئی تھی۔ جن کی اسے زبان سمجھ آتی تھی۔ نہ عادت و اطوار کا پتہ تھا۔ ہاں گھٹاؤں کے تیر جو چاروں طرف سے برستے تھے۔ اسے اذیت پاتی رہتی تھی۔

رحمان گل نے رحمان کی یہ حالت دیکھی تو سب کچھ چھوڑ کر سب کو چھوڑ کر میدانوں میں اتر آیا۔ رحمان اسکی زندگی تھی۔ محبت کا اٹوٹ تار تھا۔ دونوں نے اپنا گھر بنایا۔ اور آزاد خضامیں آزادی کی زندگی گزارنے لگے۔

اس گاؤں میں آسے بابا کو سولہ ستر برس ہو چکے تھے۔ یہاں اس نے چھوٹی سی دکان لے رکھی تھی۔ اور معمولی سا کاروبار تھا۔ مٹی کا گھروندا بھی بنایا تھا۔ گل ہاں ان کی ازدواجی پرست زندگی کا ان تھی۔ باپ کی تومندی سرفی پیدہی اور ماں کی نزاکت اور خوشی کا امتزاج گل ہاں کے بیکر میں

”نی چاہتا ہے۔ اپنے گاؤں چلا جاؤں۔ اپنوں سے کٹ کر ایک عرصہ ہی لیا۔ اب پھر ان کی فریاد اٹ جانا چاہتا ہوں۔“

”کیوں۔ کیا ہوا۔ تمہیں بھول گیا کہ ان لوگوں نے تم سے کیا سلوک کیا؟“

”وہ زراعت ختم ہو چکی ہے۔ گل بانو۔ تمہاری بی بی اب زندہ نہیں۔ اب وہ لوگ ہمیں مار رہے ہیں۔“

”تمہیں کیا سوچھی بابا۔“ گل بانو اپنی چارپائی میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور بابا کے پیوے کو دیکھنے لگی۔

”زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں بیٹی۔ میں چاہتا ہوں زندگی میں تمہیں اپنوں کے حوالے کر دوں۔ لی کرنا تو تیرا کوئی تو ہو گا۔ کیا مجھ میرا بھائی اپنے شیردل سے تیری۔“

”بابا۔“ گل بانو نے چپ کر اس کی بات کاٹ دی۔

بابا چپ ہو گیا۔ شیردل کے بارے میں کبھی کبھی وہ گل بانو نے باتیں کیا کرتا تھا۔ گل بانو کو بابا کی باتیں بھی اچھی نہ لگی تھیں۔ ان باتوں سے وہ احساس شکست خوردگی ہوتا تھا۔ غیرت اور لڑائی موت محسوس ہوتی تھی

اور

اب تو گل بانو کی زندگی کو محور مل گیا تھا۔ آصف کے سوا وہ اور کسی کے متعلق سوچتا تو کیا سنتا تو نہ نہ کر سکتی تھی۔ شیردل کے متعلق کچھ سننے کا سوال ہی کماتھا۔

”بابا۔ آئندہ شیردل کی بات کی نا۔ تو یاد رکھنا میں کچھ کھاکے مر جاؤں گی ہاں۔ مجھے ذست کی باتیں ایسی موت اچھی۔“

گل بانو نے گئی۔

گل بانو نے گئی۔ اس درجہ عمل کی امید نہ تھی۔ وہ چپ ہو گیا۔

اور

بابا بانو روتے روتے سو گئی۔

معاف کر کے گل بانو کو قبول کر لیں گے۔ شیردل بے شک اپنے بچپائے خوش خلقی سے ملے گا۔ اس نے کبھی رحمان گل کے ہاں جانے کی خواہش کا اظہار نہ کیا تھا۔ اپنے خاندان والوں کی طرح بھی اب تک رحمان گل کو معاف نہ کر سکا تھا۔ اسے خاندانی روایات کا باغی سمجھتا تھا۔

تھرور پریشانی رحمان گل کو گھلار ہی تھی۔

گل بانو بابا کی حالت دیکھ کر گھبرا جاتی۔ ”تمہیں کیا ہوتا چاربا ہے بابا۔“

”کیا سوچتے رہتے ہو۔“

”بی بی یاد آتی ہے۔“

”میری فکر کرتے ہو۔“

”دکان نہیں چلتی۔“

”مجھے ختم ہو گئے ہیں۔“

اس کے ذہن میں بابا کے تھرور اور پریشانی کی یہی وجہیں تھیں۔ وہ اکثر ان کا اظہار کرتی رہتی بابا کبھی مسکرا دیتا۔

کبھی غلطی آدھ کر رہ جاتا۔

اور کبھی اسے سینے سے لپٹا کر آبدیدہ ہو جاتا۔

وہ رات نارود بھری تھی۔ مچھن میں اپنی اپنی چارپائیوں پر رحمان گل اور گل بانو لیٹے نہ دونوں کی اپنی ہی دنیا میں آباد تھیں۔ رحمان گل آن پھر شیردل کی خواہش شدت سے محسوس تھا۔ کاش وہ گل بانو کو قبول کر لے کتا بڑا بوجھ اس کے کندھوں سے اتر جائے۔

شاید یہی خواہش کار فرما تھی۔ کہ گل بانو کے ساتھ وہ اپنے کو ہستانی گاؤں کی باتیں کر رہا اپنے عزیزوں کی بھائی بہنوں کی رشتہ داروں کی۔ اپنے رسم و رواج کی۔ روایات کی۔

گل بانو بنا کسی دلچسپی کے یہ باتیں سن رہی تھی۔ یہ قیہ اس نے کئی بار پہلے بھی سنے تھے۔ اب تو اس کی سوجوں کا انتہائی مرکز تھا وہ تو آصف کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جاسے کیوں اس چاہ رہا تھا کہ بابا کو آصف کے متعلق بتا دے۔

لیکن بتائے کیا؟

وہ سوجوں میں گم تھی۔ اور بابا جبک جبک کرتے ناروں کو دیکھتے ہوئے بول رہا تھا۔

”گل بانو۔“

”جی بابا۔“

”میرا جی اپنے گاؤں جانے کو چاہتا ہے۔“

”کیا؟“

ہاں کے واقعے نے اس شک کو جھٹلادیا تھا۔ یقیناً یہ کوئی اور تھا۔ جو فرجاد کی جان کے درپے تھا۔
اسی لئے آصف کے ذہن میں عشق کے چکر کا خیال آیا تھا۔ ممکن ہے رفاقت ہی کا پیکر ہو۔
انہی لئے اس نے فرجاد سے پوچھا تھا۔

”یہ تمہیں کیا سوچھی۔“ فرجاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تازے کی وجہ زن زور اور زمین ہی ہوتی ہے۔“

”یہاں تازے کا تو مسئلہ ہی نہیں۔“

”تازہ نہ سہی دشمنی کہہ لو۔“

ہاں اب تم نے ٹھیک لفظ استعمال کیا۔ لیکن بھائی میرے تم یہ سوال واپس ہی لے لو تو اچھا ہے۔“

”کیوں“

”اس لئے کہ تماہل آپ کے اس قادم کی دنیا ویران و غیر آبادی ہے۔ اس لئے زن والا پتہ تو
نہ کیا۔ رہ گیا زور اور زمین۔ سو تم ان خطوط پر اپنی نقیشتیں شروع کر دو۔“

”ہوں۔“ آصف سوچ میں ڈوب گیا۔

”فرجاد۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولا۔ ”تم نے درست کہا۔“

”کبھی کوئی غلط بات بھی کہی باید و ملت نے۔“

”تم مذاق کے موڈ میں ہو اور معاملہ خاصا سنجیدہ ہے۔ خدا انخواست اس دن تم نشانی کی زد میں آ
نا۔“

آصف کو بھر پوری سی آگئی۔ فرجاد بھی یاد کر کے کانپ گیا۔ لیکن مسکراتے ہوئے بولا۔ ”آج
دہر تم قلم بھی ہو گئی ہوئی۔“

”بکواس بند کر دو۔“

”آصف۔“

”ہوں۔“

”میں جس پوزیشن میں ہوں نا۔ ایسی باتوں کے لئے ہمہ وقت ذہنی و دماغی اور دلی طور پر تیار رہنا
باید۔ دھن دولت کا رخائے زمینیں۔ ہو نہ۔ کوئی نہ کوئی دشمن تو پیدا ہو گا ہی۔“

”ہمیں بہت محتاط رہنا چاہیے۔ تمہاری جان بہت قیمتی ہے۔“

”چھوڑو یار۔ زندگی موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ زور و خوف اپنے اوپر مسلط کر لیا۔ تو لے
لی۔ موت کون مرے گا۔ چلے دو نکال دے۔“ اس نے آگے کو ہرگز نہیں بکھرے۔ بچے آگے

پیشانی اس کے ذہن پر بھی مسلط تھی لیکن حسب عادت وہ اس کا زیادہ اظہار نہیں کرنا چاہتا

”قسمت اچھی تھی۔ ورنہ نہ بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

”دشمن کون ہو سکتا ہے۔“

”کون ہو سکتا ہے؟ ہوسنے کی بات ہے۔“

”دشمن ہے تو سہی۔ یہ تیری دفعہ ہے۔ اور میں سوچتا ہوں تو وہ ہمارے گھوڑے کے کا
میں گرنے کی کڑی بھی اس سلسلے سے ملتی ہے۔

”شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔“

”فرجاد۔“

”ہوں۔“

”ایک بات پوچھوں۔“

”ہاں۔“

”کوئی عشق و شوق کا پتہ تو نہیں۔“

فرجاد ہنس پڑا۔ آصف کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ دونوں حویلی کے پچھلے میسر پر آئے آئے سامنے بیٹھے
کھیل رہے تھے۔ دونوں کا دل کھیل میں نہیں گم رہا تھا۔ پریشانی دونوں کے اعصاب پر مسلط تھی

تین دن پہلے فرجاد پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا وہ بال بال بچا تھا۔ اس سے پہلے بھی دو ایک دفعہ اس کی
لینے کی کوشش کی جا چکی تھی۔ آصف اس کے بڑے بھائی اور سرپرست کی حیثیت سے اس

میں کھوج لگانے کی دوزخ صوب کر رہا تھا۔ پولیس تک معاملہ پہنچا تھا۔ اور اپنے طور پر حفاظتی تا
کی جاری تھیں۔

شک اس خاندان کے افراد پر تھا۔ جنہوں نے عالی نور محمد کی جان لینے کی متعدد بار کوشش
تھی اور ایک بار ان کی جان بچانے عز بڑ جان ہار بیٹھا تھا۔

پولیس کو اپنے شک سے آصف نے مطلع کر دیا تھا۔ ان لوگوں کی نگرانی ہو رہی تھی۔

تھا۔ قدرت نے اسے بے انتہا وسیع ذہن اور مضبوط دل دیا تھا۔ پھر تقدیر کا قائل ہو کر اس نے اپنا حوصلہ خوب مضبوط کر لیا تھا۔

آصف نے جتنے نہیں اٹھائے اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ جو جو مشکوک فرد اس کی نظر میں تھے۔ ان کے متعلق وہ پولیس کو اطلاع میں لینے کا سوچ رہا تھا۔

”آصف۔“ فرجاد نے آصف کو متشدد دیکھ کر کہا۔

”ہوں۔“ وہ بولا۔

”ایک تجربہ سے میرے ذہن میں۔“ فرجاد نے جتنے جھپٹتے ہوئے کہا۔

”کیا؟“ وہ متوجہ ہو گیا۔

”کچھ دلوں کے لئے ملک سے باہر نہ چلا جاؤں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

تجربہ معقول تھی۔ لیکن آصف کے لئے فرجاد کی ہدائی برداشت کرنا شاید ممکن نہیں تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”دیکھیں۔“

”تم چلے گئے۔ تو میرے لئے کیا رہ جائے گا۔“

آصف نے اسنے غلو سے اور محبت سے کہا۔ کہ فرجاد متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے بڑے پیار اور محبت سے آصف کو دیکھا۔

”اللہ تمہیں ہر بلا سے محفوظ رکھے۔“ آصف نے جلدی سے کہا۔

فرجاد نے مسکراتے ہوئے پتے پچھتا شروع کئے۔ آصف اپنے آپ کو کھیل کے لئے آمادہ نہ کر سکا۔ جب تک وہ فرجاد کے دشمنوں کا پتہ نہ لگا لے کر انہیں گرفتار کر سکا نہ پہنچا لیتا۔ اسے سکون نہیں نہ مل سکتا تھا۔

ملازمہ کافی کی ٹرے اٹھائے اور آگئی۔ فرجاد نے پتے پچھتا دیئے۔

”جیتتی رہو شینا۔“ اس نے مسرور ملازمہ سے ہنس کر کہا۔ ”بہت ہی چاہ رہا تھا۔ ٹرے میز پر رکھ کر وہ کافی بنائے لگا۔

”لو پیو۔“ فرجاد نے پیالی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اے مسٹر۔“ اس نے آصف کو متوجہ کرنے کے لئے بیچ سے میز بھائی آصف نے پیالی پکڑ لی۔

”یار بڑے زور رنج ہو تم بھی۔ مگر مند ہونے کی کیا ضرورت۔ خوش ہو جاؤ۔ کہ نشانہ خطا ہو گیا تھا۔ آئندہ کے لئے جو جو احتیاط لازم ہے وہ کر ہی رہے ہیں۔ باقی جو اللہ کو۔“

اس کی بات پوری بھی نہ ہو پائی کہ تراس سے گولی سنائی ہوئی فرجاد کے کان کے قریب سے

گزر گئی۔ جسے کا توفیق کے بغیر پیالی پچھتا کر آصف فرجاد پر بھجوا اور اسے کرسی سے گھسیٹ کر اتر کر اسے گراتے ہوئے خود اس کے اوپر جھک گیا۔ اس کا پاؤں سوچ کھٹک گیا۔ لیکن اس نے برق رفتاری سے فرجاد کو گرا گیا۔

اور

”سری گولی

آصف کا بازو پیرتے نکل گئی۔ وہ فرجاد کے سینے پر اوندھا کر گیا۔

”آصف۔“ کی حاضر دماغی اور پھرتی نے فرجاد کی جان بچا لی تھی۔ خود زخمی ہو گیا تھا۔ گولی بازو کی ہاتھ سینے کے پار بھی ہو جاتی تو مجب نہ تھا۔ ہر حال اس نے اپنی جان پر مکمل کر فرجاد کی جان بچا لی تھی۔

گولی کی آواز دور دور تک گونج مچی تھی۔ حویلی کے اندر اور باہر کھلبلی مچی تھی۔ اس پاس کے لوگ بیچ ہو گئے تھے۔ ملازمین حواس باختہ تھے۔ حویلی میں رہنے والے رشتہ داروں عزیزوں کو کچھ وجہ ہو تو نہ رہا تھا۔ فرجاد کی بوڑھی کیا سینے پر دو ہتھ مار مار کر چیخ رہی تھی۔ بہت کم لوگوں کو ابھی پتہ چلا تھا کہ گولی آصف کے گلی ہے۔ اور اس کے سرخ سرخ خون سے فرجاد کی فیض ٹر ہو گئی ہے۔

اک ہنگامہ۔ جہاں تھا۔ آصف کا سرخ سرخ خون فوارے کی طرح ابل رہا تھا۔ دروے وہ بے مال ہو رہا تھا۔ صدمے کی نوعیت سے حواس باختہ بھی۔ کوشش کے باوجود اس پر غصہ دھڑکی چلائی جا رہی تھی۔ وہ چند لمحوں کے لئے فرجاد کے بازوؤں میں غافل ہو گیا۔

فرجاد کا دل تڑپ اٹھا۔ اس عظیم انسان کے لئے اس کے سینے میں درد و تڑپ کا سمندر موجزن تھا۔ اس کی اتنی بڑی قربانی پر قربان ہو جانے کو دل چل رہا تھا۔

دقت ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رشتے کے بچپا ہاموں، خالو سب متع ہو گئے۔ آصف کی اتنی اتنی قربانی سے کبھی مرعوب و متاثر تھے۔

انہوں نے آصف کو جلدی جلدی ہسپتال پہنچایا۔ فرجاد کو اس کے کمرے میں لے گئے۔ کوئی پولیس والوں کے ساتھ جانے کو قہر پر رہا۔ اس پاس کے لوگوں کی تشدد میں پڑھوسوں کی تلاش میں چاہیوں کی ہمراہی میں نکل گیا۔

آصف کو مرہم پٹی کے بعد ہسپتال کے ایک الگ کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ جلد ہی وہ حواس میں آ گیا۔ سب سے پہلا سوال جو اس نے اپنے ارد گرد دیکھے لوگوں سے کیا وہ فرجاد کے متعلق تھا۔

”وہ خیریت سے تو ہے۔ اسے تو گولی نہیں لگی۔ بچ گیا ہے۔ ناس کی پوری پوری حفاظت کی جائے۔ وہ اکیلا نہ رہے۔“ وہ ایسی ایسی باتیں کرتا رہا۔

جب فرجاد اپنے ہوش و حواس میں پوری طرح لوٹا۔ حادثے کا ذہنی خوف کم ہوا تو اس نے آصف کے پاس جانے کی خواہش کی۔ حقائق بدشکلی اپنی جگہ۔ پر وہ آصف سے دور نہ رہ سکتا تھا۔ رحیم خالو اور امیر بچا کے ساتھ وہ ہسپتال پہنچا اور آصف کو دیکھتے ہی اس سے پٹ گیا۔ ”یہ تم نے کیا کیا آصف۔ اگر گولی خدا نخواستہ کہیں سینے میں لگ جاتی تو میں کیا کرتا۔“

دونوں ایک دوسرے کے سینے سے لگے تھے۔ آنکھوں میں نمی تھی۔ اور شدت جذبات سے آوازیں گھٹ گئی تھیں۔

دونوں کا پیر۔ لے لوٹ اور لا زوال تھا۔

”کل۔“

”ہوں۔“

”پتہ ہے تمہیں۔“

”کیا۔“

”بہت بڑا حادثہ ہوا ہے۔“

”کہاں۔“

”جو پٹی میں۔“

”جو پٹی میں؟“

”ہاں مالک جہاں رہتے ہیں۔“

”کیا ہوا۔“

”چھوٹے مالک پر کسی نے گولی چلا دی۔“

”چھوٹے مالک پر۔“

”ہاں۔“

”پھر۔“

”بڑے مالک ایک دم چھوٹے مالک کو گرا کر اوپر جھک گئے۔ دوسری گولی ان کے بازو میں گئی ہے۔ چھوٹے مالک کی جان بچ گئی۔ بڑے مالک کا بازو زخمی ہے۔ وہ ہسپتال میں پڑے ہیں۔ گل بانو کا چہرہ فن ہو گیا۔ آنکھوں میں دیرانی اثر آئی۔ جلدی سے تیرو کو کندھے سے پکڑ کر بہلی۔ ”مجھے کس نے بتایا؟“

”بھائی نے۔ سبھی گاؤں والوں کو پتہ چل گیا ہے۔“

”کب ہوا یہ حادثہ؟“

”کل شام۔“

”گل بانو نے دل تھام لیا۔“

جیو جماند یہ نہ سہی پھر بھی بھانپ گئی۔ لیکن جو کچھ بھانپا۔ اس پر یقین کرنے کو وہ ذہنی طور پر تیار نہ تھی۔

گل بانو اٹھ کر دروازے میں کھڑی ہو گئی۔ یہ خبر اس کے حواس کو بری طرح متاثر کئے تھی۔ جیو کچھ سمجھتے سمجھتے نہ سمجھتا تھا کہ اس کی پشت پر آگئی۔

کنڈھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا چہرہ اپنی طرف گھما لیا۔

”گل بانو۔“ اس نے صرف اتنا ہی کہا۔

اور گل بانو صبر و ضبط کی جو شعوری کو پیش کر رہی تھی۔ اس میں ناکام ہو گئی۔ جیو کے کندھے پر سر رکھ کر سسکا اٹھی۔

”گل بانو۔ مجھے۔ مجھے۔ کچھ تو بتاؤ۔“ جیو پریشان ہو گئی۔

”جیو۔ مالک ڈھکی ہو گئے ہیں۔“ وہ دھکی لینے میں صرف اتنا کہہ سکی۔

”لیکن۔ گل بانو۔ تمہیں۔“ جیو ششدر تھی۔

گل بانو نے آہٹلے سے آسو پونچھے۔ وہ سخت پریشان لگ رہی تھی۔ اس کا رنگ سپید ہو رہا تھا۔ اور کسی غصے کی پرچھائیاں اس کی آنکھوں میں پراؤ ڈال رہی تھیں۔

”مالک بچ تو گئے ہیں نا۔“ وہ جیو سے مخاطب تھی۔

”ہاں بازو میں گولی لگی ہے۔“ جیو نے کہا۔

”اللہ۔ اگر انہیں کہیں اور گولی لگ جاتی تو۔“ گل بانو اپنے آپ سے جیسے کہہ رہی تھی۔

”کیا بات ہے گل بانو۔“ جیو گل بانو کے سامنے آتے ہوئے پتلی کالی چھت والے برآمدے میں پڑے ہاں کے پلنگ پر ٹکا بیٹھے کے سمارے بیٹھے ہوئے سخی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

گل بانو ہراساں تھی۔

”کیا قصہ ہے۔“ جیو اب چھینرے کے موڑ میں تھی۔ قصہ تو اس کی سمجھ میں خود بخود ہی آگیا تھا۔

اور اس کے کسی اصرار کے بغیر ہی گل بانو نے برآمدے کی کچی منڈ پر بیٹھ کر اپنی معصوم محبت کا اعتراف کر لیا۔

”واقعی گئی بانو۔“ جیو دونوں تھینچوں پر چہرہ دکائے اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

”ہاں۔“ گل بانو بڑے مطمئن انداز میں بولی۔

”بڑی تمہی سے تو۔ اب تک بتایا ہی نہ تھا۔“ جیو بولی۔ بڑی آہی کی سہیلی۔

”دونوں گھل مل کر باتیں کرنے لگیں۔ گل بانو آصف کے لئے منتظر پریشان تھی۔

”ان کی خبر کر کیسے پتہ کروں گی جیو۔“

”میں بھائی کو شرمیحوں گی۔ سب لوگ ان کا حال پوچھتے حولی جا رہے ہیں۔“

”روڈ بھیجا کہو جیو۔“

”روڈ ہی بھیجا کروں گی۔ تو بے فکر رہو۔“

”جیو۔ کسی سے کہنا نہیں۔“

”میں پاگل ہوں کیا۔ تمہاری طرح نہیں ہوں میں۔ کچی سہیلی ہوں۔ کچی۔“

جیو نے آصف کی خبر خبر گل بانو تک پہنچانے کا ذمہ لیا تھا۔ اس کا راز راز رکھنے کی بھی ذمہ داری نہ تھی۔ بھائی کو شرمیحوں حولی جانے اور ہسپتال سے خیریت کی خبر لانے کے لئے اسے بڑے بے پارتیلے پڑے لیکن اس نے گل بانو سے کیا ہوا عہد پوری طرح نبھایا۔

گل بانو کی بے قراری دید کے قابل تھی۔ اس کا بس چلنا تو انکر آصف کے پاس جا پہنچتی۔ وہ ہم سہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی وحشتیں جنوں خیز ہو گئی تھیں۔ چہرے کی شگفتگی۔ بیمار سی افسردگی

میں بدل گئی تھی۔ اور حقیقت جیسی رنگت یوں لگنے لگی تھی۔ جیسے چاندنی۔ تاریکیوں میں گھل گئی ہو۔ جیو کے سوا سب سیلیوں کا سبک اس نے کر پے اور لوٹے گا نا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ لیکن اس

کا اتنا یا پھر کشمی میں سیلیوں کے غول لے کر پے اور لوٹے گا نا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ لیکن اس نے تو سب چیزوں سے منہ موڑ لیا تھا۔ پیروں چپ ڈھکی رہتی۔ کام پڑے رہتے اسے ہوش ہی نہ

ماتا۔ اور تو اور اب اپنے پیارے بابا کے کاموں میں بھی وہ کو تباہی کرنے لگی تھی۔ چند دنوں سے بابا کو کھانسی کی بہت شکایت تھی۔ رات بخار بھی ہو جاتا تھا۔ طبیعت گرمی گرمی

رہتی تھی۔ کئی دنوں سے وہ دکان پر بھی نہ گیا تھا۔ گل بانو بھی سارا وقت گھر پر رہتی تھی۔ اس کی سیلیاں مائے اتیں۔ تو وہ بابا کی خرابی طبع

ابا نہ کر کے ٹال دیتی۔ اس دن بھی اس نے سب کو یہی کہہ کر ٹال دیا۔

”چلی جاؤ گل۔“ بابا نے سیلیوں کو مایوس لوٹنے دیکھ کر کہا۔

”نہیں بابا۔“

”کیوں بیٹی۔ گھر بیٹھ کے کیا کرو گی۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ کچھ دنوں سے تیرا مزاج بدلا بدلا سا

ہے۔ کسی سہیلی سے لڑائی جھگڑا تو نہیں ہو گیا۔

”نہیں بابا۔“

”تو پھر ان کے ساتھ کیا بات کیوں نہیں۔“

”میں نہیں چاہتا۔“

”پریشانی کیا ہے۔ میں کچھ زیادہ پیار تو نہیں ہوں۔ یہ کھائی تو ہوتی ہی رہتی ہے۔“
”بابا۔“

وہ جانے کیوں ایک دم رو پڑی۔

بابا پریشان رہ گئے۔ اس نے گل بانو کو اپنے قریب بٹھالیا اور بڑی ملامت سے پوچھنے لگا۔
گل بانو سادہ لوح تھی۔ یوں بھی اب رائے کی وسوسوں سے زیادہ پھیل گیا تھا۔ رحمان اسے پیار سے افسردگی کی وجہ پوچھ رہے تھے۔ اس کا دل سیال سی شے بن کر رہنے لگا۔ وہ روہے ہوئے ہوئی۔ ”مالک زخمی ہیں بابا۔ ان کے گولی لگی ہے۔“

بابا کی آنکھیں پھٹ جانے کا حد تک کھل گئیں۔ حیرت سے ہونٹ کانپ گئے۔ اور وہ بھونک سا گل بانو دیکھنے ہوئے بولا۔ ”اس وجہ سے پریشان رہتی ہے تو۔“

”ہاں بابا۔“ اس نے کہا اور اپنا سر بابا کے سینے پر رکھ کر سسکنے لگی۔ جیسے سسکنے میں آگیا اس نے گل بانو کو دیکھا۔ اور پھر اپنے بھونے سے منی کے گھر وندے پر نگاہ ڈالی۔ منی کی دیواروں پر جھٹکے ہوئے برآمدے اور پچی پچھت کے ایک کمرے والا گھر جس میں دو ایک لہڑا اور چند منی آٹا تانبے کا برتن تھے۔

ایک لوہے کا چھوٹا صندوق اور بان کے موٹے موٹے پاپوں والے پلنگوں کے سوا اور کچھ تھا۔

گل بانو اس کے سینے پر سر رکھ کر سسک رہی تھی۔ وہ کھلی کتاب غصی اب کچھ اور پوچھے۔
”مخانی نش ہی نہ تھی۔ بے انتہا رہا بابا کا گل بانو کو جھنجھوڑ ڈالے۔ اور چیخ چلا کر کہے یہ تو۔ کہاں سر جھوڑا گل بانو کی دیواروں سے سر جھوڑتی تو کچھ بچنے کا امکان بھی تھا۔ بالی نور محمد کی اوپڑ حویلی کی گٹھار چنانوں ایسی ڈالیں تھیں کہ لوہاں کر دیں گی۔ اسے گل بانو پر بے طرح غصہ آیا۔ لیکن محبت۔ اس کا تہ اسے عملی تجربہ تھا۔ اس نے رشتوں کو چاہا تھا۔ اس کی زبان نہ جا تھا اس کے طور و طریق نہ آتے۔ پھر بھی محبت نے دونوں کو اک انوٹ بندھن میں جکڑ دیا تھا۔ محبت کی عقلیت کا وہ قائل تھا۔

محبت خدا

اور خدا محبت کا ناکل تھا۔

لیکن یہاں معاملہ اور تھا۔ محبت کو بالی طاقت کی تلوار نے کاٹ دیا تو کیا ہو گا۔ اور پھر یہ بھی فکر کی بات تھی۔ کہ عالی نور محمد کے صاحبزادے کی گل بانو پر نظر کس رنگ میں پڑی تھی۔ یہ وہ کھیل تھا میر زادے کا یا وہ بھی محبت میں سنجیدگی کی ان حدود کو چھو رہا تھا۔ کیا اتنا بلند مرتبت انسان گل بانو جیسی غریب لڑکی کو اپنانے کے لیے جھک جائے گا۔ زمانے سے کھرانے کی بہت رکھے گا۔

لہ بھر میں ہزاروں خیال بابا کے ذہن میں اتر گئے۔ بابو سی اور ٹا امیدی سے وہ منی کے ڈھیر کی طرف ہو گیا۔

گل بانو اٹھ کر باہر چلی گئی۔ اور وہ سوچوں میں گم چارپائی پر چت پڑا رہا۔

لیکن

آصف کو یوں لگتا تھا۔ جیسے کسی نے اسے بند بچرے میں قید کر دیا ہو۔ اسے گل بانویاد آتی تھی۔ اور وہ اڑ کر اس تک پہنچنا چاہتا تھا۔ جانے اس پر کیا جتنی ہوگی۔ کتنا تڑپتی ہوگی۔ کتنی بے چین۔ کیسی بے قرار ہوگی۔ جوں جوں دن گزر رہے تھے۔ آصف کو ہسپتال کے اس کمرے سے رات ہونے لگی تھی۔

”فرجاد۔“ ایک دن اس نے کہا۔

”ہوں۔“

”مجھے یہاں سے پھینکیں کب ملے گی۔“

”کیوں۔“

”گھر کیوں نہ چلا جاؤں۔“

”لیکن تمہارا زخم۔ اور پاؤں کی سوج۔“

”اب ٹھیک ہے۔ ڈرنے تک گھر پہ بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں تو ڈاکٹروں نے مجھے معذور و مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔“

”پانچل کیس گئے۔“

”نہیں فرجاد میں اب گھر جاؤں گا۔ ڈسچارج لینا ہے۔ مرمم پٹی گھر پہ بھی ہوتی رہے گی۔“

”یوں بھی ٹھیک ہی ہے تقریباً۔“

”نہیں آصف۔ جب تک ڈاکٹر خود اجازت نہ دیں تم یہاں ہی رہو گے پھر تمہیں یہاں

تذہیب بھی کیا ہے۔“

”بہت زیادہ ہے۔“

”کی؟“

”مجھے جیسے جیسے پھرے والے انسان کو یوں باندھ کر ڈال دینا واپس نہیں کیا۔ اور پھر فرجاد

کام نہیں کرنے کو۔ گاؤں جانا ہے۔ فصل کا جائے کیا حال ہوا۔“

”خوشی شریف دین اور محل خاں ساری دیکھ بھال کر رہے ہیں۔“

”میں ان کے کام سے مطمئن نہیں۔“

”کچھ نہ کچھ تو کڑی رہے ہوں گے۔“

”فرجاد تم نہیں جانتے۔“

”اوہ۔ کیا فرق پڑے گا۔ آدنی خسارے ہی میں چلی جائے گی نا۔ چلو تمہارا سر معدت۔“

”ایسے حاتم طالعی نہیں نہ بنو۔“

فرجاد نے۔ آصف کی تیار داری جس خلوص اور لگن سے کی۔ اس نے آصف کے دل میں فرجاد کے لیے محبت کا سمندر موجزن کر دیا۔ تیسویں ملازموں کے ہوتے ہوئے وہ ہر کام خود کرتا۔ اس کی پٹی سے لگا کھنوں بیچارہ رہتا۔ کئی راتیں اس نے جاگ کر گزاریں۔ آصف کے منع کرنے کے باوجود اس کے گرد ہی منڈلا رہا۔

دشمن کا چہ چل گیا تھا۔ وہی پرانی دشمنی تھی۔ اب معاملہ پولیس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ مگر فرجادیوں محل میں آچکی تھیں۔ اور دونوں خاندانوں کے سرکردہ لوگ سچ بچاؤ کے معاملہ کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔

فرجاد کو اپنی جان کوئی فکر نہ تھی۔ اسے تو آصف ہی کا خیال تھا۔ آصف جس نے اپنی جان پر کھیل کر اس کی جان بچائی تھی۔ یہ انسان اسے پہلے عزیز تھا اب اس کی نظروں میں عظیم بھی ہو گیا۔

فرجاد نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ آصف کی صحت کا بخش دھوم دھام سے منائے گا۔ اور اس خوشی کے موقع پر اس کو اپنی جان اور اولاد اور ملکیت میں آدھے حصے کا قانونی حقدار بنا دے گا۔

آصف کو وہیں دولت کی خواہش نہ تھی۔ ان خطوط پر تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ فرجاد اسے بہت پیارا تھا۔ اور اس پر یاری کی وجہ سے وہ اس کی زمینوں کی دیکھ بھال۔ کارخانے کا حساب

کتاب اور لین دین کی گراں ذمہ داری اپنے اوپر لیے ہوئے تھا۔ وہ تو اپنے اسی جھ پر قانع تھا۔ ہوا

اباں بی نے اپنے حصے میں سے اسے دے رکھا تھا۔ اس سے زیادہ کی اسے ضرورت بھی کیا تھا۔ فرجاد

کا پیار ہی بہت کچھ تھا۔

ہفتے ڈیڑھ ہی میں وہ ہسپتال سے نکل گیا۔ زخم پھر نہیں رہا تھا بڑی کو بھی معمولی سا گزند پہنچا تھا۔ ڈاکٹر علاج معالجے میں کوئی کوتاہی نہ کر رہے تھا۔ تیار داری کا بار خود فرجاد نے اپنے کندھوں پر لے رکھا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اس کے پاس گزارتا۔ باتیں کرتا۔ ناش کھیتا۔ کسی مذاق سے ہلکانے کی کوشش کرتا۔

”میں نے توجہ لیا ہے آصف۔“
”کیا۔“

”وہاں کی فصل ساری کی ساری کسانوں اور گاؤں کے غریبوں میں تقسیم کروں گا۔“
”جی۔؟“

”ہاں یہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“
”کس خوشی میں جناب۔“

”تمہاری صحت یابی کی خوشی میں۔ یہ فصل غریبوں میں تقسیم ہوگی۔ آصف یہ میرا فیصلہ ہے۔“

”بے وقوف کہیں کے۔“

”جودل چاہے کہہ لو۔ لیکن میرا فیصلہ اٹل ہے۔“

آصف پہلے تو اسے مذاق سمجھا۔ لیکن فرجاد سمجیدہ تھا۔ آصف اسے سمجھانے لگا۔

”عقدار کا حق اسے ملنا چاہیے۔ غریبوں کی مدد اور چیز ہے۔ محنت کش کو محنت کا صلہ پورا پورا ملتا ہے۔ ہم کسی کی حق تلفی نہیں کرتے۔ ضرورت مندوں کو بھی دیتے رہتے ہیں۔ لڑکیوں کو شادیوں میں مدد دیتے ہیں۔ اور بھی جسے جس چیز کی حاجت ہوتی ہے بے دھڑک آکر کہہ دیتا ہے اور ہماری پوری پوری کوشش ہوتی ہے۔ کہ حاجت پوری کر دی جائے۔“

آصف باتیں کرتا رہا۔ اور فرجاد دیر سے دھیرے مسکراتا رہا۔

بانوں کا رخ پھر گیا۔ آصف نے بہ منت فرجاد سے کہا۔ کہ وہ اسے اسپتال سے چھٹی دلا دے۔

وہ گھر جانا چاہتا تھا۔

اسے گاؤں جانا تھا۔

اس کی گل بانوں کا انتظار کر رہی ہوگی۔ وہ بہت جلد اس تک پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ گل بانوں کے متعلق فرجاد کو تو کچھ کہہ نہ سکا۔ لیکن ہمارے خاٹے گاؤں میں بیسیوں کام اس کے منتظر تھے۔ وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا۔

”بہت نقصان ہو رہا ہے۔“

”ضرورت۔ نذرانہ دیکھ رہے ہوں گے۔“

”تین پواؤں کے کٹھنے دیتے تھے۔“

”نئی لڑکیوں کو شہر کے سکولوں میں داخل کرانا تھا۔“

”پولٹری فارم کا جائے کیا حال تھا۔“

”بیمینوں کا دودھ سوکھ گیا ہو گا۔“

گل بانوں تک پہنچنے کے یہ سب پہلے تھے۔ فرجاد اس کی باتیں سن سن کر مسکرائے جا رہا تھا۔

اور

جب اس نے بہت ہی ضد کی تو وہ بولا۔ ”بھئی اتنی پریشانی کی کیا بات ہے۔ جب تک تم پوری طرح صحت یاب نہیں ہو جاتے۔ تمہاری ڈیوٹی میں اپنے ذمہ لے لیتا ہوں۔“

”تم۔ تم۔“ آصف نے اس کا مستحضر اڑایا۔

”کیوں جی۔ کیا تم مجھے بالکل ہی ناکارہ سمجھتے ہو۔“ وہ تن کر بولا۔

”نہیں ایسی بات نہیں فرجاد۔“ آصف مسکرایا۔ ”تم تو گاؤں کے نام سے بدکتے ہو۔ یہ کام ہمارے بس کا روگ نہیں۔“

”تمہاری خاطر یہ گوارہ کروں گا دوست۔“ فرجاد نے آصف کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری پریشانی تو دور ہوگی۔ لودھہ رہا کہ کل سے میں گاؤں کا چکر لگایا کروں گا۔ تم مجھے گائیڈ کرنا۔ سارے کام یوں پٹناؤں گا یوں۔“ فرجاد نے چٹکی بجاتی۔

آصف کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ شش در شش میں تھا۔ دل چاہا فرجاد کو گل بانوں کے متعلق بتا دے۔ مگر کام کے لیے اس کی راہیں ہموار کر رہا ہے۔

گل بانو۔ جو اس کی پہلی اور آخری محبت ہے جو اس کا سچا پیار ہے۔ لیکن وہ کچھ بھی تو کہہ نہ سکتا۔ کہتے ہوئے بھی سمجھ محسوس ہوتی۔ کام کام کی جو رٹ اس نے فرجاد کے سامنے لگا رکھی تھی۔ گل بان کا سامنا درمیان میں آگیا تو کیا یہ بات فرجاد کو اس کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا نہ کر دے گی۔ اس کی ذات پر فرجاد کو اعتماد تھا۔ ہمانہ بھلنے پر مجبور نہ ہو گا۔

گل بانوں کے متعلق وہ فرجاد کو سب کچھ بتا دے گا۔ لیکن اس وقت نہیں۔ یہ بات کسی اور وقت بھی بتائی جاسکتی تھی۔

دوسرے دن صبح ہی صبح فرجاد زمینوں پر جانے کے لیے تیار ہو کر اسپتال آگیا۔ اپنی پھوٹی سی لٹیکہ لٹائی اور آصف سے ضروری ہدایات لینے کے لیے اس کے بچک کے قریب کرسی بھیج کر بیٹھا۔

”ہوں۔“ اس نے نوٹ بک کھول کر آصف کی طرف دیکھا۔

”ہدایت نمبر ایک۔“ فرجاد مسکرایا۔

آصف نے پچھوڑکی سے اسے دیکھا۔ اس کا پی چاہا کہہ دے سارے کام تو بلاشبہ کر لو گے۔ لیکن یہی گل بانو۔

باؤل خواستہ آصف نے فرجاد کو ضروری ضروری ہدایات دیں۔ فرجاد بچ بچ نوٹ کر آگیا۔

”میں شام کو ساری رپورٹ پیش خدمت کروں گا جناب۔ آپ مطمئن ہو کر آرام فرمائیں فرجاد اٹھتے ہوئے بولا۔ ”سارے کام آپ کی مرضی کے مطابق ہوں گے سمجھ گئے۔ خدا حافظ۔“

فرجاد نے ہاتھ اٹھا کر خدا حافظ کہا۔

”خدا کرے تم زمینوں کی دیکھ بھال کر سکو۔“ آصف نے بے دلی سے کہا۔

”یہ رہائش جواب نہیں صاحب۔ چند دنوں کے لیے یہ فرض اپنے ذمہ لوں گا۔“ وہ خود خدا سے شکریا ادا کیا۔ ”تمہاری خاطر جبرو صبر کر کے گاؤں جایا کروں گا۔“

”شکریہ۔“

”گل ہاں۔“

”ہاں۔“

”ایک خوشخبری سنائیں۔“

”۔“

”کیا ہوگی۔“

”ایسی کون سی خوشخبری ہے جبرو۔“

”بہت بڑی۔ بہت ہی بڑی۔ بہت ہی اچھی بڑی۔“

”کوئی بھی۔“

”اوپر ہوں۔“

”جبرو زیادہ تنگ نہ کرو۔ جو کچھ کہنا ہے کہ بھی پیکو۔ میں۔“

”کے پلے ہی بیزار بیٹھی ہوں۔“

”ہاں جبرو تو کیا جانے تو نے محبت کی ہوئی۔ تو تجھے پتہ چل۔“

”کہ دن کیسے نکلتا اور رات کیسے ڈھلتی ہے۔“

”ہاں۔“

جبرو بیٹھ پڑی۔ اس کے منہ سے سانولے رنگ میں سرخی جھلکے گئی۔ اور موٹے موٹے ہونٹ

”جیل گئے۔“ یہ روگ تھیں ہی مبارک گل۔

”یہ روگ مجھے بہت پیارا ہے جبرو۔ تو کیا جانے لگی۔ ہاں تو سنایا خوشخبری لائی تھی۔“

”باتوں کے چکر میں تو تو نے بھلا ہی دیا مجھے۔“

”اب کہہ دے نا۔“

”گل۔ پتہ ہے تجھے۔“

”کیا۔“

”خدا کرے تم جلد اچھے ہو جاؤ۔ تمہارا کام تمہیں مبارک۔“

”اچھا تو ہو چکا ہوں۔ خواہ خواہ ہی بستر ڈال رکھا ہے۔“

”پاؤں پر دیا ڈال سکتے ہو۔“

”تھوڑا تھوڑا۔“

”تو کیا تم چاہتے ہو۔ جلد بازی میں پاؤں خوب اچھی طرح خراب کر لو۔“

”ہوں۔“ آصف لمبی سی ہونٹ کر کے پیپ ہو رہا۔

”اچھا ابھی۔ شام کو آؤں گا۔“ فرجاد نے پلٹے ہوئے کہا۔

”دعوت تو ابھی سے اتنی تیز ہو رہی ہے۔“

”ذرا مزہ پیکیں نا جناب۔ آج تو بھی ہے۔ دوپہر تو خوب گرم ہوگی۔“

”چلو یہ تجربہ بھی تمہاری خاطر کیے لیتے ہیں۔“

چند لمبے ادھر ادھر کی باتیں کرنے، آصف کو آرام سے لیٹے رہنے اور گولیاں وقت پہ کھانے کی تلقین کر کے فرجاد باہر نکل گیا۔

آصف گل ہانو کے خیالوں میں کھو گیا۔ سیاہ گھٹاؤں ایسے لہراتے ہاں وحشت زدہ کھلی کھلو آنکھیں اور پھسلتی پھسلتی کی طرح لوہدار ہنسم۔ آصف کو اپنے چاروں اور منک ہی منک محسوس ہوئی۔

آنکھیں بند کیے وہ حسن کے جلوے سمیٹنے لگا۔ لذتیں تھیں دردناک خوشیاں تھیں غم تھے۔

گل ہانو جانے کتنی پریشان ہوگی۔ جانے کیا سوچتی ہوگی۔ بیجاری کسی سے حال دل بھی تو نہ

کہہ سکتی ہوگی۔ کاش وہ اس حد تک آزاد و خود مختار ہوت کہ اس کے سنے بندوں ملے آسکتی۔

”آج مالک گاؤں آئے ہیں۔“
”ج۔“

قرط حرت و دست سے گل بانو بے قابو ہو کر جڑو سے لپٹ گئی۔ وہ صحن میں بیٹھی گندم چھلا رہی تھی۔ ایک طرف صاف کیے دانوں کا ڈھیر تھا۔ دوسری طرف چھانی جانے والی گندم تھی درمیان میں گل بانو بیٹھی تھی۔ اس نے آج گھر کا سارا کام جلدی جلدی ختم کر لیا تھا۔ اور اب گندم صاف کر رہی تھی۔ شام تک آٹا پس جانا چاہیے تھا۔ بابا کی طبیعت ان دنوں بہت ہی خراب رہنے لگی تھی۔ یوں گل بانو کے کام کچھ زیادہ ہی بڑھ گئے تھے۔ جیروا سے خوشخبری سنانے آئی تھی۔ گا بانو اس کی مدد سے گندم چھان پھلک جلدی کر لینے کا سوچ رہی تھی۔ لیکن اس نے جو خوشخبری سنا لی وہ کام و ام چھوڑ کر جڑو سے لپٹ گئی۔ مالک کی گاؤں آنے کی خبر ایسی تو نہ تھی۔ جو وہ اور کاموں میں مشغول رہتی۔ ”تجھے کس نے بتایا جو۔ تم نے خود دیکھا انہیں۔ ہاں اللہ میرے دل کو کیا ہو۔ لگا ہے جیروا۔ اسنے دنوں بعد آئے ہیں۔ میں نے کس طرح یہ دن کاٹے ہیں جنہیں کیسے بتاؤں۔ کہ بتاؤں جیرو۔“

وہ جیرو کی سنے بغیر اپنی کہے گئی۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ باندھ کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ”ا جی تیرا لاکھ لاکھ شکریہ۔ مالک خیریت سے ہیں۔“
جیرو دانہ دانہ گندم چیتے ہوئے مسکرائے گئی۔
”جیرو دانہ دانہ گندم چیتے ہوئے مسکرائے گئی۔“
”جیرو۔ میں نے منت لی تھی۔ مالک ٹھیک ہو جائیں۔ تو مسجد میں تیل ڈالوں گی۔ جیروا زیارت پر پھول چڑھاؤں گی۔ تو بچے کی مامی سے ساتھ۔“

”چلوں گی۔“

”آج چلیں گے۔“

”بہت اچھا۔“

”چل جلدی جلدی میرا ہاتھ بٹا۔ آٹا نہیں ہے گھر میں شام تک پس جا اچا ہے۔ پھر اپنے کپڑے بھی دھوئے ہیں۔ بابا کے بڑی چادر بھی میلی ہو رہی ہے۔“

”سارے کام تجھے آج ہی کرنا ہیں۔“

”کپڑے تو دھو لیا نا۔ اسنے گندے ہو رہے ہیں۔ جی جیرو جب سے مالک کے گولی لگی ہے اللہ قسم جو کپڑے بدلنے کوئی چاہا ہو۔“

”آج تو ضرور چاہے گا۔“

جیرو نے چھوٹی چھوٹی آنکھیں شرفی سے گھمائیں۔ گل بانو کھکھلا کر ہنس پڑی۔ ہنسی تو کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

گل بانو کا پاؤں زمین پر نہ پڑ رہا تھا۔ چاٹن کی آس تھی۔ سارے گلم کا گروہ شام کو سر لیا انتظار تھی۔ کام کا بج سے فارغ ہو کر آصف کے آنے کی توقع تھی۔ آج اس نے چھینٹ کا جوڑا پینا تھا۔ بڑے اہتمام سے مینڈیاں گندھوائی تھیں۔ وہ کسی سرحدی گاؤں کی قبائلی دوشیزا کا روپ دھارے تھی۔

تیرو سے ملانے آئی اور بابا کو بخنی پکار کر ستر صحن میں لگا کر جلدی لوٹ آنے کا کہہ کر وہ اس لے ساتھ باہر نکل گئی۔

بابا کی جماندہ آنکھیں بچی کے مزاج کے تغیر سے کچھ اغذ کرنے کی خوش کر رہی تھیں۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ گل بانو کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر ہی کنارے اپنی مخصوص جگہ پر جسم انتظار کی بیٹھی رہی۔ دل آکٹایا تو اٹھ کر کپڑ پر آگئی۔ فکرت بڑھوں پرانے پل کے روض پر چھٹی دیکھ چکے تھے۔ ہاتھ دوسرے گاؤں کے اس راتے کو دیکھتی رہی جس سے آصف کے آنے کی توقع تھی۔

شام کا دل ڈوب گیا۔ اور تاریک رات اترنے لگی۔ ستارے کانپ کانپ گئے۔ ہر دھڑکن پر آواز کا گمان ہوا۔ ہر آہٹ پر آصف کی آمد کچھ نہ چو گی۔

لیکن

وہ نہیں آیا۔

وقت کافی گزر گیا تھا۔ انتظار بے سود تھا۔ گھر پہنچا بابا آکٹا تھا۔ اس سے زیادہ دیر نہ لٹی تھی۔ دھیرے دھیرے چلتی دے پائے گھر لوٹ آئی۔ آصف کے نہ آنے سے اسے اپاوسی ہوئی تھی۔ کئی خدشے کئی دوسرے کئی وابستہ راز خانے لگے تھے۔

خدا جانے ہم دوسروں و اہلوں اور خدشوں کے عفریت کیوں پال لیتے ہیں۔ جبکہ جانتے ہیں۔ کہ یہ ہمارے ہی وجودوں کو ڈس لیتے ہیں۔

گل بانو کے دل میں شکوک پیدا ہوئے۔ تو ان کی اذیت سے تملانا لگی۔

پھر اپنے دل کو خود ہی سہارا دیا۔ اپنی دھارس خود ہی بندھائی۔ آج نہ آئے تو کیا ہوا۔ گل بانو نہیں گئے۔

لیکن دوسرے دن بھی پہلے دن جیسا ہی دھڑوا۔ وہ نہیں آیا۔ گل انتظار کرتی رہی۔ کو فٹ اور اذیت کے لمحوں سے دوچار ہوتی رہی۔

پھر تیرا دن بھی گزر گیا۔

اور چوتھے دن تو اس کا پینا نہ صبر لہرز ہو گیا۔ وہ آکٹائی جھلائی تو تھی ہی جیرو کے سر ہو گئی۔

ایہ ماہی نہیں ہیں، چرو۔“

بیڑی کی بات بھلائے گا کوئی جواز گل کے پاس نہیں تھا۔ وہ خود بھی مالک کے تذکرے لوگوں کی اہلی سن رہی تھی۔ حکیم جی سے بابا کے لیے دو ادائی لینے گئی تو وہاں بیٹھے لوگ بھی اس حاتم طائی کی باتیں کر رہے تھے۔ گل میں سے گزری تو تین عورتیں کھڑی مامی کا ذکر کر رہی تھیں۔

اور جیو کے بھائی نے تو بہت سی خبریں سنائیں۔

”ہر گاؤں میں ایک در در کھلے گا۔“

”ڈاکٹر بھی میاں رہا کرے گا۔“

”جن لوگوں کا مرض بہت بڑھ چکا ہے انہیں ہسپتال داخل کروایا جائے گا۔“

”آنکھوں کی بیماری عام ہے۔ آنکھوں کے ہسپتال میں ایسے مریضوں کا علاج مالک مفت کروائیں گے۔“

”گلیاں صاف کروائی جائیں گی۔“

”ہاں ایں بچی نہیں گی۔“

”بیٹھک میں ہر حاجت مند کو کھلے ہندوں جانے کی اجازت ہے۔ اپنی ٹکٹیں مالک سے کسے

لیں اب کوئی روک ٹوک نہیں۔“

گل بانو گم صم تھی۔ مالک میں اتنی تبدیلی آئی تھی۔ کہ تینوں گاؤں کا نظم و ضبط ہی بدل ڈالا

تو کیا۔ کیا۔ وہ واقعی بدل گیا ہے۔

گل بانو کے سینے میں ہوک سی اٹھتی۔ وہ سمجھ نہ پاتی کہ کیا کرے۔

”تو نے کس بات کا بدلہ لیا تھا جیو۔ جو غلط سلاخ فرما لائی تھی میرے لیے۔“

وہ حیران ہو کر بولی۔ ”غلط سلاخ نہ رہا؟“

”ہاں۔“

”کیوں۔“

”مالک گاؤں آرہے ہیں۔“

”روڑ آتے ہیں۔“

”جھوٹ۔“

”تیری مرضی نہ مان۔“

”تو نے دیکھا انہیں۔“

”دیکھا تو نہیں۔ پر ہمیں لوگ کہتے ہیں۔ ابھی کل ہی راہو کہماری کونہیں پر بیٹھی ان کو باتیں کر رہی تھی۔ اس کی ٹانگ جب سے خراب ہوئی ہے۔ کام کاج سے معذور ہے مالک نے اس کا وظیفہ لگا دیا ہے۔ اور شیدو کو چاقی ہونا۔ اسے جس کی آنکھیں خراب ہیں۔ مالک نے اسے آنکھوں کے ہسپتال بھجوا دیا ہے۔ سارا خرچہ وہ خود برداشت کریں گے۔“

گل بانو اس مستند خبر کے بعد کچھ نہ کہہ سکی مگر کرا اسے نکل گئی۔

”بھائی کہہ رہا تھا۔ مالک نے سارا حساب کتاب ہی بدل دیا ہے۔ کوئی ضرورت مندان کے پاس گیا تو خالی نہیں آیا۔ کسی کو کچھ دے رہے ہیں کسی کو کچھ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ دھان کی ہ فصل ہمیں گاؤں ہی میں تقسیم ہوگی۔“

گل بانو آنکھیں کھولے اسے نکل گئی۔

”پاروائے گاؤں سے لے کر ہمارے گاؤں تک ہر آدمی مالک ہی کی باتیں کرتا نظر آتا ہے۔ گل۔ مجھے غلط خبر سنائے کی کیا ضرورت تھی۔ بھلا۔ میں کوئی دشمن ہوں تمہاری۔“

نہیں اور بے یقینی کے درمیانے لیے یقیناً خوش کن نہ تھے۔ گل بانو کے چہرے پر سایے سے لہرا سنے گئے۔ اس کی آنکھوں میں فی ہی آگئی۔

”تیری مانو۔ تو کل خود ان سے مل لو۔“ جیو نے سادگی سے کہا۔ تو حسن کی انا پھرک اٹھی۔ آزاد فضاؤں میں چلنے پڑھنے والی دو شیرہ گردے بھٹنے کی ذلت سے آشنا ہی کب تھی۔ تلک کر بولی۔

”میں کیوں نہ جاؤں۔“

جیو چپ ہو گئی۔ پھر بھانے کے انداز میں بولی۔ ”تیرے بابا بہت بیمار ہیں گل بانو۔ اسی بارے چلی جانا۔ کیا فرمائیں ہسپتال ہی داخل کروادیں۔“

گل زنجی ناگن کی طرح پھٹکاری۔ زہر ٹانگ نظروں سے جیو کو دیکھا۔ اور بولی۔ ہم خبرات

”کیا ہے۔“

”ایک کام کرو گے۔“

”کیا۔“

”گل بانو کے بابا بہت سخت بیمار ہیں۔“

”واقعی۔“

”ہاں بھائی۔ چارپائی اٹھ بھی نہیں سکتے۔ اور تم جانتے ہو کہ ان کا اس گاؤں میں کوئی

بھی نہیں۔“

”چھر۔“

”تم مالک کے پاس جاؤ۔ ان سے کہنا گل بانو کے بابا بہت بیمار ہیں۔“

”اوہ بھی چلا جاتا ہوں۔ مالک پھیری والے ٹیڈ ویل پر بیٹھے تھے۔ ابھی مل لیتا ہوں۔“

”جاؤ بھائی۔ گل بہت پریشان ہے۔“

”تم اسے تسلی دو۔ میں مالک سے بات کرتا ہوں۔ وہ ہو سکتا ہے۔ اسے ہسپتال ہی لے

چلیں۔ یا ڈاکٹری کی ہولہ کر دکھا دیں۔“

”جلدی جاؤ چھر۔“

”مجھے پتہ ہے۔ چرو۔ اب شرے روز ڈاکٹر بھی گاؤں میں آیا کریگا۔ خدا مالک کو زندگی دے۔“

”نہ فریبوں کی سنی گئی۔“

”وہ مالک کی تعریف میں کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ چرو جلدی سے بولی۔“ اب جاؤ بھی نا۔ یہ

نہ ہو مالک کہیں اور چلے جائیں۔ ہاں ان سے یہ ضرور کہنا کہ گل بانو کے بابا بیمار ہیں۔“

”جیوئے جس انداز میں گل بانو کا کما۔ بھائی چراگی سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر سکر کر بولا۔“

”گل بانو کے بابا کا کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مالک صرف بیماری کا سنیں گے تو پچھ نہ کچھ فوراً

کریں گے۔“

”وہ تہمند کے محلے سے کونے سے ہاتھ صاف کرتا تھا اور چنگیر بے ہٹا کر اٹھ بیٹھا۔

جیوئے تہذیب میں تھی۔ گل کر گل بانو کے متعلق کہ بھی نہ سکتی تھی اور بابا کی بیماری کے

خوالہ سے گل بانو کا ذکر مالک کے سامنے کرنا بھی چاہتی تھی۔

”بھائی نے پانی کا کٹرو منہ سے لگایا اور غٹ غٹ پینے لگا۔“

”تم گل بانو کے بابا کما بھائی۔ ہو سکتا ہے وہ ان لوگوں کو جانتے ہوں اور جلدی سے کوئی

نہ دوست کریں۔“

”اچھا بھئی۔ کہہ دوں گا۔ کہہ دوں گا۔“

چرو گل بانو کی وجہ سے پریشان تھی۔ مالک کی بے اعتنائی کا اسے بھی کچھ کم دکھ نہ تھا۔ گل بانو

تو جان کی بازی لگا بیٹھی تھی۔ اور اس سے انتہا بھی نہ ہو سکا تھا۔ کہ گل بانو کو لٹے ہی چلا آتا۔

گیا وہ گل بانو کو بھول چکا تھا۔

اور گل بانو اس کی تفریح کے لیے وہی کھیلنا تھی۔

سوچ سوچ کر اس کا رواج ناف ہوئے لگتا۔ گل بانو گم صبر رہنے لگی تھی۔ جیو اسے سہلا

کی کو شل کرتی۔ لیکن بے سود۔ ویسے ان دنوں بابا کی حالت بھی بہت خراب ہو رہی تھی۔ چارپا

سے ہی کلب کیا تھا۔ تپ تھا نہ کھانسی بس ٹھنڈے ٹھنڈے پیئے آتے رہتے۔ دل ڈھنڈا رہتا۔ او

آکھیں دیران اور پرانی قبروں کے گڑھوں کی طرح ہوتی جاتی تھیں۔

جیو نے کتنی بار گل سے کہا تھا۔ کہ خود مالک کے پاس چل جائے اپنے لیے نہ سہی اپنے

کے لیے سہی۔ لیکن گل نے اٹل اپنے باپ سے دراخت میں لیا تھا۔ کبھی یوں جھکنے پر آمادہ

ہوتی۔

جیو زیادہ وقت گل کے پاس رہتی۔ اس کے سارے کام خود کرتی۔ برتن دھوتی بھانڈو لگا

کچے کرے کی لپیا پاتی کرتی۔ بابا کے لیے چائے بناتی۔ اس کی چلم دھوتی اور بھر کر دیتی۔

اس دن بابا کی طبیعت بہت ہی گری گری تھی۔ اندر ہی اندر آگ تھی جو سنگ سنگ کرنا۔

ختم کر دی تھی۔ وہ بہتر سے اٹھنے کی کوشش میں چکر اکر رہا تھا۔ گل بانو اس سے لپ کر روئے نہ

تھی۔

اور اس طرح تپ تپ کر رہتی تھی۔ کہ پتھر کا دل بھی پانی ہوا جاتا تھا۔ اس کا بابا بھی پیچ

بہت بار پیٹتا تھا۔ بچی کو گلے لگائے آنسو ٹپکے کرنے کی کوشش میں روئے جا رہا تھا۔

جیو سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہو سکا۔ گل بانو کی خمد سے ٹکرانے کا اس نے فیصلہ کر لیا

بابا کو توبہ کے چند گھونٹا کر وہ گھر گئی۔ تو اس کا بھائی روٹی کھا رہا تھا۔

”بھائی۔“

وہ والوں میں گیا۔ کہہ کر کندھے پر رکھا اپنی کدال اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

پچھلے پھر بیرو کا بھائی واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کچھ نوٹ تھے۔ بیرو کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ مالک نے دیے ہیں۔ گل بانو کو دے۔ آدھار یہ ہسپتال کے ڈاکٹر کے نام کی چٹھی ہے۔ صبح بابا کو شہر لے جائیں گے۔“

”کی۔“

”اور کیا؟“

”اور۔ اور کچھ نہیں کہا انہوں نے۔“

”اور کیا کہتے۔“

”یہی۔ یہی کہ۔“

”پاکل کہیں کی۔“

”تم نے گل بانو کے بابا کا کہا تھا۔“

”ہاں۔“

”پھر انہوں نے اور کچھ نہیں کہا۔“

”اور کیا کہتے۔“ بھائی تیز آواز میں بولا۔ ”یہی کیا کہ ہے کہ اسنے لوگوں میں بیٹھے انہوں نے میری بات سن لی۔ اور فوراً۔“ ہی رکھ بھی لکھ دیا اور پیسے بھی دے دیے۔ ہسپتال کی ساری بات انہوں نے مجھے سمجھا دی ہے۔ صبح میں ہی لے جاؤں گا بابا کو۔ تو یہ پیسے لے جا۔ گل بانو کو شاید ضرورت ہوگی۔“

بیرو نے پیسے لے لیے۔ اس نے آصف کو متوجہ کرنے کے لیے جیلہ کیا تھا جو کارگر نہ ہوا۔ اسے مایوسی بھی ہوئی اور حیرانی بھی۔

کیا وہ بچہ گل بانو کو فراموش کر چکا ہے؟

اس خیال ہی سے وہ سہم گئی۔ لیکن پھر سر ہٹک کر دماغ سے یہ خیال نکال دیا۔ اسے امید کی کرن نظر آئی۔

آج رات آہستہ ضرور آئے گا۔ ہو سکتا ہے شام ہی کو آجائے۔ اسے پتہ تو چل گیا ہے نا۔ کہ گل بانو کے بابا یہ ہیں۔ انہیں دیکھنے کا زمانہ معقول ہو گا۔ وہ خوش ہو گئی۔

ارای دہشت گل بانو کے گھر چل دی۔

سہ پہر دھڑل رہی تھی۔ موسم خاصا بدل گیا تھا۔ اب وہ گرمی دم توڑ چکی تھی۔ جو جلسا کے رکھ دیتی تھی۔ گلابی سا موسم تھا۔ رات تو خاصی ٹھنڈ ہو جاتی تھی۔ جاڑوں کی آمد آمد تھی۔ تبدیلی بڑی خوشگوار تھی۔

گل بانو نے بابا کی چار پائی برآمدے میں ڈال دی تھی۔ اب تو بابا کو بخار رہنے لگا تھا۔ کسی وقت بہت تیز اور کسی وقت ہلکا۔ عظیم جی کی دوائی سے آفتاب نہ ہوا تھا۔ بڑی بوئیاں بھی ابال بال کر لی تھیں۔ قہوہ بھی برابر استعمال کر رہا تھا۔

برآمدے کے ایک کونے میں مٹی کا چوڑھا تھا۔ جس میں موٹی موٹی لکڑیاں سلگ رہی تھیں۔ بابا کے لیے چٹھی سی پھجوری بنا کر گل بانو چائے جوش میں پانی ڈال کر بولے پر چڑھا رہی تھی۔

بیرو آئی۔ بابا کا حال پوچھا۔ اور پھر گل بانو کو اشارے سے صحن میں آنے کو کہا۔

”کیا ہے۔“ گل بانو گلیے ہاتھ آچھل سے پوچھتے ہوئے بولی۔

”آج میں نے بھائی کو مالک کے پاس بھیجا تھا۔“ بیرو جلدی سے بولی۔

”کیوں۔“ نخوت سے حسن پوچھا۔

”سن تو سن۔“ بیرو نے غصے سے کہا۔

”سن۔“ وہ تلخی سے بولی۔

”مالک بیٹھک میں روز بیٹھتے ہیں۔ لوگوں کی باتیں سنتے ہیں۔ ان کی ٹکٹھیں دوڑ کرستے ہیں۔“

”میں کیا کروں۔“

”بھائی نے بابا کا ذکر کیا تھا۔ یہ دیکھو انہوں نے فوراً ہسپتال میں داخلے کی چٹھی دے دی۔“

”تجھے کس نے کہا تھا ان کی منت ساجت کرنے کو۔“ وہ قہقہے لہجے میں بولی۔ اپنی اہانت اسے کووارہ کہاں تھی۔

”منت ساجت کسی گل۔ بابا کی بیماری کا انہوں نے سنا اور فوراً“ چٹھی لکھ دی۔ شاید رات نہیں لے گئے آجائیں۔ یہ نو۔ ساتھ پیسے بھی بھیجے ہیں انہوں نے۔“

بیرو نے ہنسی اُڑائی۔

اور

گل بانو کو یوں لگا جیسے کسی نے پڑول چھڑ کر اسے دیا سلائی دکھا دی ہو۔ وہ ایک دم بھڑک اٹھی۔ اس کی غیرت تھلائی۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور نچھنے پھر کئے گئے۔ اس کی آنکھوں میں آگ نکل گئی۔

جیٹ کر اس نے پیسے پھینک دیے۔ خوشوار نظروں سے بیرو کو دیکھا اور شعلہ بدالیں ان پڑول کو گھوڑنے لگی۔

کیا آصف سے زیادہ اسے ان پیسوں کی ضرورت تھی۔

آصف نے بھکارن سمجھ کر خیرات اس کی جھولی میں ڈالی تھی۔
 جیو اس کے تیر دیکھ کر ڈر گئی۔ گل بانو کے غصے کا اسے پتہ تھا۔ لیکن ایسا غصہ تو اس نے
 آج پہلی بار دیکھا تھا۔
 اس نے کترا کر نکل جانے کو قدم اٹھایا۔

”ٹھہرو جیو۔“ گل بانو جلدی سے مڑی۔ ”تم ذرا بابا کے پاس ٹھہرو میں ابھی آتی ہوں۔“
 جیو کے کچھ کہنے سننے سے وہ آندھ سی کے ریلے کی طرح گھر سے نکل گئی۔

ہینک کی بیرونی دیواریں کچی تھیں۔ لیکن سامنے والا برآمدہ اور برآمدہ لاکھڑا تھا۔ یہ گاؤں
 دیواریں پرانے گاہ تھی۔ جب بھی مالکوں کو شکار یا کسی اور کام کے لیے گاؤں میں رات گزارنا
 پڑتا تو یہاں رہتے تھے۔ یہاں سولت اور آرام کی ہر چیز موجود تھی۔

برآمدہ کافی بڑا تھا۔ موٹے موٹے ستونوں پر چھت کڑی تھی۔ ستونوں کیساتھ
 دیواریں لپٹی تھیں۔ خرابی دروں میں بھی خوبصورت کلمے کڑے تھے۔ صحن کا قباب اور دیوار کے ساتھ
 اٹھ ایڑیاں تھیں۔ جن میں موسی پھول مسکرا رہے تھے۔

شام اترنے کو تھی۔ سورج کے سائے لائے ہوئے تھے۔ اس کی روشنی درختوں کی آخری
 شاخوں میں اٹکی تھی۔

خبرے کے اندر باہر کافی لوگ تھے۔ کام کاج سے فارغ ہو کر کسان اور محنت کش اور کارخ
 تھے۔ صحن میں چار پائیاں پڑی تھیں۔ کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ کھانسیوں کے پاس زمین پر ہی
 تھے۔ کچھ کھڑے تھے۔

یہی حال ہینک سے باہر تھا۔

لوگ مالک کی ٹیک نیچے تدر اور ذیانت کی باتیں کر رہے تھے۔ دو پارٹیوں کا برسوں پرانا جھگڑا
 ابھی اگلے دن ان میں مصالحت ہی نہیں دوستی بھی کروادی تھی۔

اور آج رات اسی خوشی میں دونوں پارٹیوں کی طرف سے مشترکہ دعوت تھی۔ مالک کو
 انہوں نے بعد صمت و انتظار روک لیا تھا۔ انہیں آج رات گاؤں ہی رہنا تھا۔

دو تین گھنٹے کی مسلسل مفر بہی کے بعد وہ ابھی ابھی اٹھ کر اندر گئے تھے۔ فشی خیر الدین نے
 انہوں کو قباب کرسیاں بھی اندر بچھا رکھی تھیں۔

گل بانو آندھ سی کے ریلے کی طرح صحن میں آئی۔ کئی مانوس اور غیر مانوس چہروں پر اس کی نظر
 انہوں کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔

”مالک کہاں ہیں۔“ اس نے کھردری لکڑی جیسے جسم والے فیشے سے پوچھا۔

”اندھ ہیں۔ کیوں کیا کیا ہے تجھے۔“ اس نے پوچھا۔ لیکن گل کو تاب انتظار کہاں تھی۔ تو مسکاتا ہوا آتش فشاں تھی۔ اپنے آستے دلوں کے بے انجام انتظار کا انتقام بھی اس سٹاکو میں شاہ تھا۔ چٹک اور بے عزتی بھی سواہن روح تھی۔ وہ تو مٹھی میں پکڑے پیسے آصف کے منہ پر دھارنے آئی تھی۔

”اے اے اے لڑکی۔“ خیرالدین کے روکنے سے پہلے ہی ”برآمدہ عبور کر گئی۔ برکے برآمدے کے درمیں کھڑی تھی اسے روکنے کو بڑھی۔

”مالک کا آرام کا وقت ہے۔ صبح سے کام۔“

گل بانو نے کچھ نہیں سنا۔ کئی آوازوں نے اس کا تعاقب کیا۔ کئی حیران آنکھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

کھٹاک

پیشاک

گل بانو نے دروازہ اس دور سے دھکیلا کہ کواڑ بج اٹھے۔ یوں جیسے آندھی آگئی ہو۔ طوفان امیزہ پڑا ہو۔

فرجاد کرسی پر نیم دراز تھا۔ وہ آج واقعی بہت تھک گیا تھا۔ کچھ دیر سستانے کی نیت سے کرسی میں آن کر تھا۔

دروازہ جو اس دشتیانہ انداز سے بجاتا فرجاد نے ایک دم گردن تھمرا کر دھکیلا دیکھا۔

اور

اور

اس کی نگاہیں دروازے میں کھڑے وجود میں الٹ گئیں۔

گل بانو آصف کی بجائے کئی اور کو کمرے میں دیکھ کر ہٹکی۔ کچھ گھبراہٹ اور اپنی وحشی ہرنی ایسی آنکھوں سے پورا کمرہ دیکھ ڈالا۔

فرجاد کرسی سے اٹھ کر اس کی طرف گیا۔ شوق بھری حیرانگی سے اسے دیکھا اور پھر مسکرا کر بولا۔ ”میں سمجھا تھا آندھی آگئی۔“

اس نے مفردت بھری نظروں سے فرجاد کو دیکھا۔ کتنی پچاری لگ رہی تھی وہ فرجاد کے جواں سینے میں دل الٹ پلٹ گیا۔

اس نے دروازے کے پڑوں پر گئے ہاتھ گرا دیے۔ اور مالوس سی ہو کر پلٹنے لگی۔

”کون ہو تم۔“ فرجاد نے بعد اشتیاق پوچھا۔

”گل بانو۔“ وہ سادگی سے ہاتھ مسلتے ہوئے بولی۔

”کس سے ملتا ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”مالک سے۔“ گل رو بانسی ہو گئی۔

فرجاد مسکرایا۔

”مالک تو تمہارے سامنے ہے۔“

”آپ۔ آپ مالک؟“

”ہاں۔ یقین نہیں؟“

گل بانو نے بیہوشی سے اسے دیکھا اور کچھ کہنے ہی کو تھی۔ کہ وہ بڑی نرمی سے بولا۔

”کیا بات ہے۔ کیا کہنا ہے۔ کوئی تکلیف؟ مجھے بتاؤ۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔“

”لیکن۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ کہاں ہے۔“ گل بانو نے پوچھا۔

”شاید تم آصف کا پوچھ رہی ہو۔“ فرجاد نے کہا۔

”ہاں۔“ وہ تنک کر بولی۔

”بہت غصے میں ہو۔ کیا بکا ڈا ہے اس بیچارے نے تمہارا۔“ فرجاد نے ذریعہ مسکراتے ہوئے کہا۔

”وہ کہاں گیا۔“ گل بانو مٹھی جھٹکتے ہوئے بولی۔

فرجاد نے سرپا شوق اسے دیکھا۔ آصف پر وہ برس پڑنے کو تھی۔ مابرا کیا تھا۔ اسے سمجھ نہ

آیا۔

”وہ زخمی ہے ان دنوں ہسپتال میں ہے۔“ فرجاد نے اس کے استفسار پر بتایا۔

گل بانو حیران ہو کر بولی۔ ”تو کیا وہ گاؤں نہیں آیا۔“

”نہیں۔“

”تو یہ پیسے۔“ اس نے ہراساں ہو کر مٹھی کھول دی۔ چند نوٹ اس کی ہتھیلی پر تھے۔

”میں جبر سے پوچھتی ہوں۔“ اس نے قدرے توقف کے بعد خود ہی کہا اور جانے کو مڑی۔

”مضمہ۔“ فرجاد نے کہا۔

”جی۔“ وہ نرم پڑ گئی۔

”یہ پیسے۔“ فرجاد نے یونہی بات بڑھائی۔

”جبرو نے لاکر دیئے تھے۔ کتنی تھی مالک نے بابا کے لیے دیئے ہیں۔ میرے بابا بہت بیمار ہیں

۱۔ ”وہ بھو بھون سے کتنی لگی۔“

اور ”معا“ فرجاد کو تلازم خیال دوپہر بھیری والے ٹیوب ویل کی طرف لے گیا۔ اپنی کپنی

جاتے ہوئے اس نے ایک لمحہ کو آنکھیں بند کیں اور پھر جلدی سے بولا۔

”آج کسی نے مجھے بتایا تھا۔ غالباً تمہارے بابا ہی کے متعلق۔ کیا نام ہے تمہارا۔“
 ”گل بانو۔“

”ہاں۔ بان۔ ٹھیک۔ تمہارے بابا سخت بیمار ہیں نا۔“
 ”ہاں۔“

”یہ پیسے میں نے بچھوائے تھے۔ کلاسک سالو کا آیا تھا میرے پاس ساتھ ہسپتال میں داخلے کی چٹی بھی تھی؟“
 ”ہاں۔“

”تو تم اسے جسے میں کیوں تھیں۔“
 ”جی۔ وہ۔ کچھ نہیں جانتی۔“

اس نے جس حسین انداز سے چٹیلی چٹیلی آنکھوں پر لائی لائی ٹکلیں اٹھائیں، جھپکائیں۔
 فرجاد دل تھا م کر رہ گیا۔
 ”اب جاؤں۔“ گل بانو فرجادی نگاہوں سے جھینپ گئی۔

”ستو۔“

”جی۔“

”کیا پیاری ہے تمہارے بابا کو۔“

”جی۔ پتہ نہیں۔“

”بھلا آتا ہے۔“

”ہاں جی۔“

”اور کوئی تکلیف۔“

”کھانسی بھی آتی ہے سینے میں درد بھی ہوتا ہے۔“

”کل ڈاکٹر صاحب گاؤں آ رہے ہیں۔ میں ان سے کہوں گا۔ تمہارے بابا کو دیکھ لیں۔“

”جی بہت اچھا۔“

”کہاں رہتی ہو۔“

”مدی پاراولی بستی میں۔“

”صبح آجانا۔ ڈاکٹر صاحب تمہارے ساتھ چلے جائیں گے۔“

”اچھا جی۔“

”ضرورت پڑی تو ہسپتال داخل کروادیں گے۔ نہیں تو گھر پہ علاج ہو گا۔ تم فکر نہ کرو۔“

بالکل ٹھیک ہو جائیں گے تمہارے بابا۔“

گل بانو کی آنکھیں احسان مندی سے بھر آئیں۔ اس نے دو پٹے کے کونے سے آنکھوں کے اٹھ پٹے۔ اور ہونٹوں کے سرے چبائے ہوئے آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

”روؤ نہیں۔ صبح ڈاکٹر صاحب دیکھ لیں گے۔ مکمل علاج ہو گا۔ تو بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔“
 ”یہ فرجادی ہمدردی یا کروٹے لگی۔ فرجاد اسے تسلی و تسکین دینے لگا۔“

”تمہارے بابا کرتے کیا ہیں۔“ قدرے توقف کے بعد فرجاد نے پوچھا۔ گل بانو بابا کی چھوٹی دکان چلاتے ہوئے بہت کچھ جانتے لگی۔ اپنے چھان پاپ اور پنجالی ہاں کا حوالہ بھی دے دیا۔ بابا لالہ پہلی اردو کا بتاتے ہوئے وہ خود بھی مسکرا دی۔

فرجادی ہمدردی کے سہارے وہ باتیں کیے جارہی تھی۔ کچھ من میں بھی خوشیوں کے طوفان۔
 ”علمائے کات کا احساس بڑا جاندار تھا۔ وہ بے دھڑک باتیں کر رہی تھی۔“

اور فرجاد بت بنا ٹکلیں جھپکائے بغیر اسے گلے جارہا تھا۔

فرباد نے ان لوگوں کے لیے ڈپنری قائم کرنے اور ایک ڈاکٹری پورے طور خدمات حاصل

ماٹھے میں رنگا رنگ چیزیں لاکر کیا تھا۔ کوئی دودھ لایا تھا کوئی لسی، کسی نے انڈے لپائے تھے کوئی اٹھٹ بنا کر لایا تھا۔ سنہری کدوم کے خالص آنے اور دہی گھی میں تلے پرائے تھے۔ سفید سفید لہسن کا پیالہ بھرا تھا۔

شیدے نے ساری چیزیں میز پر بچا رکھی تھیں۔

فرجاد بول دیا۔ ”اچی چیزیں۔“

شیدے نے چیزیں لانے والوں کے نام گونانا شروع کر دیے۔

”بس بس بھی۔ قبول کیا سب کا خلوص۔ اب یہ چیزیں اٹھاؤ اور ان لوگوں میں بانٹ دو۔“ انہیں ایسی چیزیں کبھی نصیب ہی نہیں ہوئیں۔
”آپ ناشتہ کر لیں پہلے۔“

فرجاد نے پلیٹ میں تھوڑا سا انڈا اور دوچار پراٹھا لیا۔ بس بھی۔ ہاں جائے پیوں گا۔ اچھی سی بالاد۔“

شیرا اقبل حکم کے لیے فوراً چل دیا۔

ناشتے کے بعد فرجاد نے لوگوں سے ملنا تھا۔

آدھ گھنٹے کے اندر وہ تیار ہو گیا۔ آج ڈاکٹر نے بھی شمرے آنا تھا۔ فرجاد اسے ہر مریض کے پاس خود لے جانا چاہتا تھا۔

شاید یہ فیصلہ گل باتوں تک پہنچنے کی گھن کا لا شعوری عمل تھا۔

اس گاؤں کے تقریباً چار مریضوں کو کھربہ دیکھ کر ڈاکٹر عراور فرجاد ہینکل کی طرف آ گئے۔ وہاں انہیں کبھی بیمار یوں کے لیے لوگوں کو بیٹس آنے کا کہا گیا تھا۔

وہ دونوں محض میں داخل ہوئے۔

تو گل باتوں کی منتظر کھڑی تھی۔ عراول در کے نیچے جھک آئے والی میلوں کے درمیان کھڑی وہ نرم شدہ تصویر لگ رہی تھی۔ وہ اس خوبصورتی سے کھڑی تھی کہ فرجاد کو لگا جیسے کوئی کھاگ سی لال لال درمیان کی دوشیرہ کاروپ دھارے تصویر بنو۔ نے کھڑی ہو۔

انہیں دیکھتے ہی وہ ان کی طرف آئی۔

”سلام مالک۔“ اس نے سرقدروں جھکاتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔

”ڈاکٹر صاحب کو بھی سلام کرو۔“ فرجاد نے سرور سکر اٹھ سے کہا۔ ڈاکٹر عراور سکر اٹھ۔

گل باتوں نے گھبرا کر ہاتھ پر رکھ دیا۔

”اس کے بیلا بیلا ہیں۔“ فرجاد نے ڈاکٹر عمر سے کہا۔ ”میرے خیال میں پہلے انہیں چل کر لے لیں۔“

کرنے کی سیکم بھی نہ تھی۔

مذہبی تعلیم کے لیے مساجد میں اہتمام کرنے کا بھی سوچا۔

فرجاد ان لوگوں کو دیکھتا تو یوں لگتا جیسے سب انسان نما جانور ہیں۔ اپنے انسانی حقوق سے بلند۔ عیشوں کی طرح کام کرنے والے یہ لوگ ہمدردی کے مستحق تھے۔

سارے پلان اس کے ذہن میں تھے۔ وہ سب کچھ کرنا چاہتا تھا۔ جو بھی سیکم بنائی جو منصوبہ تیار کیا۔ وہ آصف کے لیے تھا۔ گاؤں میں روز آنا۔ یا راتیں یہاں بسر کرنا اسے اب چاہیہ تھا۔ وہ روز آصف سے کہتا۔

”اللہ کرے تم جلد ٹھیک ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو۔ میں تمہارے حصے کے فرائض انجام دیتا۔ کسی وقت انکار ہی کر نہیںوں۔“

لیکن

گل باتوں کو دیکھنے کے بعد اس کی گایا ہی پلٹ گئی تھی۔ گاؤں جو اسے ہمیشہ سے نا پسند تھے ارضی بنیادوں کا روپ دھار گئے تھے۔

اب تو وہ شاید چاہتا بھی تو ان ارضی بنیادوں سے اپنے آپ کو دور نہ رکھ سکتا تھا۔

خلاف معمول وہ دست و پیر اچھا بیٹھا۔ بیرونی دروازے کے قریب نشی خیر الدین ابھی ہو تھا۔ اور بھلا سگی چارپائی پر شیرا بھی خڑا لے رہا تھا۔

فرجاد ہینکل سے باہر نکلا۔ اور دھبے قدموں سے باہر نکل گیا۔

اکتوبر کی کھری ہوئی گلابی صبح گل باتوں کی طرح حسین تھی۔

بلکی بلکی ہینکل کا جھنڈک جانفزا تھی۔ شہتی افق پر سپیدہ سحر کی نمود تھی۔ ٹیور پرندوں۔ چڑچڑاہٹے ہوئے نکل گئے تھے۔ بھیتوں میں دھان کی چچی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اکاڈک لوگ اور گھم گھم میں بیدار ہو رہے تھے۔

فرجاد بڑا مستعدی چلا جا رہا تھا۔ تازہ ہوا سمرے گھرے سانپوں سے اپنے اندر اتارنا فرد بخش مشغلہ تھا۔

وہ ندی کی جانب نکل گیا۔ پکا پکا اجلا سیال چاندنی پر پھیل رہا تھا۔ جو جھل ہوا میں نرم آن تھیں۔ گھنیرے درختوں میں پرندوں کی پھر پھر انہیں مترنم لگ رہی تھیں۔ ہر طرف انہی مچھ محسوس ہو رہی تھی۔

وہ کھڑی کے قریب ہی چڑھائی کے برابر کو تکتا رہا۔ پل مرست طلب تھا۔ فرجاد نے حکوم سے رابطہ قائم کر کے اس پل کی تعمیر کا وہیں کھڑے کھڑے سوچا۔

سورج اچھا خاصا ابھر آیا تھا۔ جب فرجاد وہاں لوٹا۔ رساتیوں نے اپنے خلوص کا مہل

”جیلنے“ ڈاکٹر شیشو کو سچا ہاتھ میں جھلاتے ہوئے بولا۔

”آؤ کل بائو“ اپنے گھر کا راستہ بتا رہے تھے۔ فرجاد نے کہا۔ شیدے اٹھالے یہ ڈاکٹر صاحب کا دوا کی بس۔“

کل بائو آگے آگے چل دی۔

ڈاکٹر عمر اور فرجاد پیچھے پیچھے تھے۔ دونوں گاؤں کی زندگی۔ لوگوں کی حالت زار جہالت اور قوتہات کی باتیں کر رہے تھے۔

انہوں نے کچی گلیاں عبور کر کے کھیتوں کا فاصلہ طے کر کے ندی کا پل عبور کیا۔ اور پھر اس بستی کے آخری سرے تک جا پہنچے۔ کل بائو کا گھر الگ تھلگ تھا۔ ہڈاٹ کے اعتبار سے بھی کچا مختلف تھا۔ میدان کی علاقے میں سرحدی گاؤں کا سا یہ مٹی کی اونچی دیوار والا قلعہ نما چھوٹا سا گھر تھا۔ کل بائو اندر داخل ہوئی۔ اور درخت میں پائی روایتی خندہ پیشانی سے آنے والوں کو خوش آمدید کہا۔

ڈاکٹر عمر اور فرجاد نے چھوٹے سے گھر پر اچھتی سی نگاہ ڈالی۔ دھوئیں سے کافی چھت والا چھوٹا سا برآمدہ اس کے پیچھے ایک دروازے والا بند کمرہ۔ یہ کل کا نکات تھی۔

بابا برآمدے میں پرے سے بان کے موٹے پایوں والے پلنگ پر گھڑائے کے سارے لیٹا تھا۔ بڑا صاف تھا۔ اور وہ بستی کی نیلی سے ڈھکی کی پیالی میں قوتہ بی رہا تھا۔ کونے کے چولے پر کالا سلون چائے جوش رکھا تھا۔ جس میں پانی کھل رہا تھا۔ طاق میں چیک اپوریا لیاں پڑی تھیں۔ کمرے کا حصہ نظر آ رہا تھا۔ وہ بوسیدہ سے ٹاٹ سے ڈھکا تھا۔ اور سامنے والی دیوار کے ساتھ گداڑال کراس پر گھڑائے رکھے ہوئے تھے۔ نظر آنے والی کچی دیوار پر بابا کا چری پرانے کیس میں طمچہ بھی لٹک رہا تھا۔

”یوں لگتا ہے جیسے لڑی کوئل کے کسی گھر میں آگے ہیں۔“ ڈاکٹر عمر نے فرجاد سے کہا۔

”یہ لوگ پشچان ہیں۔“

”جیسی۔“

بابا نے آنے والوں کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی۔ فرجاد اسے تو نہیں جانتا تھا۔ لیکن عالی نور محمد کے صاحبزادے کو بابا بہت اچھی طرح سے جانتا تھا۔ ٹیک سلیک تپاک سے ہوئی۔

کل بائو نے ہماری سی چار پائی برآمدے کے قریب گھنٹ کران کے لیے بیٹھنے کی جگہ کر دی۔ احوال پر سی کا رسمی سلسلہ شروع ہو گیا۔

پھر بابا نے معائنہ ڈاکٹر عمر نے پوری طرح کیا۔ چھاتی دیکھی۔ سانس کا زرموہم۔ نبض آنکھیں

۱۸ سب دیکھے۔ کئی سوال پوچھے۔ پھر تھوہا میز لگا کر بخار دیکھا۔ فرجاد اس دوران چار پائی پر بیٹھا اپنی خیاں میں کھویا رہا۔ کل بائو کے رنگین آنکھوں میں لہراتے رہے۔

ڈاکٹر عمر فرجاد سے انگریزی میں باتیں کرنے لگا۔ انکسے ضروری تھا۔ دائیں پیچھے ہڑے میں بونٹس معلوم ہو تا تھا۔ لیکن حقیقی فیصلہ انکسے کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔

کل انہیں شہر لے جائیں گے۔ انکسے بھی ہو جائے گا۔ خون اور تھوک بھی ٹٹ کر لیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں اپنی گاڑی میں انہیں لے آؤں گا۔“

”ان دو مریضوں کو بھی شہر لانا ہے۔ تینوں کو ساتھ ہی لے آئیے گا۔“

”بہتر۔“

کل بائو دونوں کے قریب آکر کھڑی ہو گئی اور بے تابی سے پوچھا۔ ”میرے بابا اچھے ہو جائیں گے۔“

”بالکل۔ بالکل۔“ ڈاکٹر نے تسلی دی۔ ”تقولیں والی کوئی بات نہیں۔ کل انہیں ہسپتال لے جائیں گے۔ پوری تسلی سے معائنہ کریں گے۔“

”ہسپتال۔“

”ہاں ہاں۔ صرف معاملے کے لیے۔ علاج گھر ہی ہو جائے گا۔ فکر نہ کرو۔“

بابا ڈاکٹر اور فرجاد سے باتیں کرتا رہا۔ کل بائو نیلی پھولدار پالیوں میں قوتہ بنا لائی۔

”اے جیسی اس کی کیا ضرورت تھی۔“ ڈاکٹر نے کٹھ سے کہا۔

”لے لیں۔“ فرجاد نے لکھنی سے اپنی پیالی لیے ہوئے سسکرایا۔ کل بائو کے ہاتھوں کا بنا قوتہ ان کے ہزار رنگ ہے تھا۔

بابا جامدیدہ انسان تھا۔ محبت کے عملی دور سے گزر چکا تھا۔ صداقتوں کی پرکھ کر سکتا تھا۔ انہوں کے اسرار پر رموز جانتا تھا۔ جذبول کے اظہار سے آگاہی تھی۔ ہاتھوں کے دوران وہ فرجاد کو اپنا ڈاؤیوں سے پرکھتا رہا۔

”آپ تیار ہیں نا۔“

بابا نے سر ہلایا۔

”میں نے صبح صبح ہی تیار کر دیا تھا بابا کو۔“ گل بانو بولی۔ اور پھر بے تکلفی سے بولی۔ ”چائے“

”نہیں شکریہ۔“

”غریبوں پر اپنی کرم نوازی کی ہے مالک تو چائے کا ایک کپ بھی نوش کر لیں۔“

بابا نے عاجزانہ کنبے میں کہا۔

”نہیں بابا۔ پھر کسی دن لیو لیو گا۔ اس وقت تو سر جانا ہے۔ دو مریض اور بھی گاڑی میں بیٹھے ہیں۔ آپ تیار ہیں۔ آئیے۔“

گل بانو کنبے کے قریب پلنگ پر دو زانو ہو گئی۔ بابا کی پشت کو بازو کا سارا دیا۔ فرجاد نے جھک کر بابا کو کندھوں سے قدام لیا۔

فرجاد کے ہاتھ گل بانو کے بدن کو چھو گئے۔ اس کے بالوں کی آوارہ لٹیں فرجاد کی کلائیوں پر بھر گئیں۔

ایک لمحہ کو فرجاد کو یوں لگا جیسے وہ کسی جادو کے اثر سے پتھر کا گیا ہے۔ اس کا سانس رک گیا۔ اور دل کی دھڑکن ٹھہم گئی۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

بابا نے خودی بہت کی گل بانو کے سمارے پلنگ سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔

فرجاد نے اپنا بازو پیش کیا۔ بابا اس پر اپنا بوجھ ڈال کر قدم قدم چلنے لگا۔ گل بانو ساتھ ساتھ تھی۔ فرجاد کے جذبات و احساسات سے بالکل بے خبر۔

بابا کو فرنٹ سیٹ پر فرجاد نے بڑے آرام سے بٹھایا۔ ”ٹھیک۔“

”ہاں جی۔“ بابا گردو پیش کر کے لوگوں پر اک نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

”آپ بھی۔“ فرجاد نے پچھلی سیٹ پر بیدم سے پڑے دونوں مریضوں سے پوچھا۔

”جیوا مالک۔ سدا خوش رہو۔“ نجیف سی آواز دونوں کے لبوں سے نکلی۔ فرجاد اپنی سیٹ پر

اُن بیٹھا۔

”میں بھی چلوں بابا۔“ گل بانو نے فرجاد کو نظر انداز کرتے ہوئے بابا سے کہا۔

”تم کیا کرو گی۔“ فرجاد نے جواب دیا۔

”نہ جاؤں۔؟“ اس نے سادگی سے کہا۔

”اوں ہوں۔“ فرجاد کھانکھانک نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے گاڑی چلانے کو تیار ہوا۔ گل بانو

کی نگاہوں میں احترام تھا۔

گل بانو نے تڑکے اٹھ کر گھر کی صفائی کی۔ ہر چیز قریب سے رکھی مچھن میں پانی چھڑکا بھاندا دیا۔ برتن مانجھ مانجھ کر چکائے۔ اور بابا کا بستر لدا۔ اسے ملیٹنے کے دھلے ہوئے کپڑے پہننے کو دیئے۔ دیوار سے لٹکا کادھ لٹکی اٹار لائی۔ پشاور کی چیل پکڑے سے رگڑ رگڑ کر صاف کیے۔

بابا نے انکسے کے لیے ہسپتال جانا تھا۔ مالک کی موٹریں۔ گل بانو نے سارا اہتمام مالک ہی کے لیے کیا تھا۔ پتلے پتلے کپڑوں میں بابا شہر توڑ جاسکتا تھا۔

آٹھ سارے آٹھ کے قریب فرجاد بابا کو لینے گیا۔ بستی کے اس حصے میں گاڑی کا آنا اک عجوبہ تھا۔ بچے بوڑھے عورتیں گھروں سے نکل آئیں۔ گاڑی میں دو اور مریض نہ ہوتے تو شاید گل بانو کے گھر مالک کا گاڑی لے کر آنا اک موضوع بن جاتا۔ لیکن اب تو مالک کی رحمتی ہمدردی اور خلوص کے ہر زبان پر چرے تھے۔

فرجاد کے گاڑی سے باہر آنے سے پہلے ہی گل بانو دروازے میں آن کھڑی ہوئی۔

”مالک سلام۔“ اس نے تعظیم سے سر قردارے جھکاتے ہوئے کہا۔

سوئی سوئی سے زد پئے اور چیخند کے کپڑوں میں بھی گل بانو کوئی آفاقی خلیق لگ رہی تھی۔ اس کے لائے سیاہ بال کھلے تھے۔ کام سے فارغ ہو کر نہائی تھی۔ بال مسکنے کے لیے پشت پر کھلے چھوڑ دیئے تھے۔ وہ فرجاد کو دیکھ کر خوش آمدید ہی انداز میں مسکرائی۔

”بابا کیا حال ہے گل بانو۔“ فرجاد نے مچھن میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ویسے ہی ہیں۔“ گل بانو جلدی سے بولی۔ ”کچھ ٹھیک بھی ہیں۔“

اس نے نکلی اور اثبات میں تھکرا اس معصوم انداز سے کہ فرجاد ول قدام کر رہ گیا۔

”ویسے ہی ہیں کچھ ٹھیک بھی ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے زب لب کہا۔

گل بانو ہنس پڑی۔ بڑی سادگی سے، بڑے انہیزن سے بڑی بے تکلفی سے۔ فرجاد نے مسکرا کر اسے سر تکیا دیکھا۔ اور پھر قدم بڑھا کر بابا کے پلنگ کی طرف گیا۔

بڑی محبت اور ادبیت سے اس کی احوال پرسی کی۔

لوگوں نے مالک کو عقیدت سے دیکھا۔ کسی نے جبکہ کر کسی نے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اور کسی نے بلند آواز میں سلام کیا۔

”گھبرانا نہیں۔“ فرجاد سلاموں کا جواب دے کر گل بانو سے بولا۔ ”شاید وہاں کچھ دیر لگ جائے۔“

”بابا واپس آئیں گے نا۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ وہاں صرف معائنہ ہو گا۔ علاج انشاء اللہ گھر پہنچی ہو گا۔“

گل بانو عقیدت سے فرجاد کو دیکھنے لگی۔

گاڑی چلی گئی۔ گل بانو کچھ دیر وہیں لوگوں میں گھری کھڑی رہی۔ کوئی اسے تسلی دے رہا تھا۔ کوئی مالک کے کمن گارہا تھا۔ گل بانو کا بچی بھر بھر رہا تھا۔

جب وہ اسے لے کر اندر آگئی۔ بابا کے ہلکے پر دونوں بیٹھ گئیں۔ جب وہ اس کو تسلی دے تھیں دینے لگی۔

مالک کے ذکر سے آصف کا ذکر ہونے لگا۔ دونوں اس غلط فہمی پر دیر تک مسکراتی رہیں۔ جو مالک کے نام پر گل بانو کو ہوئی تھی۔

”اس دن ناراض ہوئے گئی تھیں مجھ پر۔“ جبرو بولی۔ ”اس دن بھائی کو میں نہ سمجھتی تو اللہ جانے تو اور کتنے دن جلتی کر تھی رہتی۔“

”ہاں جبرو۔ تو واقعی مبتلا تھی۔ تمہاری وجہ سے بابا کا علاج ممکن ہوا ہے۔ اور تمہاری ہی وجہ سے میں غلط فہمی کے پکڑے لگتی ہوں۔ اللہ کرے آصف بالکل ٹھیک ہو جائے۔“

”تاہم وہ ہسپتال سے گھر آگئے ہیں۔“

”کس نے کہا۔“

”جس نے بھی۔ پر ہے صبح خیر۔“

”شاید۔“

”شاید نہیں۔ ٹھیک بات ہے۔ بتا آج تک چھٹی خبریں تجھ میں کس نے پہنچائیں۔ کیا وہ غلط تھیں۔“

”تو! اچھی ہے جبرو۔ گل بانو اس سے پرست گئی۔“

پھر دونوں دیر تک اپنے اپنے دکھ سکھ کی باتیں کرتی رہیں۔

شام بابا فرجاد کے کندھے پر اپنا پورا بوجھ ڈالے گھبرا گیا۔ خاصی تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ ہانپ بھی رہا تھا۔ گل بانو نے اس کا ہنسر دست کیا اور مونی سوئی چادر اس پر ڈال کر کندھے دبانے لگی۔

فرجاد نے دوائی کی شیشی اور گولیاں لا کر گل بانو کو دیں۔ جس طرح دوائی دیتا تھی۔ وہ بھی بولیا۔

”تشخیص والی کوئی بات نہیں۔ علاج مکمل طور پر ہو گا۔ تو بابا ٹھیک ہو جائیں گے۔“

بابا شکر گزار نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”کل سے رخصت ہو کر آپ کے لیے دوائی اور پھل لایا کرے گا۔ خوراک کا خاص خیال رکھنا ہو گا۔“

”دوسری آپ بالکل ٹھیک کریں۔ میرے پاس کچھ ہے آپ لوگوں ہی کا ہے۔“

بابا کی آنکھیں انھار انگڑے دھندلائیں۔ اور اس کی دیکھا دیکھی گل بانو کی فٹوں خیر آئیں بھی بھر آئیں۔

”آپ کتنے اچھے ہیں مالک۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”ہمارے لیے تو آپ فرشتہ ہیں۔“

فرجاد ہنس دیا۔ ”یہ میرا فرض ہے گل بانو۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ کوئی بڑی بات نہیں کی میں نے۔“

”آپ کے لیے چائے بناؤں۔“ گل بانو مہمان نواز تھی۔

”نہیں۔ چائے ہم نے حویلی میں پی تھی۔“ فرجاد بولا۔

گل بانو نے ایک نظر اسے اور ایک نظر بابا کو دیکھا۔

”مالک مجھے حویلی لے گئے تھے گل۔ دوسرے وہاں ہی گزارا۔“

”جھا۔“ گل بولی۔

فرجاد نے جانے کی اجازت چاہی۔ تو گل اسے دروازے تک چھوڑنے آئی۔

”بہت بہت اچھے ہیں مالک۔ بہت ہی اچھے۔“ گل بانو نے عقیدت و احترام سے کہا۔

”واقعی؟“ فرجاد مسکرایا۔

”ہاں۔“ وہ سادگی سے بولی۔

”شکریہ۔“ فرجاد نے ایک نگاہ بیہ باس پر ڈالی اور مسکراتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ وہ یں پہنچے نشے میں ڈول گیا۔ گل بانو نے اسے زندگی کی سب سے بڑی خوشی دے دی تھی۔

اور اس نگاہ کی حدت سے گل بانو کچھ گھبرا سی گئی۔ لیکن فرشتوں کی نیت پر شک کرنا بہت برا نگاہ ہوتا ہے۔ فرشتے تو ہوتے ہی معصوم پاک اور نیک ہیں۔

سر کو جبکہ کر گل بانو نے لاشعور میں سر اٹھارنے والی گھبراہٹ کو جھٹکا۔ اور واپس پلٹ آئی۔

بابا سے شہر جانے کی رونمائی دہانے کے لیے وہ اس کے قریب ہی ہلنگ پر بیٹھ گئی۔

”جب تک زخم بالکل مندمل نہ ہو جائے۔ تمہیں کام نہیں کرنے دوں گا۔“

”تمہاری صحت بالی کا جشن ہو گا۔ پھر اجازت لے لی گاؤں جانے کی۔“

”فصل کی پرواہ نہ کرو۔ کچھ نہ کچھ بھجے آئی جائے گی۔ تمہاری صحت بالی کی خوشی میں دھان لی آوھی فصل غریب رعایتوں میں تقسیم ہو گی میرے دوست۔“

فرجاد کا خلوص اسے مرعوب کر دیتا اور وہ مہر کر کے رہ جاتا۔ چند دن کی تو بات تھی۔ پھر اسے بھانسی جانا تھا۔ جبر کی گھڑیوں سے وہ ملن کی خوشیوں کا اندازہ کر کے دل کو تفتی دے لیتا۔

فرجاد کی مصروفیات حیران کن تھیں۔ حویلی میں بسنے والے لوگ۔ اس کی بوڑھی اماں۔ اس کے دوست احباب دن رات یہی تذکرہ کرتے تھے۔

”کہاں تو گاؤں کا نام نہ لیتا تھا۔ کہاں کئی دن شکل ہی نہیں دکھاتا۔ انہی لوگوں میں گھرا رہتا ہے۔“

”لوگ بڑی تعریفیں کرتے ہیں۔“

”ان کے لیے بڑے بڑے منصوبے بنائے ہیں فرجاد نے۔“

”سکول اور ڈپنری کھولنے کا ارادہ ہے۔“

یہ باتیں تعریف و توصیف کا پہلو لیے ہو تھیں۔ لیکن کچھ لوگ دے دے لفظوں میں مخالفت بھی کر رہے تھے۔

”فرجاد کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“

”یہ لوگ جس مقام پر ہیں انہیں دہیں رہنا چاہیے۔“

”دولت برپا کر رہا ہے۔“

”کوئی چھوٹا بڑا سر ہے نہیں۔ سو بھجائے۔“

یہی باتیں آصف کے ذہن میں بھی تھیں۔ رشتے کے بچے ”ماموں“ خالواسے نئی نئی خبریں لا کر لاتے تھے۔ فرجاد کی سرگرمیاں مستحسن تھیں لیکن حامد لوگ گل بھی تو جاتے ہیں۔

اس دن آصف بیوی پانی میں بیٹھا تھا۔ فرجاد بھی آج جلدی لوٹ آیا تھا۔ دونوں نے چائے پی لی تھی۔ کچھ دیر تھیں اور جبری کے ساتھ تاش بھی چلی تھی۔ لیکن فرجاد نے آٹا کر پتے پھینک دیے تھے۔

”مجھے ڈاکٹر عمر سے ملنا ہے۔“ اس نے کرسی میں پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“ آصف بولا۔

”ان کے تین مریض میری نگرانی میں ہیں۔“

”تم کیا کرتے ہو۔“

(بعض اوقات لمحوں کا عمل طعنائی ہوتا ہے۔ کات کھانے والے لمبے ایک ایک شفتوں کا روپ دھار لیتے ہیں اور کوفت دینے والی گھڑیوں خوشی و افسانہ کی مناسم ہو جاتی ہیں)

فرجاد اپنے تئیں دوساتوں کے بایوں کے لیے بہت کچھ کر رہا تھا۔ سکول ڈپنری اور دیگر اصلاحی کام اس کے منصوبے میں شامل تھے۔ یہ سب کچھ وہ وقتی جذبے سے مرعوب ہو کر کر رہا تھا۔ لوگوں کی حالت زار۔ ان کی انتہج محنت۔ ان کی شفتوں کا پرانے نام صلہ۔ ان کی جنالت۔ قدامت پسندی۔ توہم پرستی دیکھ کر اس نے لمبا چوڑا پروگرام بنایا۔ لیکن یہ سب کچھ وہ اک مشین کی طرح کر رہا تھا۔ یہ سارے پروگرام چلان اور منصوبے اس نے آصف کی زیر سرپرستی کروائے تھے۔ اسے گائیڈ کرنا تھا۔ لیکن اب انھوں نے روپ بدل لیا تھا۔ گھڑیاں کسی اور ہی سانچے میں ڈھل گئی تھیں۔ گاؤں اسے ارضی جتنیں لگنے گئی تھیں۔ ارضی جتنیں جہاں گل بانو تھیں جو رستی تھی۔

اس کی دلچسپیاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ بڑی لگن سے وہ لمحوں کے دکھ باٹنے لگا تھا۔ اور وہ کام جو اس نے آصف کے ذمہ سونپ کر اپنے آپ کو بکدوش کر لیا تھا اب خود کرنے کی ٹھنڈی تھی۔ گل بانو کی لگن نے اس کی شخصیت کے بڑے بڑے پتے کھول دیئے تھے۔ دوسروں کے لیے جینا ان کے کام آتا اور اس سے بچی خوشی و سکون حاصل کرنے کا کڑا سیکھ لیا تھا۔

آصف اب رو بہ صحت تھا۔ زخم کی ڈرنیک گھر ہی ہوئی تھی۔ پاؤں کی سوج بھی ٹھیک تھی۔ وہ بہت جلد گاؤں جانا چاہتا تھا۔ گل بانو کی نشش کشج رہی تھی۔ باؤں کی لڑکی کا جانے کیا حال ہو گا؟ وہ سوج سوج کر پریشان ہوئے لگتا۔

فرجاد سے کھل کر کہہ تو نہ سکتا تھا۔ جانے کیوں جب تک ہی محسوس ہوتی تھی۔ وہاں وہ کام کام کی رٹ لگائے رہتا۔

اور فرجاد بہت پیار سے اس کو آرام کرنے کا مشورہ دیتا۔

”مجھ پر اعتماد کرو آصف۔ بڑی خوش اسلوبی سے سارا کام چلا رہا ہوں۔“

”میں۔ میں انہیں ہر روز دیکھتے جاتا ہوں۔ احوال پر سی کرتا ہوں۔ دواہلی دیکھتا ہوں کہ وہ کھانے پر دی گئی یا نہیں۔ ان کے لیے ابھی خوراک میا کرتا ہوں۔ اور کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر بات چیت کر کے انہیں ذہنی طور پر تیاری کا مقابلہ کرنے کی تربیت دیتا ہوں۔“

آصف متاثر و مرعوب ہو کر اسے گھٹنے لگا۔

”یار بڑا سکون ملتا ہے ان کاموں میں بہت لطف آتا ہے۔“

”خوشی کی بات ہے۔ جو تم بھی یوں دلچسپی لینے لگے۔“

”آپ کی اطلاع کے لیے عرض کروں۔ کہ تینوں دیہاتوں میں اسی مہینے سکول مکمل جانچ گئے۔ مرکزی دیہات میں ڈسپنری ہو گئی۔ جہاں ڈاکٹر صلاح الدین چوہیں گھنٹے رہا کریں گے۔“

”بہت خوشی ہوئی۔ ڈاکٹر صلاح الدین سے بات ملے کر لی۔“

”ہاں۔ ان سب چیزوں کا خرچہ مابودست برداشت کریں گے۔ تمہاری جمع کی ہوئی ہے انہماں دولت یوں ملے گی۔“

فرجانی نے خوشی سے آنکھیں نہچائے ہوئے آصف کو چھیڑا۔

”ٹیک کاموں میں صرف ہونے والا پیسہ ضائع نہیں ہوتا فرجانی۔“

”اوہ شاہاش۔ تم بھی میرے حامی ہوتا۔“

”بالکل۔ اور شاید یہی کچھ میں بھی کرنا چاہتا تھا۔“

”کیا کیوں نہیں تھا اب تک۔“

”تمہاری تائید و حمایت کی ضرورت تھی۔“

”تو تامل کیوں تھا؟“

”تمہارے رویے کی وجہ سے۔ گاؤں کے نام ہی سے بربک جایا کرتے تھے۔ دیہاتوں سے بات کرنا خلافِ شان سمجھتے تھے۔ میں تو حیران ہوں۔ یہ ایسا ایسا تبدیلی تم میں آئیے گی۔“

”اللہ کی رحمت کا پتہ تو ہوا ہی ہوتا ہے۔ کب نازل ہو جائے۔“ فرجانی نے ہنس کر کہا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کی خوبصورت سیاہ آنکھوں میں سنہری خواہوں کی پرچھائیاں رقصاں تھیں۔

دو دنوں کچھ دیر دیہاتوں ہی کی حالت زار ان کے محدود وسائل اور جانوروں ایسی زندگی کی باتیں کرتے رہے۔

دیہات سدھار دو دنوں ہی کا مشن تھا۔ ایک ہی بات پر دو دنوں متفق تھے۔ انسان بڑا گھبراہٹ ہے۔ بڑے بڑے ذخائر سمندروں سے بھی گھبراہٹ اس کی سطح سے کبھی بھی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ کہ اس کے اندر کیا ہے۔

دو دنوں گاؤں کے لوگوں سے ہمدردی جتا رہے تھے۔

بنیادی گنگن دونوں کی ایک ہی تھی۔
جن ہواؤں میں گل سانس لیتی تھی۔
جن فضاؤں سے اس کا تعلق تھا۔

اور

جس دھرتی پر وہ قدم رکھتی تھی۔

دونوں اس کی کشش سے بچنے جا رہے تھے۔

لبی چوڑی باتوں کے بعد فرجانی نے انگڑائی لی۔ اور اٹھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے ڈاکٹر عمر سے داری ملتا ہے۔“

”میرا پروردگار غلو ظلمی بھی لیتے آتا۔“ آصف نے خوشی سے فرجانی کو دیکھا۔

”جشن کے بعد۔ ابھی خولنے کے اندر ہی گھوم پھرو۔“ فرجانی بھی مسکرایا۔

”دل آتا جاتا ہے۔“ آصف نے کہا۔

”کوئی خفشل ڈھونڈ لو۔ دل بالکل نہیں آتا ہے گا۔“ فرجانی نے شریر نظروں سے اسے دیکھا۔

”خفشل؟“ آصف اس کی شریر نظروں کی زبان نہ سمجھ سکا۔

”ہاں بھئی۔ سنا ہے آج کل فوڈی تمہاری دیکھ بھال بڑی گنگن سے کر رہی ہے۔“

”شریر کہیں کے۔“ آصف آرام کر سی پر پھیل کر مسکرا دیا۔

”کوئی بات نہیں۔ اچھا خفشل ہے۔ سنجیدہ ہو جاؤ تو بڑا دھڑک کہہ دینا۔ میں تمہارے کام

اوں گا۔ چٹ مگنی پٹ بنیاد۔“ فرجانی کھٹکھٹا کر ہنس پڑا۔

آصف کی نگاہوں میں گل بانو کا بیکہ ڈول گیا۔ ہنس کر بولا۔ ”میرے لیے فوڈی ہی رہ گئی ہے۔“

”شراکتہ سعیدیہ“ قصیدہ ناہید۔ جس طرف اشارہ کرو گے۔“ فرجانی نے کہا۔ وہ خوشی کے مژدہ میں تھا۔

”سب اچھی لڑکیاں ہیں۔ اپنی بات کہتے۔ بڑے بھائی کی حیثیت سے پوچھ رہا ہوں۔“

فرجانی کچھ کہنے ہی کو تھا کہ ملازم آیا۔ آصف کے کچھ دوست آئے تھے۔

”میں نے آؤ انہیں۔“ آصف نے ملازم سے کہا۔

فرجانی اپنے کام کے لیے جاں بول۔

ہاں راست تھے۔ سبزہ تھا۔ بڑے بڑے پتھر تھے۔ اور کچھ دور ندی خالص زور و شور سے بہہ رہی تھی۔ بارش سے ندی کے کنارے چمک آئے تھے۔ گل بانو دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی آگئی۔ اس نے پھونٹ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اور موٹی سی لال نیلے پھولوں والی چادر سر سے پیچھے کی طرف ڈال دی تھی۔ آصف کو اس کا پاڑی و شیرہ کالا پس پسند تھا۔ شاید اسی لیے اس نے یہ کپڑے پہنے۔

دونوں نے دور ہی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور محتاطی کشش سے اس طرح ایک دوسرے کی طرف کھینچ کر دو کا ایک وجود بن گیا۔

”گل بانو“ آصف نے بازوؤں میں لے کر اس کے بالوں پر گال ٹکائے آنکھیں بند کی لذت سے سرشار ہو کر کہہ رہا تھا۔

اور گل بانو اس کے سینے کے کنارے منہ چپائے بے اختیار ہو کر سسک رہی تھی۔ بندہ نے بے خبری کر دی۔ دو دونوں کو دیکھ کر چاندنی مسکراتی اور ماحول گنگنا رہا۔

”کھن“ آصف نے کئی سرشار لمحوں کے بعد اسے بازو میں سینے اس کا چہرہ اونچا کیا۔ بیگناہ اور لہذا قریب تھا۔ آصف کی نگاہ آسمان کے چاند پر پڑی۔ پھر اس نے گل بانو کو دیکھا۔ یقیناً اس کا

آسمان کے چاند سے زیادہ خوبصورت تھا۔ غریبیت اور سیری کے احساس سے اس کا سینہ تن تنہا گل بانو ابھی تک سسک رہی تھی۔ بھر کا دکھ سیال بن کر آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔

”روتی کیوں ہو گل بانو؟ سیری کی طرف دیکھو۔ شکر کر۔ میں زور دہا۔“ آصف نے کہا۔

”میں نہیں بولتی تم سے۔“ گل بانو اپنا آپ اس سے چھڑا کر پرے ہٹ گئی۔

”کیوں۔“

”تم بہت خراب ہو۔“

”کیوں۔“

”اتنے دنوں سے جو ملی آئے ہو۔ گاؤں ہی آجاتے۔“

”تم میرا انتظار کرتی تھیں۔؟“

”نہیں۔ نہیں کرتی تھی۔ جاؤ۔“ وہ روٹھ گئی۔ یہ خاتم اور لوٹ ہی لے گئی۔ پھر آصف نے وہ بڑی جاذب سے بڑے پیار سے بڑی ملاحت سے اسے منانا رہا۔ یہ کھیل بھی خاصا دلچسپ و دلچسپ تھا۔ گل بانو بھی دوسری دور جٹ جاتی۔ کبھی درختوں کے پیچھے ہو جاتی۔ آصف دیوانہ وار اس کی تلاش کرتا۔ اپنی طرف کھینچ لیتا۔ کھاتی مروڑ لیتا۔

اب کے اس نے کھاتی کھڑی تو اسے مروڑا کہ گل بانو چیخی۔

”بولو گی یا نہیں۔“ آصف نے اس کے پیچھے کی پرواہ کیے بغیر کہا۔

چاندنی بلند ویت پر کساں پھیلی تھی۔

شام بڑے زور کی آندھی آگئی تھی۔ مٹی کے غبار تھے۔ دشتی ہواؤں نے ہر چیز تسنہ کرنے کی ٹھانی تھی۔ شاخ شاخ کی آوازیں کانوں کے پردے چاٹ رہی تھیں۔ کئی پودے ٹوٹ تھے۔ بلیں الجھ مٹی تھیں۔ پرانے زور و خروش اٹھ گئے تھے۔ اور اپنے اپنے ٹھکانوں پر کھڑے جانور گئے تھے۔

پھر یہ آندھی جاگ نہاں سے ٹھکانوں میں اٹھ کر لائی تھیں۔ زوروں کی بارش ہو گئی۔ ہر چیز نے پیر بن بدل لیا تھا۔ سبزہ دھل کر نکھر آیا تھا۔ درختوں کی ہری بھری شاخیں جو دھ مٹی سے الٹی تھیں۔ دھل کر صاف و شفاف ہو گئی تھیں۔ موسم خشک ہو گیا تھا۔ اور ہر طرف کھم برائی آنکھوں کو بے حد بھلی لگنے لگی تھی۔

چاندنی چاندی کا ٹھکانوں بن کر کائنات میں بھر گئی تھی۔ آسمان کالا کالا نظر آ رہا تھا۔ اس سیلا کے واسطے ہی سے ستاروں کی چمک بہت نمایاں تھی۔ چمک اور روشنی کا شاید اپنا وجود ہی نہیں اندھیرے اور سیاہی کے دم سے اس کا وجود جو دھس آ جاتا ہے۔

آج آصف بھر اصرار گاؤں آیا تھا۔ اب لگن آتی ہے۔ آج ہی بچہ تھی کہ انتظار کی زحمت گوارہ کرنے کی ہمت تھی۔ نہ طاقت نہ فراہم اس کے اصرار کے سامنے ہیک گیا تھا۔ ویسے بھی اور وہ رو بصحت تھا۔ اور فرجاد کو شہر سے جانا تھا۔

آصف شام جو ملی واپس نہیں گیا۔ آندھی کا بہانہ معقول تھا۔ وہ رات نہیں بسر کرنا چاہتا تھا

حسن کے قدموں میں عشق کی جہنم بھر رہی تھی۔

شام گرمی ہوئے تک تو احوال پرسی والوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ بھٹکنا ان سے جان چھڑا تھی۔

اور

جب رات کچھ کچھ گرمی ہو رہی تھی۔ وہ بیت سے قدرے ہٹ کر گل بانو کا انتظار کر رہا تھا

”بولوں گی بولوں گی۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”چھوڑو نا۔ بولوں گی بولوں گی۔“
آصف نے ہلکا سا ہتکادے کر کائی چھوڑ دی۔

”ناراض تو مجھے ہونا چاہیے۔“ وہ پتھر بیٹھے ہوئے بولا۔

”کیوں۔“ گل بانو سامنے کھڑی اپنی کلائی سسلاتے ہوئے بولی۔

”میں موت کے منہ میں کھینچ گیا تھا۔ اور تم مجھے دیکھنے تک نہ آئیں۔“ مرجا تا تو۔ آصف جان بوجھ کر جیتڑا بولا۔

”خبردار ہو کر گل آگے بڑھی۔ اور اس کے قریب بیٹھے ہوئے بولی۔ ”اللہ نہ کرے۔“
باتیں نہ کرو۔“

”کیوں نہ کروں۔ گولی باز کی بجائے دل میں بھی لگ سکتی تھی۔ کچھ بھی چر سکتی تھی۔“
”ہائے اللہ۔“

”صرف ہائے اللہ۔ اتنا نہ ہو سکا۔ کہ ہسپتال ہی آجائیں۔“

”ہسپتال کیسے آئی آصف۔“

”جیسے اور لوگ آتے تھے۔ گاؤں کے کئی مرد اور عورتیں مجھے دیکھنے آئے تھے۔ حویلی کا
لوگوں کا تانہ بندھا رہتا تھا۔ ہمیں میرا ذرا بھی خیال ہوتا نا۔ تو کسی ہمارے حویلی ہی آجائیں۔“

گل بانو آصف کی سنجیدگی سے گھبرا کر اس کا منہ کھٹکے لگی۔

”کسی کے ہاتھ پیٹام بھی بھجوا ہوتا۔ مجھے تسلی تو رہتی۔“ آصف نے منہ ہاتھ ہوئے کو

گل بانو سر جھکا کر بولی۔ ”کس کے ہاتھ پیٹام بھجوائی آصف۔“

اس نے اتنی تیارگی اور معصومیت سے کہا۔ کہ آصف مسکرانے لگا۔

”طلو حساب برابر ہو گیا نا۔“ وہ اس کا نرم و گرازا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا۔

”نہیں۔“ وہ بھی مسکرائی۔

”کیوں۔“ آصف بولا۔

”تم تو آسکتے تھے نا۔ حویلی آگے تھے تو یہاں بھی آجاتے۔“

”تم کیا جانو میں یہاں آنے کے لیے کتنا بے تاب تھا۔“

”جھوٹ۔ ایسی بات ہوتی۔ تو وہیں نہ بیٹھے رہتے۔“

”فرجاد نہیں آئے رہتا تھا۔“

”کیوں۔“ گل بانو نے چونک کر اسے دیکھا۔ آصف نے اس کا چونک جانا محسوس نہیں

فرجاد کی محبت اور پیار کا ذکر کرتے ہوئے گل بانو کو بتانے لگا۔ ”وہ تو آج بھی آئے نہیں دیکھا
ہست ہوئے جشن کی تیاری کر رہا ہے۔ میری صحت یابی کی خوشی میں۔ میرا بھائی میرا بہت خیال

... بات پارا انسان ہے۔“

”چھوٹے مالک واقعی بہت اچھے ہیں۔ فرشتے ہیں فرشتہ۔“ گل بانو بولی۔

”میرے بابا بہت بیمار تھے۔ چھوٹے مالک نے ان کا مفت علاج کروا دیا وہ نہ ہوتے تو خدا جانتے
”ایسا مل ہوتا۔“

گل بانو فرجاد کے غلوں سے مرعوب و متاثر تھی۔ وہ اس کی تعریف کر رہی تھی۔ اس
میں عقیدت و احترام کا رنگ نمایاں تھا۔

فرجاد کی تعریف سن کر آصف خوش ہو رہا تھا۔ ہر جگہ اس نے یہی الفاظ سنے تھے۔ غریبوں
بالے اس کے لیے دعائیں گل رہی تھیں۔ وہ وہ باتوں میں بہت مقبول تھا۔ لوگ اس کا ذکر

احترام سے کرتے تھے۔ آصف کو خوشی ہو رہی تھی۔ فرجاد تو گاؤں سے الگ تھا۔ یہ تہذیبی
فرق تھا۔

”اب کیسے ہیں بابا۔“ آصف نے اس کی دھیروں باتیں سننے کے بعد کہا۔

”اب تو اچھے ہیں۔“ وہ بولی۔ ”دس بارہ دن پہلے تو حال بہت خراب تھا۔ بابا فکر بھی تو کرتے
”میری وجہ سے پریشان رہتے تھے۔“

”تمہاری وجہ سے۔“

”ہاں آصف۔ بابا کو خدا خواست کچھ ہو جاتا تو میرا کیا بنتا۔ کون تھا یہاں میرا بابا کے سب رشتہ
”ہاں بھئی۔“

گل بانو کچھ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ بادل کو خوشگوار بنانے کے لیے آصف نے اس کا چہرہ اپنی
”نہا کر کہا۔“ ”میرے ہوتے ہوئے کبھی ہو۔ کہ تمہارا کون تھا یہاں۔ گل آصف جو ہمیشہ

”نہا کر کہا۔“

”بابا کو تو ڈای پڑ ہے۔“ وہ سادگی سے بولی۔

”نہ مسکرانے لگا۔ خوشی سے بولا۔ ”تو بابا کو اب جتنا ناہی پڑے گا۔“

”اب۔“ وہ آکھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔

”تر۔“ آصف نے انگلی اس کے کندھے پر رکھی۔

”میرے۔“ اس نے انگلی اپنے سینے پر لگا کر ہونے مسکرا کر کہا۔ ”بغیر نہیں رہ سکتیں۔“

”ہائے اللہ۔ بابا سے مت کہنا ایسے۔“ وہ ہر اسامی ہو گئی۔

”اوپر کیسے کہوں۔“ وہ چھپڑتے ہوئے بولا۔

”نہ کیا پڑ۔“ اس نے لپا کر سر جھکا لیا۔ آصف اسے بڑے پیار سے دیکھنے لگا۔

ہاتھ کی مسکراتی رہی اور وہ محبت بھرے دل کبھی خاموشیوں کی زبان میں اور کبھی باتوں کے

اظہار سے ایک دوسرے کی سنتے رہے اور بتاتے رہے۔
کافی وقت گزر گیا۔

رات اور بھیک گئی تھی فضا کی خاموشی میں ندی کا شور بڑھنے لگا تھا۔ بستی کے کتوں
بھونکنے کی آوازیں خاموش ظلم کو کبھی کبھی توڑنے لگی تھیں۔ پرندوں کی سرسراہٹ، درختوں
پتوں میں ہلکی سی آواز پیدا کر دیتی تھی۔
”سب میں جاؤں۔“ کل باتوں نے کہا۔ ”بابا چاہا نہ جائیں۔“ جو بھی میرے انتظار میں جا
رہی ہو گی۔ اسے بابا کے پاس چھوڑ آئی تھی۔“

”کل پھر یہاں آؤ گی۔“

”پتہ نہیں۔“

”کل ضرور آنا۔ میں انتظار کروں گا۔“

”اچھا۔“

دو توں اٹھے اور ساتھ ساتھ قدم اٹھاتے بستی کی طرف بڑھنے لگے۔ پل کے قریب آہ
نے رک کر گل بانو کو خدا حافظ کہا۔ اور آہستگی سے بولا۔ ”کل ضرور آنا گل۔“ یہ چند دن کی
ہے۔ پھر یوں ملنے کی ضرورت نہ رہے گی۔“

”کیوں۔“ وہ بولی۔

”پھر میں تیس بابا سے پیشہ کے لیے ہانگ لوں گا گل۔ بہت جلد۔ بہت جلد۔“

آصف جذباتی ہو گیا۔

”ہلو بھی۔“ کل بانو مسکراتے ہوئے پرے ہٹ گئی۔

وہ اپنے کھر کی طرف جا رہی تھی۔ جب تک نظر آئی رہی آصف پہل پر کھڑا اسے تکتا رہا۔

بابا کی صحت اچھی ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا۔ اب تک ذہن پر فطرت کا بوجھ اٹھائے تھا۔ یہ
اب اس کی بیماری تھی۔ یہ بوجھ فرجادیے ہانٹ لیا تھا۔ بابا کی جماندہ نگاہیں فرجاد کا بطور جائزہ لے رہی
تھیں۔ وہ بڑا مخلص اور پکارا انسان تھا۔ اس کے خیالات بہت پاکیزہ تھے۔ اور وہ انسانوں میں تفریق
کا اصل نہ تھا۔ بابا کے ساتھ تو اس کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ بابا جب اپنی پشتوں نما اردو بجا بی
ٹھا، ارہان میں باتیں کرتا۔ تو فرجاد بس پڑتا۔
”پھر کتنا بابا۔“ وہ لطف لیتے ہوئے کہتا۔

”نونا ملک امارا زبان ایسا ہے۔ ام کیسے ٹیک بولے گا۔“ بابا بھی مسکرا کر کہتا۔

”کل بانو تو بالکل صحیح زبان بولتی ہے۔“ فرجاد زیر لب تبسم سے کہتا اور بابا کی آنکھوں
میں ہنسنے لگتے رنگیں خواب دیکھ کر من میں خوشی کی لہریں اٹھتی محسوس کرتے ہوئے کہتا۔ ”کل
فرجاد پر ہوا ہو گیا۔ اس کا ماں اور کھابولی بولھاتا۔ اس نے ٹیک بولی سکا۔“

یوں کتنی کتنی دیر بابا اور فرجاد باتیں کرتے رہتے۔ بابا نے اپنے عجیب و غریب عشق کی
دانتیاں سنائی تھیں۔ اپنے آقاؤ اجداد کی برادری کے قصے بھی سنائے تھے۔ اپنے قول و فعل کے
بابا نے بارے میں خود اکثر فرجاد سے باتیں کیا کرتا۔

اس نالے کالے خشک پتھر پر پہاڑ کی طرح باپ سے وہ اپنی محبت کے تحفظ میں لگرا گیا تھا۔
اپنے عشق کی خاطر گھرا عزیز رشتہ دار کنبہ قبیلہ سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔

اور

یہ وہ ریشیاں کے متعلق جس طرح ڈوب کر باتیں کرتا۔ فرجاد محبت کی قوت اور استحکام کا
اہل بابا تھا۔

بابا کی باتیں دانستہ ہوتیں یا نادانستہ۔ ان سے یہ بات ضرور تھی۔ کہ فرجاد کے تاثرات سے
نونا آقاؤ ہو جاتا تھا۔ اور فرجاد میں بھی عشق کی راہ پر خار پر ہر صورت چلنے کی بہت پیدا ہو

اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ جب بھی گل بابا کے لئے بابا کے سامنے دست سوال پھیلائے گا
بابا کسی تردد یا تذبذب کے بغیر یہ سوال قبول کر لے گا۔ کیونکہ بابا۔

محبت خدا۔

اور

خدا محبت کا قائل تھا۔

اور فرجادیہ بھی جان ضرور گیا تھا کہ بابا اس کے جذبات سے بے خبر نہیں۔ بے خبر رہتا ہے
کیونکہ۔ پھر تو تھا نہیں۔ تجربات کی بجلی میں پس کر عمر گزارتی تھی۔ اسے احساسات و جذبات کا
تجرباتی علم تھا۔ اور علم وہی سچا ہوتا ہے جو ہم تجربے سے حاصل کرتے ہیں۔

فرجاد کا اپنے گھر میں آنا۔ بے تکلفی سے بیٹھنا۔ بے دھڑک باتیں کرنا۔ اور گل بابا کو روک روک
روئیں کی آنکھ سے دیکھتے رہنا۔ اس نکتے میں جذبات کے تند و تیز نئے کانٹے کھل جانا۔ گل بابا کو
باتیں کرنے کے لیے موقع ملنا۔ کبھی اس کے چروڑوں کے متعلق پوچھنا۔ کبھی اس کی بکری
تقریبیں کرنا اور کبھی قومہ پلانے کی فرمائش کرنا۔ یہ سب گلن کے حیلے تھے۔ ہندھن کے دور
تھے۔ بابا سب کچھ جانتا تھا۔ سب کچھ۔

اور

فرجاد کے کردار کو قریب سے دیکھنے جانچنے پر کھتے کے بعد وہ ایس بھی نہ تھا۔

دن گزر رہے تھے۔ فرجاد بڑی سوچہ بوجھ سے کام لے رہا تھا۔ بابا سے اس کے جذبات
ٹک جھکی نہ تھے۔ لیکن وہ زمانے کی تند و تیز نظروں سے بچنے کے لیے بھی احتیاط سے کام لے
تھا۔ بابا کے گھر میں تو گلن کے جذباتوں کے تحت کھپا آتا تھا۔ لیکن وہی بے تکلفی اور اس سے زنا
وقت وہ دوسرے دور میںوں کو بھی دیتا تھا۔ جن کا علاج بابا کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ برابری کا قائل
اس نے چرسے پر اتنی خوبصورتی سے سجا رکھا تھا کہ کوئی ٹھک کی نظر سے دیکھنے کی بہت بھی نہ
سکتا تھا۔

انسان غرض کا بندہ ہے۔ یہ صرف اپنے آپ کے لیے ہے۔ اپنے آپ کے لیے یہ کئی دوسرے
دھار لیتا ہے۔ کئی تشکیں بدلتا ہے۔ چرسے پر کئی نقاب سجالتا ہے۔ فرجاد بھی جب کبھی ڈوب
اپنے جذبات کا تجربہ کرنا۔ تو دونوں دوسرے مریضوں کے ساتھ محبت طعوض اور نگہداشت کر
کے جذبہ میں اسے اپنی غرض شامل نظر آتی۔ وہ اور کرنا بھی کیا۔ گل بابا کو وہ ٹوٹ کر جانے لگا
وہ اس کی رگ رگ میں سما گئی تھی۔ اسے بہت جلد اپنا لینے کے خیال سے وہ سرشار رہنے لگا تھا۔
گل بابا سے محبت کے موضوع پر کبھی بات نہ ہوتی تھی۔ نہ ہی فرجاد نے انکار کے لیے مو

امور نے کی کوشش کی تھی۔ انکار تو آپوں آپ ہو رہا تھا۔ گل بابا بھی تو اسے دیکھ کر خوشی
ہوئی نہ سائی تھی۔

”قودہ لاؤں مالک۔“

”آپ فرشتہ ہیں۔“

”کتنے اچھے ہیں آپ۔ امیر لوگ تو غریبوں کی طرف دیکھتے بھی نہیں۔“

”میرے چروے بڑے ہو جائیں نا۔ تو آپ کے لیے انیس ذبح کردوں گی۔ یہ مجھے بہت
پارے ہیں۔ کوئی ہاتھ بھی لگائے تو کچا کھا جاؤں۔ لیکن آپ تو بہت اچھے ہیں نا۔ آپ کے لیے ان کو
پھاڑں گی۔“

”یہ بکری نہیں آپ سمجھتے گا۔ میں اپنا دل کاٹ کر آپ کو کھلا دوں گی۔ ہوں۔“

وہ اکثر اچھے بیٹھے ایسی باتیں کرتی رہتی۔ اس کے چرسے پر نورانی عکس لہراتے۔ اس کی
انہوں میں فسون ہو۔ وہ مسکراتی رہتی۔

فرجاد کیا کچھ نہیں سوچتا تھا یہ باتیں سن کر۔

اس شام بابا کالا کبیل اوڑھے چولے کے پاس بیٹھا تھا۔ نیلی چٹکی کی بے ڈھکی کی پیالی اس
کے سامنے پڑی تھی۔ چولے پر چائے نوش تھا۔ اور وہ حسب عادت و قہقوں کے بعد قودہ پل رہا تھا۔

فرجاد جو حلی جاننے سے پہلے اصرار کیا تھا۔

”ابھی تو کالی دقت ہے مالک دیکھیں۔“ بابا نے فرجاد سے ہلکے پر بیٹھے کی استدعا کی۔

”آج جلدی جانا ہے بابا۔“

”کیوں۔“

”بہت ضروری کام ہیں وہاں۔ شاید تین چار دن نہ آسکوں۔“

بابا نے صرف اس کی طرف دیکھا۔

”تمہیں دوسرا ہفتی رہے گی۔ شیدا تمہیں ہر چیز پہنچائے گا۔“

”آپ کیوں نہ آئیں گے۔“

”مجھے وہاں بہت سے کام کرنا ہیں۔ بہت بڑے جشن کا اہتمام کرنا ہے۔“

بابا نے مزید تنبیہات تو پچھتا ضروری نہ سمجھیں۔

”گل بابا کو اس سے۔“ فرجاد نے چند لمبے رک کر کہا۔

پانی لینے لگی ہے۔“

”ہاں مالک ضرور آؤں گی۔ میرا بابا بھی آئے گا۔“ وہ خوشی سے ہانسی ہوئی جارہی تھی۔
 لہڑے کھڑے اس نے اپنے کالے کوچی لباس کی پوری تفصیل فرجاد کو بتادی۔ کالا لباس جس پر
 ہاندی کے پے لگے تھے۔ جو اس کے بابا نے عید پر خاص طور سے اس کے لیے بنوایا تھا۔ اور جب
 اس نے پتا تھا۔ تو بابا کی آنکھوں میں اس لباس کی مناسبت سے اپنی بہنوں کے چہرے لہرا گئے تھے۔
 اپنی ماں کا بیکر تھک گیا تھا۔ بے آب و گیاہ پھاڑوں میں بسنے والے لوگوں کی یاد آگئی تھی۔

”اچھا۔ میں چلتا ہوں۔“
 ”کہاں چلتے ہیں۔“ گل بانو اس کی پشت پر ہنکڑا کر کہنے لگی۔
 ”تم آگئیں۔“ فرجاد نے پلٹ کر دیکھا۔ گل بانو کہنے پر مٹی کا گھڑا رکھے اسے باؤں
 میں لیے کھڑی مسکرا رہی تھی۔
 وہ کسی فکڑا کا شکار معلوم ہو رہی تھی۔ فرجاد بھت پاش نظروں سے اسے دیکھ گیا۔
 ”پانی لے آئیں گل بانو۔“ بابا نے پوچھا۔
 ”کہاں لے آئی بابا۔“ گل نے غل گھڑا جھک کر زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔
 ”کیوں۔“ بابا نے پوچھا۔
 وہ ٹھوکر کر برآمدے میں آگئی۔ فرجاد کی طرف شوخی سے دیکھا اور بولی۔ ”بابی بھڑے
 تھی۔ سلو سے بتایا مالک کھڑے ہیں۔ میں وہیں سے لوٹ آئی۔“
 فرجاد کا دل جیسے اچھل کر طلق میں آگیا۔ آنکھوں میں خیرہ کن چمک تھی۔
 ”مالک تو تین چار دن کے لیے جارہے ہیں۔“ بابا بولا۔
 ”کیوں۔“ گل بانو نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔
 ”آصف کی صحت یابی کا جشن منانا ہے۔ تم آؤ گی۔“ فرجاد نے آہستگی سے پوچھا۔
 ”بابا سے پوچھیں نا۔“ گل بانو پھول کی طرح کھل گئی۔ آصف کے جشنِ صحت میں
 کی خوشی میں بسک سی گئی۔
 فرجاد نے بابا سے کہا۔ ”بابا جشن میں آپ کو بلاؤں تو آپس سے نا۔“
 بابا نے شہر گزار نظروں سے اسے دیکھا اور بولا۔ ”مالک بڑے لوگوں کا جشن ہے۔“
 ”کوئی انسان چھوٹا اور کوئی بڑا نہیں ہو تا بابا۔ سب ایک ہوتے ہیں۔ یہ بات ہے تو امیر
 کو ضرور شامل ہونا ہو گا۔ گل بانو بھی آئے گی۔ گاؤں کے بہت سے لوگ یہ تفریق مٹانے
 میں بلاؤں گا۔“
 فرجاد کی باتوں میں غلطی کی محک تھی۔
 ”بابا ضرور جائیں گے ہم۔“ گل بانو لہرائی۔ ہم بھی تو دیکھیں جشن کیسے ہوتا ہے۔ میں
 اچھا کوچی لباس پہنوں گی بابا۔“
 بابا مسکرائے لگا۔ اور فرجاد دونوں کو شرکت کا بلاؤہ اصرار سے دے کر چل دیا۔
 گل بانو دروازے تک اسے خدا حافظ کہتے آئی۔
 ”ضرور آؤ گی نا۔“ فرجاد نے پلٹے بغیر کہا۔

”تمہارا وہم ہے۔“

”خدا قسم۔ رنگت بھی خراب ہو چکی ہے۔“

”اچھی کب تھی۔ تمہاری طرح گورا تھوڑا ہی تھا۔“

”سچ کہتا ہوں۔ تم اپنی بساط سے بڑھ کر کام کر رہے ہو۔“

”یہ موقعے روز تو نہیں آتے۔“

فرجاد عثمانیت سے کرسی میں پھیل گیا۔ اور آصف مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ابھی تو موقعے

آئیں گے۔“

”ہوں۔“

”جتنی ہماری تمہاری شادیاں بھی تو ہوں گی۔ ایسے اہتمام تو شادی بیاہ کے موقعوں پر ہی اچھے

کئے جاتے ہیں۔“

”کیا۔“ آصف نے دلچسپی سے پوچھا۔

”موقعہ اچھا ہے۔“

”پھر۔“

”کیوں نہ تمہاری شادی کے فریضے سے بھی بیکدوش ہو جائیں۔“

”شادی؟“

”اچھا کبھی منگنی ہی سہی۔ واہ کیا بات۔ خدا قسم جشن کی شان دوپالا ہو جائے گی۔ کیوں کیا

نہیں ہے؟“

آصف کی آنکھوں میں ستاروں کی چمک لہرائی۔ خیال معقول ہی تو تھا۔ وہ خوش کن

دورات میں ڈوب گیا۔

فرجاد کن آنکھوں سے اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر خود فراموشی کے عالم

میں رہا۔

”اے مسٹر۔“ فرجاد نے سگریٹ سٹاک کر تیلی ہاتھ کے جگہ جگہ جھکوں سے بچا کر آصف کی

پیشانی پر دیا۔

”ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے کرسی میں سیدھا ہوا بیٹھا۔

”کیا سوچنے لگے تھے۔“

”تمہارا خیال خاصا معقول ہے۔“

”جتنی؟“

”یہ کہ جشن تو ہو ہی رہا ہے۔ اس کی افادیت یوں پڑھادی جائے کہ ہم دونوں کی تنگیوں کا

حوالی عروسی کی طرح سنواری جا رہی تھی۔ رنگ روغن تو مہینہ بھر پہلے سے ہو رہے تھے۔ اب تو آرائشی چیزیں سجائی جا رہی تھیں۔ نوکروں کی پوری چلن کام میں مصروف تھی۔ حوالی میں رہائش پذیر عزیزوں رشتہ داروں کو بھی کام سونپے گئے تھے۔ جشن ہال کی رہائش میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ فرجاد کی گرائی میں سارا کام ہو رہا تھا۔ کوئی چیزیں لینے دوڑ رہا تھا۔ کوئی نئے فرنیچر کو خریدنے سے رکھوا رہا تھا۔ کوئی دیوار گیرینڈنگز کی جگہ بدل رہا تھا۔ کئی نئے فائوس اور جمائو لٹکالے کی ذمہ داری لے رکھی تھی اور کوئی قالینوں کی مناسبت سے پردے ٹھیک کروا رہا تھا۔

بزرگوں کے ذمہ دعوت کا اہتمام تھا۔ کھانے پینے کی چیزیں وہی اکٹھے کر رہے تھے۔ سیکڑوں آدمیوں کی دعوت بھی کچھ کم بڑا مسئلہ نہ تھی۔

حوالی والے فرجاد کا ذوق جنون دیکھ رہے تھے۔ کوئی سگہ بھی بھائی کی صحت مندی پر یوں خزانے کا منہ نہ کھولتا۔

خود آصف بھی عجوب سا تھا۔ آخر اسے بڑے جشن کی ضرورت تھی۔ فرجاد کی جان بچانا تو اس کا فرض تھا۔ جشن کی تیاری کے لیے اس کا جوش و خروش اور دلولہ دیکھ کر وہ بڑا متاثر تھا۔

اس دن دونوں کچلی کچلی میں بیٹھے تھے۔ چائے کی پیالی پیٹے ہی فرجاد اسنے لگا تو آصف بولا۔

”کچھ دیر بیٹھو۔“

”کام ہے۔“

”اسنے پھیلے میں کیوں پڑ گئے ہو۔“

”بھلا؟“

”تو اور کیا۔ مجھے ڈور لگتا ہے۔ مسلسل کام کرنے سے تم بہار نہ پڑ جاؤ۔“

”اے نہیں۔ اتنا نازک اندام تو نہیں ہوں۔“

”تمہارے چہرے سے تھکان کے آثار ہو رہا ہیں۔“

بھی یا قاعدہ اعلان ہو جائے۔

”ہوں۔ پڑے گئے ہوں۔“

”ہم بہت تھریں۔“

”اس لیے شادی ہو جانا چاہیے۔“

”ضرور۔“

”مجھے اختلاف نہیں تمہاری بات سے۔“

”میں ایک دوسرے کے کام آتا ہے فرجاء۔ ہم ہی چھوٹے ہم ہی بڑے ہیں۔“

”بالکل۔“

”تمہاریوں کا احساس اب توڑنے لگا ہے۔“

فرجاء کھٹکھٹا کر نرس دیا۔

”میں سنجیدہ ہوں۔“

”تو گویا فوری کا نصیبہ جاگ اٹھا۔“

”فوری نہیں۔“

”فرجاء حرمی میں رہنے والی دور پار کی عریزہ لڑکیوں کے نام لے لیکرات پیچھے لے لگا۔ آصف کا

سب کی طرف انکاری رخ تھا۔

دو دنوں کی شرف سی پیچیر چھاؤ تو زری در جاری رہی۔ پھر گھٹکھٹا کے سنجیدگی کا رخ موڑا۔

فرجاء بھی قدرے ہنستے ہوئے بولا۔ ”میں بھی بہت دنوں سے تمہیں اپنے انتخاب کے متعلق

بتانے کا سوچ رہا تھا۔“

”اچھا۔“ آصف نے لمبی سی اچھا کہتے ہوئے شرف نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں۔“

”تو گویا جناب بھی۔“

”جو ان ہو گئے۔“

فرجاء نے آصف کی بات پوری کرتے ہوئے زوردار قہقہہ لگایا۔ آصف نے بھی ہنسنے لگا۔

اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ دو دنوں دیر تک ہنسنے رہے۔

خواہ مخواہ ہنسنے رہے۔

بے گن گن سے ہنسنے رہے۔

”ہاں تو۔“ فرجاء نے آصف کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔ ”کہہ ڈالیے جناب۔“

”کیا؟“

”اپنی پسند اپنا انتخاب اپنی چاہت۔“

”پہلے تم بتاؤ۔“

”نہیں ہی۔ پہلے تم۔“

”نہیں پہلے تم۔“

”تم بڑے ہو۔ دوسرا جشن بھی تمہاری صحت پالی کا ہے۔ اس لیے ابدولت کے سامنے اپنی محبت

اور اراکلی ڈالو۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ بخوشی اس سینہ روزگار کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں تمہاریں

کے کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ کوئی کماندرا نہ ہوگی۔ کہہ ڈالو۔ ابدولت جتنے کے موز میں

ہیں۔“ فرجاء نے شرفی سے آنکھیں پھلتے ہوئے آواز میں مدبرانہ گونج پیدا کرتے ہوئے کہا۔

آصف پچھلے پچھلے مسکراتا رہا۔ فرجاء نے بات ختم کی تو جھک کر ماتھے پر ہاتھ رکھا اور کورنش کے

اگر میں ہاتھ دلوں تو پیچھے لے جاتے ہوئے بولا۔ ”بندہ اس نوازش کا تمہ دل سے ممنون ہے۔ عالی

۱۲

”تو پھر پھوٹو منہ سے پکھ۔“

جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔“

”اجازت ہے۔“

”پہلے جہاں چاہا اپنی پسند کا حال بیان فرمائیں۔“

استاخ۔ تمہاری یہ مجال۔“

فرجاء نے جس انداز میں کہا آصف کھٹکھٹا کر ہنس پڑا۔ فرجاء بھی ہنسنے لگا۔

دونوں پھر خواہ مخواہ ہنسنے لگے۔

بالکل خواہ مخواہ۔

”ہاں تو آصف مذاق پر طرف اپ بتاؤ۔“ فرجاء نے رومال سے آنکھوں کے گوشے صاف

کئے ہوئے کہا۔ ”جلدی کرو مجھے بہت سے کام کرنا ہیں ابھی۔ ہوں۔“

”آصف مسکرایا۔ ”بھئی کیا کہوں۔“

”یہ کہ ہماری ہونے والی بھالی کن ہے۔ اس کا انا پتہ۔ آخر شادی بیاہ بچوں کا کھیل تو نہیں۔“

فرجاء نے مجھے ہی تو انجام دیتا ہے۔“

”شرائے کیوں ہو۔ حد ہوگی۔“ آصف مسکراتے لگا۔

”شرائے کی تو کوئی بات نہیں۔ مرا مطلب تھا پہلے تم اپنی کہتے۔“

”کہہ دوں گے مجھے تو کوئی عار نہیں پائے ہیں۔ لیکن پہلے تم نے کہا ہے۔ اس لئے کہ تم بڑے

اور جشن بھی تمہارے لیے ہو رہا ہے۔“

مذاق تو نہ اراؤ گے۔“

”مذاق؟“

”ہاں۔“

آصف کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس کی طرف پشت کرتے ہوئے بالکنی کے جھنگے پر دو ٹوہٹا رکھ کر قدرے جھکتے ہوئے گھمبیر آواز میں بولا۔ ”میری ہند اک دسماتی لڑی ہے۔“

”ہوں۔“ فرجاد کرسی میں سسورا آواز میں پھیلنے ہوئے بولا۔ ”ہمارے گاؤں ارضی جنتیں ہیں آصف یہاں حوریں بہتی ہیں۔“

”گل بانو واقعی ارضی حور ہے فرجاد۔“ آصف اسی انداز میں کھڑے کھڑے بولا۔

”کیا؟“ حیرت سے پھٹ جانے والی آنکھوں سے فرجاد نے آصف کو دیکھا۔

آصف نے پلٹ کر سر جھکا کر ہوئے تجوہ انداز میں کہا۔ ”گل بانو بہتی کی ایک غریب لڑکی ہے فرجاد۔ لیکن مجھے اپنے انتخاب پر فخر ہے۔ گل بانو میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ وہ بھی مجھے ٹوٹ کر چاہتی ہے اور۔“

وہ بات مکمل بھی نہ کر پایا تھا کہ لازم تیزی سے اوھر آیا اور آصف سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”صاحب آپ کاڑھ کال ہے۔“

اور

بات ادھوری چھوڑ کر آصف جلدی سے اس کے ساتھ چلا گیا۔ مڑے بغیر فرجاد کو وہیں رکھا اور واپس انکرا تینیں کرنے کا کہتا گیا۔

فرجاد کو پیلے تو یوں لگے جیسے کسی نے اسے زور سے دھکا دیا ہو۔ اسے چوت بھی آئی ہو۔ لیکن درد کا احساس نہ ہوا ہو۔ دھکا کھانے اور جٹ لگنے کے تین تین کی نیکیت ہی سے دوچار تھا۔

لیکن چند لمحوں بعد جب اس نے اپنے ہونے کا یقین کرنے کے لیے اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو چھوا۔ تو اسے اپنے ہونے کے یقین کے ساتھ ہونے والی تکلیف اور اذیت کا بھی احساس ہوا۔

اسے یوں محسوس ہوا۔

جیسے اس کے جسم سے ناگل رہی ہے بے سکت سادو جو بھر بھر مٹی کا ڈھیر ہے۔ آنکھیں شدت کرب سے پھٹ رہی ہیں۔ اور داغ من ہو رہا ہے۔ کلی لئے موت نمازیست کے کھیل یونہی گزر گئے۔

اس نے سر کو جھٹکا۔

آنکھیں کھولیں۔

بند کیں۔

اور

پھر کھولیں۔

اپنے ہونے کے ثبوت کے لیے پھر اپنے آپ کو محسوس کیا۔

وہ تھا اور ضرور تھا۔

ابا ابکی شدت کرب سے پھٹتی چیخ اسے اپنے سینے میں ترپتے محسوس ہوئی۔ اس نے ہونٹ اٹا کر اسے لے کر اس کی چیخ کو بکھر جانے سے روکا۔

وہ وہاں بیٹھ نہ سکا۔

اٹھا۔ اور بالکنی میں کبھی اوھر سے اوھر اور کبھی اوھر سے اوھر گیا۔

وہ کیا تھا۔ اسے اس وقت پوری طرح پتہ نہ چل رہا تھا۔ لیکن کچھ ہو ضرور گیا تھا۔

اور وہ ہو گیا تھا جو کسی طور ہونا نہیں ہونا چاہیے تھا۔

مستغرب وہ بچہ جن کسی آوارہ روح کی طرح بے ٹھکانہ وہ بالکنی سے سیر جیوں کی طرف گیا۔ وہ سارا دم میڑھیاں بھلا نکلتا نیچے چلا گیا۔

وہ اپنے کمرے میں گھس گیا۔

لیکن چند لمحوں کے بعد۔ ٹھن کا احساس ناقابل برداشت تھا۔ وہ گھبرا کر باہر نکل آیا۔ صحن میں اس کے پیچھے کھیل رہے تھے۔ اور مستعدی سے کام کرنے والے صحن میں سلمان رکھ اور فرجاد بچے تھے۔

وہ لوگوں سے خوفزدہ ہو کر پھر کمرے میں آگیا۔ اس کا اپنا پر آسائش کمرہ۔ اس کی آغوش کی آغوشیں و اطمینان کا گوارہ کمرہ۔ لیکن فرجاد کو قرار نہیں آیا۔ اسے یوں لگا جیسے وسیع و عریض مٹی و دیوار میں تنگ ہوتی جاتی ہیں اور چھت نیچے جھک آئی ہے۔ یہ کمرہ نہیں بدترین جیل ہے۔

وہ ڈر کر باہر نکلا۔ اور اس کے قدم تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

لہذا اب ارفع واعلیٰ تھا۔ آصف کی اس سے کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ اس لحاظ سے گل بانو کا حق سو
ہوا ہے پڑھتا تھا۔

اس نے اپنے دل میں آصف کے لیے نفرت کے کھولتے سمندر محسوس کیے۔
اسے آصف سے نفرت محسوس ہوئی۔

اس آصف سے! جو گل بانو کو اپنی پہلی اور آخری محبت کہہ چکا تھا۔ جو اسے اپنانے کے خیال
میں رہتا تھا۔ جس کے دسے الفاظ و اشکاف گونج تھی کہ گل بانو بھی اسے چاہتی ہے۔

رات بھر وہ نفرتوں کی ہلک سے اپنا من جھلٹا رہا۔ وہ تو اچھا ہوا آصف ٹریک کال سنتے ہی
نئے نئے شرجانے کے لیے منوں میں تیار ہو گیا تھا۔ کام کے سلسلہ میں دو دن وہیں رہنا تھا۔ ورنہ
اس طرح بھڑک اٹھی تھی۔ عجب نہ تھا۔ کہ آصف کا دل اس کا ذہن اور اس کی شخصیت راکھ
ہائی وہ تو جانتے وقت فرجاد سے مل بھی نہ سکا۔ ملازم ہی سے کہہ کر چلا گیا تھا۔

یہ رات بڑی سفاکی سے گزرتی رہی۔ فرجاد ایک لمحہ کو نہ سو سکا۔ آنکھیں دل و دماغ ذہن
وہاں جل رہے تھے۔ گل بانو اس کی زندگی تھی۔ گل بانو اس کی محبت تھی گل بانو اس کی سوچ
وہاں تھی اس کی شخصیت کا لازمی حصہ تھی اس کے وجود ہی سے تو اس کی ذات کی تکمیل ہوئی

اس گل بانو پر آصف نے حق جایا تھا۔ آصف نے اسے اپنی محبت کہا تھا وہ جتنا رہا
استہوار

اور شعلہ بدلیاں سوچوں میں الجھتا رہا۔ رات سرکتی رہی۔ وقت دسے پاؤں گزرنا گیا۔ فرجاد
سے پورے خواب آنکھوں کو سختی سے جپٹے تکیے میں منہ دیے۔ پڑا تھا۔ وہ آصف کو تنہا
رہا۔ چاہتا تھا اس کے سینے میں گولی اتار دیا چاہتا تھا اس کا گلا اپنے ہاتھوں سے دو بج دیتا
تھا۔ لیکن۔

انسان پتھر سے تو نہیں تراشا گیا۔ یہ تو بڑی نرم و چکلیلی جاذب سی شے ہے۔ ہر چند کہ
اسے مسلسل عمل سے اس کا باہری خول سخت کر دیا ہے۔ یہ پتھر کا گتھ لگا ہے۔ لیکن اس کا
اب بھی زمانے کی دستبرد سے محفوظ ہے۔ یہ اندر سے آج بھی ویسا ہی ہے۔ جیسا صدیاں پہلے

چکلا

اور

اب۔

(کبھی حالات ہمارے تابع ہوتے ہیں۔

اور

کبھی ہم حالات کے تابع۔

تابع ہونے کا عمل کبھی نہیں رکتا۔ یہ مسلسل ہے۔ وقت کی طرح ہمیشہ چلتے والا کبھی نہ رکنے
والا۔

یہ روانی سے بہتا ہے اور بہتا ہی چلا جاتا ہے۔)

ان دنوں فرجاد بھی حالات کے تابع تھا۔

لیکن اس مقام پر پہنچنے کے لیے وہ کن کن کھٹکھٹائیوں سے دوچار ہوا۔ کن کن مراحل سے
گزرنا۔ کیسے کیسے جہنم پار کیسے یہ وہی جانتا تھا۔

گل بانو کے بارے میں آصف کا اظہار محبت فرجاد کے جذبات سے سیدھا ٹکراؤ تھا۔ اس کا
رہنما بنے پناہ نفرت تھی۔ آصف بھائی کے مقام سے گر کر ملازم کے درجے کو چاہتا تھا اور فرجاد نے
اپنے آپ کو ہر لحاظ سے اس سے برتر جانتے ہوئے گل بانو کو حاصل کرنے کا حق اپنے آپ کو دے
دیا۔

وہ تین گاؤں کا واحد مالک تھا۔ بے شمار زمین۔ باغات کا رخسانے اس کی ملکیت تھے۔ وہ گل بانو
کو آصف سے چھین لینے کا حق رکھتا تھا۔ فرجاد نے غرور کی آنکھ سے آصف کی شخصیت کو دیکھا۔
اپنے پیکر کے سامنے وہ ڈرے کی مانند لگی۔ اس ڈرے کی اپنی کوئی حیثیت نہ تھی۔ انفرادیت نہ
تھی۔ وہ الگ ہو کر کچھ بھی نہ تھا۔

اور

فرجاد

اک نمایاں اکائی تھا۔

اپنے سنری اور رو پہلی پس منظر کے ساتھ اس کے ذہن میں نسلی تفاضری شان بھی تھی۔ وہ

فرجاد، نفرت و کدورت کے لحوں سے رات بھر کی تکفیش کے بعد بے ہنگام۔ تو صبح کی تازہ فاد
روشنی کی طرح اس کا اندام حسن بھی چلگا رہا تھا۔ باہر کا چھڑا انسان اندر کے پھلے نرم اور جاذب
انسان کے سامنے سرگوش تھا۔

آصف کے باپ کی قربانی آصف کی خوشیوں کے دامن پھیلائے تھی۔ اور پھر آصف کا جان
کھیل کر اسے بچانا بھی پکارا گیا تھا۔ فرض نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔

کیا ان قربانیوں کا یہی صلہ تھا کہ وہ آصف کی خوشیاں چھین لے۔ اس کی خواہشوں کے
خوبصورت مٹلوں میں آگ لگ دے۔ لذت کی چند گھڑیاں حاصل کرنے کے لیے آصف کو مستحق
روگ دیدے۔

پھر۔

لذت کی گھڑیوں کا اس کے پاس کتنا سجادت تھا۔ اس کی محبت تو یک طرفہ تھی۔ سوچ سوتا
کہ وہ باکل سا ہو گیا۔ کوئی واقعہ ایسا یاد نہ آیا جو کل بانو کی بے پناہ محبت کا امین ہوتا۔ وہ اس سے
مختلف تھی۔ عقیدت و احترام کے جذبہ نمایاں تھے۔ فرجاد اب تک انہیں محبت کا رنگ دیتا
تھا۔ کیا یہ اس کی بھول نہ تھی۔

یقیناً بھول تھی۔ ورنہ آصف کی طرح وہ بھی برلا کہہ سکتے کہ اہل ہوتا۔ کہ گل بانو یقیناً بھول تھی۔
ورنہ آصف کی طرح وہ بھی برلا کہہ سکتے کہ اہل ہوتا۔ کہ گل بانو بھی اسے چاہتی ہے۔

اندر اندر باہر کے انسان میں جادو بگھڑیوں کے شوق ہو گئی۔ کبھی چھڑا انسان خوشخوار ہو جاتا۔ کبھی
اندر کا انسان فرض کی دیوار میں سرسبز ہو جاتا۔ فرجاد اس جنگ میں ہوتا رہا۔

وہ بیڑا حال ہو گیا۔

بے حال ہو گیا۔

انسانیت میں شکست و ریخت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مارہ وکی ہے۔ صرف شکست و ریخت
کے نسل سے اپنی شائستگی تبدیل کرتا رہتا ہے۔

میں بھی تو پوری کائنات ہے۔

یہ بھی مارے کی تپتیں بدلنے والے اصول کی مطابقت لیے ہوئے ہے۔ یہاں سوچیں بدلتی
ہیں۔ کبھی خفی کبھی مثبت۔ کبھی بین زمین اور کبھی انتہا پسند۔

گھر کا بھی ایسا ہی انداز ہے۔ جذبات بھی اپنے دھاروں میں بہتے رہتے ہیں۔

شکست و ریخت کا عمل یہاں بھی جاری رہتا ہے۔

بننا۔ بگڑنا۔

بگڑنا بگڑنا لگتی رہتا ہے۔

فرجاد کی شخصیت کے بارے میں بھی اسی طور تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ ٹوٹ پھوٹ کر بکھرے کا
عمل تھا۔ اکٹھے ہو کر نئی تعمیر کا عمل تھا۔

میں رہا تھا۔ بگڑ رہا تھا۔

بگڑ رہا تھا۔

بگڑ رہا تھا۔

اور

نچ اندر کے انسان کی ہوئی۔ اندر کا انسان جو تاحال زمانے کی دستبرد سے محفوظ تھا۔ جو بچا تھا۔
ہر حق کی بات کا طعبار تھا۔ جو تعصب سے بالاتر تھا۔ جو غرض اور مفاد کے نام سے آشنا نہ تھا۔ اور
قدیمت کا روشن اور منور چہرہ تھا۔

آصف نے فرجاد کی جان بچائی تھی۔ اپنا آپ اس پر قربان کر دینے میں دریغ نہ کیا تھا۔ فرجاد
نے بھی اس عظیم انسان پر ایسے جذباتی وجود کو قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ فیصلہ سئل نہ تھا اور اس پر عمل پیرا ہونا بھی مشکل۔ اپنی محبت اپنی چاہت اور اپنی پسند کو
اس کے کھجولی میں ڈال کر عمر بھر کی محرومیت کو گلے لگالیا۔ دھڑا کر ترین نسل تھا۔

لیکن

(بعض اوقات ہم زندگی کے ایسے دوراں پر آتے کہڑے ہوتے ہیں۔ جہاں مصلحتوں کے
ساتھ ہمارا دامن تمام لینے ہیں۔ اور ہم آسان صاف اور سیدھی اور اگلدن دوسروں کے لیے چھوڑ کر
انہیں خاردار اور ٹیڑھے میزے راستے پر چل دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس کے سوا کوئی چارہ
نہ ہوتا۔ اور پھر مصلحتوں پر ٹالنا ہونے کا حق بھی ہم سے چھین جاتا ہے۔ دل کے آنسو لکڑیاں پر
اڑا ہوتے کے روپ میں پھیلا پڑتے ہیں۔)

پھر

(انسان بہت برا ہو جاتا ہے۔ اپنے ظاہری وجود کو رنگ رنگ خواہشوں میں ڈھانپ لینا اسے خوب

اچھا ہے۔)

یہ بھی اچھی ہی بات ہے۔ انسان کو بہرہ پر بھرتا بھی نہ آتا۔ تو یہ دنیا انسان کے ٹنگے چروٹی کی
سے بدترین جگہ ہو گئی۔

رات بڑی بے حس تھی۔ فرجاد اپنے بند پر پڑا تھا۔ کبھی وہ بے جان جسم کی طرح ساکت رہے
تھی۔ اور کبھی بے چینی سے دامن بائیں کر دیکھ بدلے لگتا۔ اس کا ذاتی ملازم دودھ کے گلاس
میں اور لٹین ڈال کر سرمانے کی میز پر رکھ گیا تھا۔ اور موسم کی خشکی دیکھ کر کھڑکیوں کے پردے بھی
اٹھایا تھا۔ کہہ سکتے تھے۔ گلی کی روشنی سے بچ رہا تھا۔ خطی مٹھری خواب کا فضا۔ کبھی فرجاد کی

آہستہ سے خواب تھیں۔

دو سفاک اور بے رحم دونوں نے جیسے اس کا خون ہی نچوڑ لیا تھا۔ آنکھوں میں اتنی سرفرازی
کہ شدت گریہ کا لگان ہوا تھا۔ چہرے کی گفتگو غائب تھی۔ اور صدوں کی مسافت کے پا
آنے والی ٹکان نے اس سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس کی رنگت میں زردی
سیاہی گھل گئی تھی۔ اور آنکھوں کے گرد ویران قبروں کی طرح کڑھے سے پڑ گئے تھے۔ جو
تھے۔

دو دنوں سے اس نے ساری مصروفیات سے غائب تو ڈالیا تھا۔ سارے کام حویلی والوں کے
کہ خود آرام کرنے کا حیلہ کیا تھا۔ اپنے ذاتی ملازم کو ہدایت کر دی تھی۔ کہ کوئی اس کی تنہا
نہ ہو۔

لیکن آصف کو جب آتے ہی اس کی خرابی طبع کا پتہ چلا۔ تو اس سے رہا کہاں جاسکتا تھا۔
نہ لباس بھی نہ تبدیل کیا اور اس کے کمرے میں چلا آیا۔

”ہلو۔“ آصف نے کمرے میں داخل ہوتے ہی مرمری ٹیوب کا پٹن دیا۔ ہوتے کما۔
”کیا بات؟“ غیرت؟“ وہ اس کے بڑے قریب آکر جلدی سے بولا۔ اس کی آواز میں
اور غلوں نمایاں تھا۔ وہ اس کی خرابی طبع کا سن کر خاصا پریشان نظر آتا تھا۔

فرجاد اٹھ بیٹھا۔ اچھے بال انگلیوں سے سلجھاتے ہوئے اس نے محسوس کیا۔ کہ اس کی کمر
جل اٹھی ہیں۔ اور رگ و پے میں سنسانا ہونے لگی ہے۔ اپنا چہرہ پتہ محسوس ہوا۔ یقیناً
بھی ہو رہا تھا۔

”کیا ہو گیا تھا؟“ میں نے کہنا تھا۔ کام تمہیں تیار کر دے گا۔ میری تو سنتے ہی نہ تھے۔“ وہ ا
دا کر ہی پلنگ کے قریب تھمکت کر بیٹھ گیا۔

فرجاد صرف مسکرایا۔

”یہ مصروفیات بھی مجبب شے ہیں۔ دو کی جگہ تین دن لگ گئے۔ مجھے تمہاری خرابی طبع
ہو تا۔ تو اسی دن واپس آ جا گا۔“ آصف نے جبکہ کمرہ بون کے کمرے کھولے بوٹ اٹارے ج
تو چپیں اوڑپاؤں سے پاؤں رگڑتے ہوئے سیدھا ہو بیٹھا۔

فرجاد نے سگریٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے ٹانگیں پلنگ کی پٹی پر رکھ دیں۔ ایک دو کش لیے اور پ
سے فرجاد کو دیکھا۔

اسے گھبراہٹ ہوئی۔ فرجاد تو اچھا خاصا بیمار لگ رہا تھا۔ دودھیا روشنی میں اس کا ٹکان نہ
اور سرخ انگارہ آنکھیں خاصی تشویش کا باعث بن گئیں۔

فرجاد نے اس کی نظروں سے بچنے کے لیے رخ قدرے موڑا۔ تکیہ دھرا کیا اور پلنگ کے چوٹی
تکیے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ آصف کے تیز رہا ہے تھے۔ کہ
وہ فرجاد کی پریشانی کا سراغ لگائے گا۔ فرجاد نے تیزی سے بمانہ تراشے کا سوچا۔

”تم خاصے پریشان لگ رہے ہو۔“ آصف نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

”ہاں۔ شاید۔“ وہ مسکراتے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

”خیر تو ہے۔“ آصف کچھ گھبرا سا گیا۔

فرجاد نے ہاتھوں پر سر کراتے ہوئے نفی میں جھنکی۔

آصف اٹھ کر پلنگ کی پٹی پر بیٹھا۔ فرجاد کو کندھوں سے کچڑا کر ہلاتے ہوئے گھبرا کر بولا۔ ”کچھ
تو کو فرجاد کیا ہوا۔“

فرجاد نے ایک گہری ہنسی آہ بھری۔ سراٹھایا۔ جلیقی آنکھوں سے آصف کو دیکھا۔ اور آہستگی
سے بولا۔ ”اس دن میں نے کہا تھا تا کہ تمہیں اپنے انتخاب کا پتا ڈال گا۔“

”ہاں۔ ہاں۔“

”وہ۔ وہ۔ مرمری آصف۔ کار کے حادثے میں مر گئی۔“

”مر گئی۔“

”آصف کے لبوں سے یہ نما آواز نکلی۔ حیرت زدہ سا وہ فرجاد کو دیکھا رہ گیا۔

فرجاد، سر ہوا رہا۔

”کیسے مر گئی۔ کیوں مر گئی۔ کیا ہوا تھا اسے۔ کون تھی وہ۔“ آصف صدرے کی زوت سے نکلے بغیر
نی باتیں ایک زبان میں کہ گیا۔

فرجاد مجروح مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے بولا۔ ”میری تقدیر کی خرابی اور کیا کہا جاسکتا ہے۔
میں بہت بد نصیب ہوں آصف۔ کار کے

ایک بیڈٹ میں وہ مر گئی۔“

آصف نے فرجاد کو سینے سے لگا لیا۔ اور اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ سکتے لمبے خاموشی رو کر آصف کے ہاتھ پہ قراری سے فرجاد کی پشت سلاتے رہے۔ دکھ کی تیز دھار اسے اپنے سینے پر اتارتی محسوس ہو رہی تھی۔ لہٰذا وہ نفسی کے لئے کوئی جملہ ذہن میں آئی نہ رہا تھا۔ فرجاد نے اس کی چھاتی سے اپنا سراگ لیا۔ جنت و جہنم۔ ان متضاد چیزوں سے بھی کبھی نہ دوچار ہوا ہے۔ فرجاد کو آصف کی چھاتی سے لگ کر وہ متضاد کیفیتوں کا ایک وقت تجربہ ہو رہا تھا۔

”کیا وہ موصوفے پر ہی مر گئی۔“

”دوب فوٹ ہوئی تھیں دن ہوئے؟“

آصف نے دھیمے لہجے میں سوال کیے۔ تو فرجاد آہستگی سے بولا۔ ”کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ“

”سلسلہ میں اب ہم کوئی بات نہ کریں۔“

آصف تذبذب کے عالم میں تھا۔

فرجاد نے نیا سگریٹ سلگایا۔ اور دھوئیں کے مرغولوں کو بغور دیکھتے ہوئے گھمبیر آواز پر بولا۔ ”تم خوش نصیب ہو آصف جسے چاہا اسے پالو گے۔ خدا مبارک کرے۔ میرے متعلق فکر ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ جو ہو چکا اسے لوٹانے پر تم قادر ہو نہ میں۔ میں سنبھلنے پوری پوری کوشش کر رہا ہوں۔ جاؤ تم بھی کپڑے بدلوا دو آرام کرو۔ میں اب تدریس ٹھیک ہوا بہت حد تک ٹھیک ہوں۔“

فرجاد کے بار بار اصرار پر آصف اٹھ کر چلا گیا۔ وہ خاصہ شکر اور پریشان تھا۔ اس کے جا کے بعد فرجاد اٹھا۔ ٹیوب لاش ہند کی اور پھر کرنل روشنی بھی گل کر دی۔

بے چین مضطرب اور پریشان وہ اندر سے میں غمناک رہا۔ آصف کو اس نے من گھڑت کہ سے مطمئن کر دیا تھا۔ لیکن اس کا اپنا آپ تیل رہا تھا۔ یہ جلیں اک سچائی تھی۔

لیکن کیا بھی کیا جائے۔

ذات کے اندر تو سب سچے ہوئے ہیں۔ اس سچائی کو جھوٹ کے لبادوں میں چھپانے کی شعور اور لاشعوری کوشش بعض اوقات مسلک بنانا ہی پڑتی ہے۔

مصلحتوں کے تقاضے بھی کیا خوب ہوئے ہیں۔

”میں ابھی شادی نہیں کروں گا فرجاد۔“

”دیکھیں۔“

”تم جانتے ہو“

”میری بد قسمتی کو اتنی اہمیت نہ دو بھائی۔“

”تم اس غمزدہ اور پریشان رہو۔ اور میں شادی رکھا بیٹھوں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔“

”چاہت کا اتنا اظہار نہ کرو کہ بیوقوف لگتے لگو۔“

جو جی چاہے کہہ لو۔ لیکن یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ کہ جب تک تم پوری طرح سنبھل نہیں جاتے۔ میں۔“

”سنبھل تو چکا ہوں۔ میں نے تو اپنا غم سینے میں دفن کر لیا ہے آصف۔“

”لیکن میں اس کی آج پھر لمحہ محسوس کرتا ہوں۔“

”اچھے حساس نہ بنو۔ زندگی دشوار ہو جائے گی۔“

”تمہاری خوشیاں میری خوشیاں ہیں۔ تمہارے غم میرے غم۔“

”اور میرا بھی یہی حال ہے۔“

”ضرور ہو گا۔“

”پھر۔“

”کیا۔“

”میری خوشی کو پورا کرو۔ مجھے خوشیاں دے دو۔“

”یعنی۔“

”شادی کرو آصف۔ اس میں میری خوشیوں کا راز مضمر ہے۔“

آصف نے کوئی جواب نہ بن دیا۔

”میں آج بابا کے پاس جاؤں۔“ فرجاد نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔

ہوا۔ باضی شیشے کی طرح دیوار ہے دوست اس کے پار ہم مل کر دیکھ تو نہیں سکتے۔ اسے لوٹا نہیں سکتے۔ پکڑ نہیں سکتے پھونک بھی نہیں سکتے۔ مستقبل آہنی دیوار ہے۔ بند بالکل بند۔ ہم چاہیں بھی تو اس کے پار جو کچھ ہے دیکھ نہیں سکتے۔ قیافہ ضرور دکھائیں ہیں، لیکن یہ بھی ضروری تو نہیں درست ہو۔ حال اور صرف حال ہماری گرفت میں ہو نہایت دوست۔ صرف اسی کے متعلق سوچو۔

آصف نے کچھ کہنا چاہا کہ فریاد کا سوا ایک دم بدل گیا۔ وہ خامے تیز دھندلے میں بولا۔

”بے کی کوشش نہ کرو۔ جب تک کل بانو کو اتنی شقت سے چاہے ہو۔ تو پھر شادی میں تاخیر نہیں ہو گی۔ میں نے پہلے بھی تمہارے کہنے پر جتن کھڑی کر دیا تھا۔“

”تمہارے دل میں گھماؤ اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ کیا ایسی صورت میں جشن منایا جاسکتا تھا۔“ آصف چڑ کر بولا۔ ”اپنی چٹائے جاتے ہو۔“

”اب تو کافی دن گزر چکے ہیں۔“ فریاد نے کش لے کر کہا۔

آصف نے بھی سگریٹ نکالیا اور کرسی میں پھیل کر کش لینے لگا۔ دونوں لاہوری سے برابر والی لشت گاہ میں تھے۔ ان دنوں فریاد نے کانٹا بننا بالکل چھوڑ رکھا تھا۔ آصف ہی مارا کام سنبھالے تھا۔ اس کی حاضری میں جس جوش و ولولے اور لگن سے فریاد نے کام کیا تھا۔ وہ سب شاید کل بانو کی لگن کا نتیجہ تھا۔ کل بانو کی دسترس سے باہر ہوئی تو جوش و ولولہ اور لگن سب ٹھنڈے پر گئے۔ پڑتے بھی کیونکر نہیں۔ فریاد نے توانا بڑا دھچکا کھایا تھا۔ یہ بھی بڑی بات تھی۔ کہ وہ اپنا خول اندر کی توڑی ہوئے سے بچائے پٹن پھرتا اٹھتا بیٹھتا اور بائیں کر تا تھا۔

دونوں کچھ دیر اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔

فریاد آصف کی شادی جلد از جلد کرنا چاہتا تھا۔ یہ آصف کو خوشیوں سے ہمسار کرنے کی لگن نہیں تھی۔ بلکہ وہ اپنے چھڑیوں سے اب بھی خائف تھا۔ فیصلے کی تیز چھری اس نے ان جذبات کے گھلے پر رکھ توئی تھی۔ لیکن خوف اپنی جگہ تھا۔ شاید کی وقت۔ کوئی دھن داغ میں سنا جائے۔ اور وہ اپنے جذبات کے ہاتھوں بیچور ہو کر گل بانو کی طلب ایسی شدت سے محسوس کرنے لگے۔ یہ خوف ہی اسے اکسار تا تھا۔ اور وہ جلد از جلد گل بانو اور آصف کو شادی کے انوثہ بندھن میں بیکڑ کر اپنے اور گل بانو کے درمیان نئے رشتے کی مضبوط قاعدہ قائم کر دینا چاہتا تھا۔

اس میں وہ کامیاب کہاں تک ہو گا۔ یہ اس نے سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ یہ مستقبل کا معاملہ تھا۔ مستقبل جو آہنی دیوار ہے۔ بند بالکل بند اور جس کے پار کیا ہے تم بھی نہیں دیکھ سکتے۔

آصف کو اس نے رشامند کر لیا۔ رشامند آس کا رواں رواں تھا۔ گل بانو کو بیشہ بیشہ کے لئے پالنے کی خوشی تو رکھی چھوڑ بن کر اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ سگریٹ بائیں پر مسکرانے

”کیوں۔“

”گل بانو کے لئے۔“

”زیادتی کرتے ہو۔ کچھ وقت اور گزر جائے تو ہرج ہی کیا تھا۔“

”اور تو گزر جائے گا تو کیا ہو گا۔“

”تم زور۔“

”مستقبل جاؤ گے۔ ہوسنہ۔ آصف میاں باضی کی فکر نہ کرو۔ مستقبل کا غم نہ کھاؤ۔ حال چلو جیو۔ اس لئے کہ باضی ازل سے مستقبل ازل وابد کے درمیان پھنسا ہوا حال کا لکھ ہی ہمارا ہوا ہے۔“

آصف نے ہراساں سی نظروں سے فریاد کو دیکھا۔ بہت الجھا ہوا۔ کھرا ہوا لٹا ہوا چھوٹا نظر آ رہا تھا۔

فریاد مسکرانے لگا۔ بھڑک مسکراہٹ بڑی گا، از قہی۔

”تم نے مرموہ کے چھوٹے کانتا“۔“ آصف۔“

فریاد کی آنکھوں میں ٹھنڈے چمک آئیں۔ ”تم سے کل بانو بچ جائے۔ تو۔“

گھبرا کر آصف نے فریاد کی طرف دیکھا۔ فریاد کھٹکھٹا کر بٹس پڑا۔ اور پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

”خدا نہ کرے کہ تم بھی چھوٹے کے عہد سے دوچار ہو۔ تمہیں دینا کی سب سے بڑی خوشی گل بانو کے روپ میں مل جائے گی۔ میری قسمت میں شاید ایسی کوئی بڑی خوشی نہ تھی۔“

”فریاد۔“

”لیکن آصف۔“ اس نے ایک گہرا سانس لینے ہوئے کہا۔ ”ہم بڑی خوشیوں کے تعاقب میں اندھا دھند دوڑتے چلے جاتے ہیں۔ جن کے ملنے کا کوئی یقین نہیں ہو۔ اس دوڑ میں ان چھوٹی چھوٹی بے شمار خوشیوں کو روک دیتے ہیں۔ جو بے شک بڑی خوشیوں کے مقابلے میں انفرادی طور پر کچھ وقت نہیں رکتیں۔ لیکن اجتماعی طور پر سکون اور طمأنینہ ضرور بخشتی ہیں۔ بڑی خوشی نہ پانے سے دکھ کا دوا اور ٹھک نہیں ہو سکتیں۔ لیکن دل کے خالی خانے پر ضرور روکتی ہیں۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“

”خود شادی کرو۔ میں چھوٹی خوشیاں سمیٹ کر اپنا دیا بحر لپٹا چاہتا ہوں۔ میں مایوسی و ناامداد سہی۔ لیکن وہ جیت بھرے دلوں کو ملا کر خوشی تو پاسکتا ہوں۔“

”کاش وہ نہ مرنے۔“ آصف روپائی آواز میں بولا۔

فریاد بٹس پڑا۔ اس کی ہنسی میں کب تھا تسخیر تھا اور خدا جانے کیا کچھ تھا۔ اس نے جھک کر میز سے سگریٹ لائٹر اٹھایا۔ اور چوڑے در کی کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر سگریٹ سلگاتے ہوئے

”گل کے بابا کے پاس کون جانے گا۔“ آصف نے نیا سرگیت اٹھاتے ہوئے کہا۔
”میں۔“

”تو۔“

”ہر جہ ہے کیا۔“

”کسی بزرگ کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ طالب ماموں یا زہیر چچا۔“

”کیا ضرورت ہے۔“

”ایسے معاملے بزرگ ہی چننا کرتے ہیں۔“

”میں مناسب نہیں سمجھتا۔ فوزی۔ راشدہ اور حلیٰ میں لینے والی لکی لکیوں کے ہوتے ہوئے یہ بزرگوار گل بانو کے حق میں کس حد تک ہوں گے میں جانتا ہوں۔“

”تم بڑے عقلمند ہو گئے ہو۔“ آصف مسکرایا۔

”توازش۔“ فرجاد نے پھینکی سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے کہا۔ ”اور ہاں آصف جب تک بابا کا پکا اقرار نہ کر لے تم اس بارے میں کسی سے بات بھی نہ کرنا۔“

”بابا ضرور اقرار کریں گے۔“

”میں بھی پریقین ہوں۔ پھر بھی احتیاطاً۔“

”بہتر۔“

آصف نے اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹکا کر سرگیت کا دھواں آہستہ آہستہ چھوڑا اور بھردھوئیں کے ہریکھ میں گل بانو کا مسکراتا چہرہ دیکھنے لگا۔

فرجاد کمرے سے نکل گیا۔ اسے آج ہی بابا کے پاس جانا تھا۔

اپنے وجود میں باپوسیوں کا بوجھ سینے فرجاد گاؤں روانہ ہو گیا۔ اس کا من ایک بار تو بیچ اٹھا۔
بنات اور سرکشی پر اتر آئے کو بجلا۔ لیکن فرجاد بڑی سفاکی سے اس من کو دیا ناپستی جا چھینا۔

جتنی کی مسجد کے بیرونی چوڑے کے قریب اس نے گاڑی کھڑی کر دی۔ اسے دیکھتے ہی ظہر کی نماز پڑھ کر نونے والے لوگ آچینچے۔ مینے بھری غیر ماضی کے بعد فرجاد آیا تھا۔ اتنا مقبول و محبوب انسان تو ایک دن کے لئے بھی نظروں سے اوجھل نہ کیا جاسکتا تھا۔

لوگ اکٹھے ہو گئے۔ محبت سے سلام کئے۔ احوال پر سی کی۔ گاؤں نہ آنے پر گلے شکوے کیے۔

فرجاد نے ہر ایک کو ملا نعت سے جواب دیا۔ اچھی طرح ملا۔ سکول کے متعلق پوچھا۔ ڈپنٹری اور ڈاکٹر کے بارے میں بھی لوگوں کی رائے معلوم کی۔ سارا کام تسلی بخش طریق پر ہو رہا تھا۔ لوگ ہاتھ اٹھا کر اسے دعائیں دے رہے تھے۔ یہ دعائیں فرجاد کو بے تاثیر لگ رہی تھیں وہ پھینکی سی مسکراہٹ لبوں پر لے رہا تھا۔ لوگ خاموش ہوئے تو فرجاد نے ہنسی کے ان مریضوں کا حال پوچھا۔ جو ہسپتال میں داخل کر دئے گئے تھے۔ اسی سلسلے میں رحمان گل کا ذکر بھی ہوا۔

”وہ تو اب ہائیں ٹھیک ہے مالک۔ صبح کی نماز پڑھنے مسجد میں آتا ہے۔ تھوڑی دیر کو دکان بھی کھولتا ہے۔“ لوگوں نے بتایا۔

”شکر ہے۔“ فرجاد نے کہا۔

”آپ کو بہت دعائیں دیتا ہے۔“

فرجاد صرف مسکرایا۔

فرجاد گھر میں داخل ہوا۔ تو بابا صحن میں دھوپ کی زد میں بڑی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ بغل میں موٹا سا گائیکو تکیہ تھا۔ جس پر پورا بوجھ ڈالے وہ چارپائی کے قریب پڑی موٹے تمباکو کی مٹی کی چھوٹی سی جلم کی منہال پر مٹی رکھے چھوٹے کھن لگا رہا تھا۔

گل بانو گھر پہ نہ تھی۔ جڑو کے بجائے کی گٹائی تھی۔ وہ اس کے باں گئی ہوئی تھی۔ فرجاد کو دیکھتے ہی بابا چارپائی سے اچھل سا پڑا۔

مصالحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے خوشی سے بکھتی آواز میں بولا۔

”آپ۔ مالک۔“ فرجاد نے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔ بابا نے پوری گرجوٹی اور شدت جذبات سے اس۔ ہاتھ دیا۔

فرجاد مسکراتے ہوئے بولا ”ٹھیک ہو گئے نا۔ خوب طاقت آگئی ہے ہاتھ میں“

بابا نے ہاتھ دھتے مکے لے جا کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے سر قدرے جھکا کر کہا ”یہ سب تمہارا تیرا بانی ہے مالک“

فرجاد مسکرا دیا۔ اس نے غور سے بابا کا سراپا دیکھا، اس کی صحت واقعی اچھی ہو رہی تھی۔ چھ فٹ کا چوڑا چمکا ہوا کس قدر کم لایا ہوا تھا۔ لیکن آج فرجاد اسے حسین بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ بابا جوانی میں کس قدر خوبصورت اور جری جوان ہو گا۔

بابا نے جلدی جلدی چارپائی پر در، بابا اور مالک سے بیٹھے کی گزارش کی۔ فرجاد بے تکلفی سے بیٹھے ہوئے بولا۔ آپ بھی بیٹھے بابا“

بابا جلم کو ایک طرف رکھتے ہوئے بیٹھ گیا۔

”کسی طبیعت رہا مالک۔ آپ تو اب ایسی چلا گیا۔ گاؤں میں نہیں آتا اب“

”آج آگیا ہوں۔“

”میرا بانی مالک۔“

”آپ مجھے بتائی ہیں کہ سکتے ہیں بابا۔“

بابا جھٹکا سا ہوا۔ غور سے فرجاد کو دیکھا۔ اور پھر یقین اور بے یقینی کے تلا میں بھٹکتے ہوئے سر کو ادھر ادھر غیر محسوس سی جنبش دی۔ ”آپ بڑا تڑپے ہے مالک“

”بابا تمہیں کتنی رفاہ کما ہے کہ میری نظروں میں کوئی جھوٹا ہے نہ بڑا۔ سب انسان ہیں۔ ایک جیسے۔ خدا۔ نہ تو سب کو ایک جیسا بنایا ہے۔“

بابا سر کو ہلکی ہلکی جنبش دے کر مسکراتے لگا۔

فرجاد نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بابا سے پوچھا۔ مگر بابا کہاں ہے نظر نہیں آتی۔“

”وہ جیو کے بھائی کی مقلد میں گیا ہے۔“

”بابا۔“

”جی مالک۔“

”پھر مالک۔“

”نہاں زیب نہیں دیتا۔“

”کیوں زیب نہیں دیتا۔ آئندہ میں تمہارے منہ سے مالک کا لفظ نہ سنوں۔“

”خدا آپ کو خوش رکھے۔“

بابا نے بڑے غلو سے یہ دعائیہ جملے کہے۔ تو فرجاد نے اک گہری سانس سی پھینکی سی مگر اہٹ لیوں پر لایا اور آہستگی سے بولا۔ ”اس دعائیں کوئی اثر نہیں بابا۔“

”جی۔“ اس کی طرف جھک کر بولا

”آں۔ کچھ نہیں۔“ فرجاد نے زبان آنکھوں اور مسکراتے ہوئے منوں سے کہا۔ ”ہاں بابا۔ وہ قدرے تو وقف کے بعد بولا۔

”جی۔“

”میں تمہارے پاس آج ایک غرض لے کر آیا ہوں۔“

”غرض مت کہو۔ حکم کہو۔ امارا جان بھی تم پر قربان۔ تم نے امارا بوت خدمت کیا۔ بوت خیال رکھا۔ ہم تمہارے احسان کا قرض دار ہے۔“

”بابا کی باتوں پر نہ جانے کے باوجود فرجاد شہ پر ا۔“

”تو پھر آج قرض چمکاؤ۔“ فرجاد جانے کیسے مسکرا رہا تھا۔

”ہم مطلب نہیں سمجھا۔“

”یہ جب فرجاد نے اسے مطلب سمجھایا تو وہ بے اختیار سا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے اور ہاتھوں کے حرکت پڑ پر ہونے کے باوجود کچھ نہ کہہ سکا۔ بابا کے لئے خوشی و مسرت کا اس سے بڑھ

اور کون سا مقام ہو گا۔ فرجاد کو اس نے بہت قریب سے دیکھا تھا اور پر کھا تھا۔ گل ہاتھ بھی اسے باندھ نہ کرتی تھی۔ اسے وہ دن یاد آگیا جب گل ہاتھ مالک کے ہسپتال میں داخل ہونے پر

بیٹھان تھیں اور اس کی بیعتی پر لگ کر سسکتا اٹھ تھیں۔ بابا کے ذہن میں یہ بات کہی آتی ہی نہ تھی۔ کہ زخمی ہونے والا مالک فرجاد نہیں آصف تھا۔

اب

جب

فرجاد نے گل ہاتھ کے لئے دست سوال پھیلایا۔ تو بابا اسے ہی گل ہاتھ کا طاب۔ بے گار کچھ رہا تھا۔

وہ گنگ سا ہو گیا۔ سمجھ نہ پایا کہ کیا جواب دے۔

”آپ اچھی طرح سوچ لیں مالک۔“ وہ صرف اسی قدر کہہ سکا۔

”پھر مالک۔“ فرجاد مسکرایا۔ ”اب تو ہم تم رشہ داری کے بندھنوں میں بکڑے جانے والے

”آپ بہت بڑے لوگ ہیں۔ گل بانو غریب باپ کی بیٹی ہے۔“ بابا رند سی آواز میں بولا۔
”سب تقدیر کے پتھر ہوتے ہیں بابا۔ تمہیں بھی تقدیر پھاڑوں سے یہاں کھینچ لائی تھی۔“

”ہاں۔“

”جو گل بانو کو یہاں سے حویلی تک کھینچ کر نہیں لے جاسکتی۔“

پھر بابا دیر تک اپنی کہ مانگی اور حویلی کی شان و عظمت کی باتیں کرتا رہا۔ اس کی باتیں دہلی تھیں۔ لیکن محبت کا اپنا وجود بھی اتنا مستحکم تھا۔ کہ سب اونچ نیچ اور طبقاتی تفریق بے معنی سی لگتی تھی۔

”اے بہت اچھا انسان ہے بابا۔ وہ گل بانو کو پیشہ خوش رکھے گا۔“

فرزاد نے لمبی چوڑی باتوں کے بعد زخمی زخمی لیے میں کلمہ تو بیاچو تک گیا۔ اس پر حیرت کا دورہ سا پڑا۔ لیکن اس کا رد عمل نیسا اچھا تھا۔ اصف کا وہ جانا تھا۔ اس کے حسب نسب سے اگلی تھی۔ اور اس بات کا بھی علم تھا کہ تینوں گاؤں جن کی ذمہ داری اصف کے کندھوں پر ہے اصف کے نہیں۔“

لیکن گل بانو؟

وہ شاید کچھ سے ہی کو تھا کہ فرجاد ہاتھ ملتے ہوئے سر ہٹکا کر بولا ”وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ بابا اور تم تو محبت کے خدا ہو کیوں۔“ فرجاد مسکرایا۔

فرزاد نے دے دے لفظوں میں دونوں کی چھات کا ذکر کیا تو بابا نے ہنسی ہو گیا۔

فرزاد اس کی تسلی و تسکینی کے لئے باتیں کرتا رہا۔ بابا کو اپنی علاقہ فنی کا خیال آ رہا تھا۔ باتوں باتوں میں اصف کے زخمی ہونے کا بھی ذکر آیا۔ بابا کو گل بانو کی طرف سے بھی تسلی ہو گئی۔
لیکن!

جذوں کی پچکان میں اس کی پرانی آنکھیں دھوکہ تو نہ کھا سکتی تھیں فرجاد کی نگاہوں میں وحل آنے والی رنگین پر چھائیاں اس نے آنکڑ دیکھی تھیں۔ وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ اس کی ذہنی کشمکش کو بھانپ کر فرزاد نے اپنی لا تعلقی ظاہر کرنے کے لئے ڈھیروں باتیں لیں۔ بابا چپ چاپ سنتا رہا۔

فرزاد نے بابا کو اتار کر کے ہی دم لیا۔ بابا کو اعتراض بھی کیا ہو سکتا تھا ہاں جب فرجاد اٹھ کر نہا لگا۔ تو بابا کے دل میں جاسے کیوں دوسرا دم۔ فرزاد نہ شی کوئی خبر نہ کر رہا تھا۔ لیکن کتنا

بابا نکل رہا تھا۔ لگتا تھا باپ کچھ دیکر اس نے اصف کے لئے بہت کچھ پایا ہے۔

واردات کا کچھ اناہی سلسلہ ہوتا ہے۔ ہم نہ بھی چاہیں تو صدیاں اپنے دعووں میں کرب کا اہر سینے لحوں میں دارو ہو جاتی ہیں۔ یہ لمبے لمبے دس لینے ہیں۔

نہیں رکھتے۔

دس لینے ہیں۔

فرجاد اپنی سوئری طرف جا رہا تھا۔ کہ سامنے سے گل بانو آگئی۔ کالے اور لال چہنٹ کے ہاڑی لباس میں اس کا روپ نرالا ہی تھا۔ وہ دوڑی ہوئی اس کی جانب آئی۔ خوشی سے مجھوم مجھوم اٹھی۔ اتنے دن اس کے نہ آنے کا گھم کیا۔ پھر پڑا میں کرتی گئی۔ فرجاد ایک لمحہ کو خوش کن خیالوں میں ڈوب گیا۔ اور شاید اسی رو میں رہ کر کہہ گیا۔

”میں بابا کے پاس تمہیں مانگنے گیا تھا۔“

”کیا۔؟“ گل بانو کی آنکھیں چھٹ جانے کی حد تک کل گئیں اپنے کپٹے منہ پر اس نے ہاتھ رکھ لیا۔ اس کے چہرے کی جھلکیں رگت پیدا ہو گئی۔

دکھ کی تیز دھار فرجاد کے من میں اتر گئی۔

وہ جلدی سے بولا۔ ”گل بانو! میں تمہارا رشتہ اصف کے لئے لینے گیا تھا۔“

گل بانو نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”ہاں گل بانو۔“ فرجاد ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

گل بانو کے دودھ میں جیسے برقعہ لہر دوڑ گئی۔ اس کے چہرے پر چھائی دھندلاہٹیں فوری کی شامیں آ گئیں۔ اس کے گل ہاتھ اٹھے۔ اور سیاہ پچیلی پچیلی آنکھوں میں چکا چوند کرنے والی روشنی بھر گئی۔ اس نے ہونٹ داغوں تلے دیا۔ اور پھر حیا کا لوہ لگا ہوں سے فرجاد کو دیکھتے ہوئے سر ہٹکا لیا۔

فرجاد خون خون دل سے اس کی ہر کیفیت کا جائزہ لیتا رہا۔ کاش گل بانو اس کا مقدر ہوئی۔ اس نے گلے دل سے سچا۔ اور پھر سر جھٹک دیا۔ لیوں پر مسکراہٹ پھیلائی اور بولا۔ ”خوش ہو نا۔“

”سچ“

”بابا مان گئے۔“

”ہاں۔“

”اللہ۔“ گل بانو نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ اور شرارتے ہوئے جھانک گئی۔

اف و اردات کا یہ سلسلہ!

فرجاد جھٹکے جھٹکے قدموں سے گاؤں کی طرف لوٹ رہا تھا۔ اسے لپ لپ رہا تھا۔ جیسے لا متعین راستے کو چھوڑ کر وہ انجانی راہوں پر بہکتے نکل کھڑا ہے۔

یہ خبر خاصی برباد تھی۔

یہاں میں جیسے کھلبلی ہی مچ گئی۔ پچھلے دہان میں رہنے والی طالبہ عیلم نے جلدی سے نچل کر آکر آدے کے گھمناؤ والے کمرے میں فوزیہ کی امی کے پاس جا پہنچی۔
”اے بہن۔ سنا تم نے کچھ۔“ وہ سانس بھٹکل بھٹکتے ہوئے بولی۔

”ایہ۔“ فوزیہ کی امی کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

”آصف کا رشتہ طے ہو گیا۔ اسے سنا۔ گاؤں کی کسی گنوارن کے ساتھ۔“ اس نے فوزیہ کی امی کو دیکھا۔

”ہاں مجھے پتہ چل گیا ہے۔“ وہ بولی۔ ”سنا ہے کوئی بچھاں ہے۔ اور بہت خوبصورت ہے۔“

”اے ہے۔ بہ تو گاؤں کی۔ میں تو حیران ہوں یہ آصف اور فرجاد کو سو جہی کیا۔“

”کوئی بڑا چھوٹا مان کے سر پر ہے تھوڑا۔ اپنے مالک آپ ہیں۔ جو جی میں آئے کرتے ہیں۔“

”رشتہ بھی فرجاد نے فوری طے کیا“

”اسی بات کا تو افسوس ہے۔ بچا ہے ہی بات کر لیتا۔ مجھ سے ہی پوچھ لیتا۔ چلو گاؤں کی لڑکی لے لیتی۔ تو کم از کم حویلی کے دو چار بزرگوں کو تو اعتماد میں لے لیتا۔“

”اچھی ہی بات ہے۔ اپنی ذمہ داری پر دونوں کر رہے ہیں۔ میں کہہ دوں مجھ نہیں آئے کی۔

یہاں کی بہار تھوڑی ہی ہے۔ اصل بات تو کردار ہے۔ تربیت ہے۔ وہ لڑکی خوبصورت ہے۔

”ہاں۔ لیکن دیکھ لیتا اس میں اور جانور میں کوئی فرق نہ ہو گا۔“

”چلو ہمیں کیا۔ جہاں ہماری بچیوں کا نصیب ہو گا ہو جائے گا شکر ہے رشتہ آصف کا ہو رہا ہے

”یہ بات نہیں۔“

”فرجاد بھی دیکھ لیتا کوئی ایسی دیکھی ہی اٹھائے گا۔ اماں بی مرحومہ کے بعد تو دونوں ہر قید و بند

سے آزاد ہو گئے ہیں۔“

”دونوں سرجوڑے ہاتھ کرتی رہیں۔ کچھ ایسے ہی چرے حویلی کے غلے میں رہے گا خاندان میں ہو رہے تھے۔ مطلوب بچا تو خاصے غصے میں تھے۔ بی بی جانی نے انہیں سمجھایا۔ اپوزیشن کا احساس دلایا۔ ”کیوں ان کے منہ کو آتے ہو۔ حویلی میں سر پھپھائے بیٹھے ہیں اتنا ہی ہے۔ باگ ڈور اب ان دونوں کے ہاتھ میں ہے۔ چپ چاپ کئے جاؤ تماشا۔“

فریاد کی آواز بھی سراواں بیٹھی کچھ ایسے ہی دل جلے الفاظ کہہ رہی تھی۔

”اپنی بچیاں کسی سے کم تھیں۔ حسن طریقہ کیلئے کبھی نہیں تھا ان میں۔“ آیا فریاد کو بالکل طرح جانتی تھی۔ ”آہنگی سے بولی۔“ اس نے بلاسوے سمجھے قدم نہیں اٹھایا ہو گا۔ اس کی پسند اور ٹھنی ہوتی ہے۔ آصف کے لئے جس لڑکی کو اس نے پسند کیا ہے۔ یقیناً وہ کوئی نایاب شے ہے۔“

”اے اس نے کیا پسند کرنا تھا پسند تو آصف کی ہو گی۔“

”جو کچھ بھی ہے۔ آصف بھی بڑا سلجھا ہوا لڑکا ہے۔“

اور

حویلی کی نوجوان امیدوار لڑکیوں تو جیسے یہ خبر قریب تک گری تھی۔ ان کے چہرے لٹک رہے تھے اور آنکھوں کی روشنیاں کچھ دھندلا گئی تھیں۔ اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں بھٹکتے رہا نوجوانوں کے لئے بھی یہ رشتہ ایک موضوع بن گیا۔ شہری کچھ چونہ تہذیب کی طرف بھٹکتے لیکن وہ لے گاؤں کی دوشیزکی وقت و قدر نہ تھی۔ وہ آصف اور فریاد کے مشترک فیصلے پر حیران و شرمکے بڑے سے بڑے گھرانے سے انہیں رشتہ مل جاتا۔ ڈاکٹر باقری کا سجادہ دار۔ بیٹھ یو فبر پاتی اور کتنی بڑے بڑے لوگوں کی بیٹیاں تھیں۔ جدھر بھی اشارہ ہوتا رشتہ ناممکن نہ ہوتا۔

کچھ مہینے تو گل بانو کو دیکھنے بہتی بھی جا پہنچے تھے۔ وہ تھی کیا تے جس کے لئے شہزادہ حویلی لڑکیوں کو نظر امراہ از کیا تھا۔ اور تے بیالانہ کے لئے زور و شور سے تیاراں شروع ہو گئی تھیں۔ فریاد اس تیاراں میں یوں جیش جیش تھا۔ جیسے وہ آصف کی ماں ہو یا پ ہو۔ اور سادہ دار کی اسی کے سر آسن پڑی ہو۔ پیسہ سے دریغ خرچ کر رہا تھا۔ گل بانو کے لئے بیش قیمت لباس بنا رہے تھے۔ سنے پائے زینرات اکٹھے کر رہا تھا۔ اور بیچنے کی منزل کے چار کرے گل بانو کے مختص کر کے ان کی تراش و زیبائش کی جارہی تھی۔ یا فریاد فریاد کیا تھا۔ قاتلین پر دسے آقا محمدان ہر چیز قیمتی اور نایاب تھی۔

بلکہ عروسی فریاد نے اپنی نگراں میں سمجھایا۔ گلابی اور سرخ رنگ کے استراج سے کمرے کی کھڑکی کی گئی۔ چمکتا ہوا اور خواتین قاتلین سرخ رنگ کے جھللاتے چالی کے کاندھانی پر دوں والی مسری لباس کھڑکیاں۔ ریشمی سروسرا تے پردے۔ دیوار گیر نایاب بینگنر۔ پتھر کے خوبصورت گلدان۔ قاتل کے ہاتھ پر عورتوں کے جھمبے۔ ہلکی ہلکی سرخ روشنی کے غبار میں ہر چیز بڑی جذبات انگیز تھی۔ گل بانو تک خوشی کا مظہر تھا یا فریاد کے خون دل کی علامت۔ بہر حال جلد عروسی اتنا خوبصورت تھا کہ قاتل خود بخود چل جاتے تھے۔

فریاد کی گنگن اور شوق آصف کو معرب کر رہا تھا۔ وہ بے شک اس کے بڑے بھائی کی حیثیت سے رہتا تھا لیکن پھر بھی ذہن میں ایک حد فاصل ضرور تھی۔ اور اب جب فریاد نے گل بانو کی ہنر سے حد درجہ صرف کیا تھا۔ یہ حد آصف کو آکسارہی تھی کہ وہ فریاد کو بے دریغ پیسہ لانانے سے منع کر دے۔

اس دن فریاد اماں کی کے محفوظ کئے ہوئے زیورات کا چاندی کا صندوق کھولے بیٹھا تھا۔ یہ زیورات قیمتی اور نایاب تھے۔ کچھ چیزیں تو ایسی تھیں۔ جو اس خاندان میں نسل در نسل منتقل ہوتی آئی تھیں۔ کلائی بند۔ گنگن چوڑیاں۔ گلو بند۔ بار۔ ست لڑی بالائیں۔ دیکھتے جاتے کیا کچھ تھا۔ کچھ کی بھی چیزیں تھیں۔

فریاد نے ساری چیزیں ہڈ پر پھیلا رکھی تھیں۔ اور گل بانو کے لئے انتخاب کر رہا تھا مٹی ڈیہ۔ یا ڈیہ یا ڈیاب انگوٹھی بھی تھی۔ جو اس خاندان کی ہر پہلی ہو کہ ملتی تھی۔ اصولاً یہ اب فریاد کی کے لئے تھی۔

لیکن

فریاد نے یہ انگوٹھی گل بانو کو دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس سے زیادہ عزیز اور کون ہو سکتا تھا۔ اماں یا اماں تو تقدیر کے مسئلے ہیں۔ لیکن دل میں خود وہ بیلوں کی طرح آگے اور پیچھے محبت کو کون ٹھکانا پویک سکتا تھا۔

بھی کبھی تو فریاد سوچنے لگتا کہ وہ کتنا بڑا منافق ہے۔ اس کے دل میں جو کچھ ہے۔ اس کے لئے اٹھارہ لاکھ روپے۔ یہ سب تیار وہی گل بانو کی گنگن میں کر رہا ہے۔ لیکن آصف کو یہی تاثر ہو گا کہ وہ سب کچھ اس کے لئے کر رہا ہے۔ سب یہی سوچتے ہیں۔ سب یہی جانتے ہیں۔ کیا یہ بات نہیں؟

زیادہ پھیلائے بھی وہ کچھ ایسی ہی سوچوں سے دوچار تھا۔ تصور کی آنکھ سے ان زیوروں میں

لدی پھندی گل بانو کو دیکھ کر ہاتھ گل بانو جو چہرہ میں کے چاند سے بھی زیادہ حسین تھی۔

آصف کسی کام سے ادھر آ نکلا۔ زیور کو دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ فرجام ان کا انتخاب کر رہا تھا۔ ہوا اچھا تھا۔ اس نے فرجام کو باز رکھنے کے لئے بات کرنا چاہی۔

”سب املاں کی کی امانت ہیں فرجام“ بیڈ کے دوسری طرف بیٹھتے ہوئے آصف نے کہا۔

”میں جانتا ہوں۔“ اس نے ایک بڑا کوٹنگن اٹھا کر بے کما۔

”یہ سب انہوں نے تمہاری دلس کے لئے رکھے تھے۔ انہیں لی اٹھال ڈیپ ہی میں بند کرنا“

”یہ سب گل بانو کے لئے ہیں۔“

”فرجام!“

”تمہیں اس سے کیا۔ میرا جو جی چاہے اسے دے دوں۔“

”کوئی کام بھی ہوئی چاہئے۔ تم نے کافی زیور بنوایا ہے۔ وہی کافی ہے یہ زیورات تمہاری ہوا

کی امانت ہیں۔“

”میری دلس اب آنے سے دی۔ یہ سب کچھ گل بانو کا ہے۔ حتیٰ کہ یہ انگوٹھی بھی۔“

”نہیں فرجام۔“

”کیوں نہیں۔“

”یہ روایت کے خلاف ہے۔“

”گل بانو اس خاندان کی پہلی بیوہ ہے۔“

”لیکن فرجام۔ لیکن فرجام۔ وہ جو تمہاری بیوی ہو گئی ہے یہ انگوٹھی ملنا چاہئے۔“

”فرق کیا پڑتا ہے۔“

جب آصف نے مزید اصرار کیا۔ زیور ڈیپ میں رکھنا چاہے۔ تو فرجام نے اس کا ہاتھ بری ہوا

جھٹک دیا۔ اس کی آنکھوں میں غصہ کی کیفیت تھی۔ ”تم میری خوشیوں میں کیوں حارج ہوتے ہو،

”یہ بات نہیں۔“

”تو پھر کیا بات ہے۔“

”گل بانو کے لئے اتنا زیور کافی ہے۔“

”گل بانو کے لئے یہ سارا زیور بھی نا کافی ہے۔“ فرجام نے بیڈ پر بیٹھ لیا ہوا زیور ہاتھوں میں

اٹھ کر تھوٹے ہوئے کہا۔

اور جس انداز میں اس نے بات کی۔ آصف نے چونک کر اسے دیکھا اس کے ذہن میں

واہ۔ سالہا سال کی باتیں اس کے ذہن میں گھڑے ہو گئیں۔ گھبرا کر اس نے فرجام کو دیکھا جو زیور کو

لوٹا۔ اس نے بھرے ہاتھ چیر جانے والی حسرت سے انہیں تک رہا تھا۔

واہ۔ تو اہم اور بانیہ زور میں ہم سے بھی کہیں زیادہ طاقتور ہوتا ہے اک لمحے میں کباد دنیا میں

فرس نہیں ہو جاتی ہیں۔ کھنڈروں کی اور دنیا کے سوا کچھ باقی نہیں بچتا۔

”کیوں فرجام گل بانو سے محبت تو نہیں کرتا۔“ یہ واہہ ذہن میں دیکھتے ہی اس کے ذہن میں

لہجہ خیر پھل سی گئی۔ لیکن فرجام کی محبت اور اس پر قربان ہونے والی لگن نے آسمان گریہ بات

کی تھی۔ تو وہ فرجام کے لئے قربانی دینے کی ہمت رکھتا تھا۔ وہ اس کی خاطر یہ سمجھ کر سکنا تھا۔

”فرجام۔“ اس کے یوں سے بے اختیار نکلا۔

فرجام نے سرخ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا۔ شاید وہ بھی موقع کی نزاکت بھانپ گیا تھا۔

ہاتھ کی پن میں چرے سے نقاب سرک گیا تھا۔ اس نے جلدی سے چرے پر نقاب کا نقاب چایا۔ اور

”کیوں۔“

”ایک بات پوچھوں۔“ وہ سنجیدہ تھا۔

”ایک نہیں سو پوچھو۔“ فرجام زیور صندوق سے ڈالے ہوئے اس کی نظروں سے کھٹانے

لگا۔

”راج مانا ہو گا۔“ آصف کا لہجہ سیاٹ تھا۔

”تم سے کبھی جھوٹ بولا میں نے۔“ فرجام نے اکٹھے اکٹھے الفاظ میں کہا۔

”کبھی بولا نہیں تھا۔ لیکن اب بول رہے ہو۔“ آصف سختی سے بولا۔

”آپنا مطلب؟“ فرجام برابر میں رہا تھا۔ اب اس نے چرے پر نقاب پوری طرح سجالیا تھا۔

”نہت کے تیرے روی تھے۔ اس نے گردن گھٹا کر فرجام کو دیکھا اور بے اختیار بولا ”تم گل بانو

کو کرتے ہو۔“

اب میں فرجام کا بھرپور تھپہ آصف کے منہ پر تھا۔ آصف گنگ ہو گیا۔ فرجام خوشنوار نظروں

کا ایک کھینٹ لگا۔

”تم نے۔ تم نے اتنی بڑی بات۔ اتنی آسانی سے کیوں کہہ دی۔ کیوں کہہ دی۔ کیوں کہہ

دی۔“ فرجام گھٹ جانے والی آواز میں کہتے ہوئے رستہ داری سے اپنے ہاتھ مسٹے ہوئے بولا۔

واہ۔ اپنی موت آپ مر گیا۔ تپائی دیرانی اور خونریزی کا خدشہ ٹل گیا۔ آصف کو اپنی بات کا

لہجہ آسانی انہوں بھی وہ مہذبہ آواز میں بولا ”مجھے معاف کر دو فرجام۔ میں نے تمہیں غلط

مجھے گناہ کیا ہے۔“

فرجاد تیز سانس لے رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو برابر مسل رہا تھا۔ آصف نے بے اختیار کرا سے سینے سے لگا لیا۔ ”میں گناہگار ہوں۔ میں نے تم پر شک کیا۔ تمہارے بے لوث جذبات تو ہیں کی۔ مجھے معاف کر دو۔ میرے بھائی۔ میرے دوست۔ میرے بھائی۔“
آصف کا دل بھر آیا۔ اس کی آواز روٹتی ہو گئی۔ شدت جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے فرجاد کو سینے سے لگائے رکھا۔

فرجاد کا درد بھی ٹپکل گیا۔ اس کی خوبصورت مہری جمیل ایسی آنکھوں میں تلاطم جم گیا۔ وہ دیکھی لمبے میں بولا۔ ”مجھے معاف کرنا آصف میں نے تم پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے نہیں کرنا چاہئے تھا مجھے معاف کر دو۔“
دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ آصف خوش تھا کہ اس کا وہ بے بنیاد تھا۔ اور فرجاد مملکت میں تھا۔ کہ اس نے کتنی کامیابی سے ہروپ بھرا ہے۔ مصلحت کا یہی تقاضا تھا۔

شام کی ساتویں دھن کے چہرے کا نکھار ماحول میں مکمل رہا تھا۔ مغربی افق پر ابھی تک شفق کی ادلی تھی۔ فضا میں نکلی پڑھ گئی تھی۔ اور گاؤں کے کچے مکانوں سے دھواں اٹھ کر تحلیل ہو رہا تھا۔ دھواں گھر گھٹکانوں پر اچھکے تھے۔ پندرہ سو برس کے لئے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے۔
مہربان سے پار گھاس کے قدرتی میدان میں جہاں اونچے اونچے گھنیرے سایوں والے درخت پانچ کا احاطہ کئے اس کی خوبصورتی میں قابل قدر اضافہ کر رہے تھے۔ اور جہاں کہیں کہیں کانٹے والے پتھر سبز گھاس میں پڑے تھے۔ کہیں چھوٹے چھوٹے اور کہیں بہت بڑے بڑے۔ اور جہاں ٹھوڑی الٹی لڑو شیراز میں چاندنی راتوں میں گداہا لیتی تھیں۔ آصف گل بانو کے انتظار میں کھڑا تھا۔
شادی میں چند دن باقی تھے۔ شاید اسے یوں گل بانو سے اب ملے نہیں آنا چاہئے تھا۔ لیکن مہربان نے وہاں اب اس کے بس کا روگ نہیں رہا تھا۔ اور یوں بھی وہ آج گل بانو کو سزا دیتی تھی۔ کیونکہ وہ بے

بے گناہ تھا۔

نہیں بانو ان دنوں مسرور و مسرور سے تربیت پارسی تھی۔ فرجاد ہی نے یہ بندوبست کیا تھا۔ گل بانو کو اپنی لڑکی تھی۔ تہذیب نا آشنا۔ بولنے چالنے اچھے چھٹنے کے شہری آداب سے بھی واقف نہ تھی۔ نہ تو چوٹی کی ہویں کرنا تھا۔ چوٹی والوں کے رکھ رکھاؤ کی تو دور دور دھوم تھی۔ فرجاد نہیں ہاں تھا کہ گل بانو پر کسی طرف سے بھی اعتراض نظر پڑے۔ گل بانو کی زبانت سے اسے آگاہی تھی۔ مسرور و مسرور سے بھی اس نے تاکید کر دیا تھا۔ مہینے بھر میں اسے بہت کچھ سکھانا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ گل بانو بہت جلد سب کچھ سیکھ لے گی۔ اب تک وہ نازا شیدہ میرا تھی۔ بہرے کی اصلی قدر و قیمت تو تراش فراش کے بعد ہی ہوتی ہے۔

آصف ہمہ شوق اس کی راہ تک رہا تھا۔ حسن تو ہر رنگ میں حسین ہوتا ہے۔ گل بھی یقیناً

ساڑھی میں سرپا قیامت ہوگی۔ مسز جوزف کل شام اس کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قریب بھی تو ملتا رہی تھی۔ اس کی تعریفوں ہی سے آصف بے تاب ہوا تھا۔ اور مسز جوزف سے ہی گلے ملنے کی فرمائش کی تھی۔

درختوں کے گھنیرے سے سایوں تلے وہ آتی دکھائی دی۔ آصف کا دل اچھل کر طلق میں آ کر فوراً شوق سے بے تاب ہو کر وہ اس کی طرف بڑھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی فیوڈی ساڑھی میں لپٹی چلی آ رہی تھی۔ گھنے گئے سیاہ بالوں کا بڑا سا جوڑا اس کی گردن پر تھا۔ جس سے وہ گردن خاصا اکڑاؤ محسوس کر رہی تھی۔

نئے روپ میں گل بانو اک نئی قیامت تھی۔ آصف نے رک کر اسے سر تپا دیکھا۔ سیاہی و فیوڈی ساڑھی۔ کلائیوں میں کالج کی خوبصورت چوٹیاں کلاں میں لکڑاں آویڑے۔ کام کا خوبصورت شاکل۔

”گل۔“ آصف بے تابانہ ہاتھ پھیلاتے ہوئے اس کی طرف بڑھتا۔

اور

خلاف توقع خلاف محمول گل نے منہ پھلایا غصیلی نظروں سے اس کو دیکھ کر رخ قدم موڑ لیا۔

”گل۔“ آصف چند قدم اور آگے بڑھا۔

وہ کچھ نہیں بولی۔ اس کی طرف کمزور موڑ کھڑی ہو گئی۔ آصف نے اس کے کندھے پر ہاتھ دیا ہوئے اسے پیار سے پکارا۔

”گل بانو۔“ وہ اس کے انداز سے گہرا گہرا گھوم کر اس کے سامنے آیا اور اس کی ٹھوڈی ہاتھ آویچی کرتے ہوئے دوبارہ پکارا۔

”کیا بات ہے گل۔“ اس نے پھر پوچھا۔

”میں تم سے نہیں بولتی۔“ وہ ادا سے دلربائی سے بولی۔

”کیوں۔“ آصف کی گہرا ہٹ دور ہو گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔

”بس۔“ وہ روٹھ گئی۔

”بھئی کیا ہوا۔“ کچھ کمزور سہمی۔ آصف گریٹ ہوٹلوں میں دبا کر لا کر جلاتے ہوئے مسکرا کر

وہ صرف گھورتی رہی۔

”کیا ہوا۔“ کیوں ناراض ہو گل۔ دیکھو تو آج کتنی حسین لگ رہی ہو۔ مجھے اپنا نیا لباس دیکھو

وہ۔“ آتے ہی غصے میں بھر گئی۔ ”آصف گریٹ کا دو حواں اس کے چہرے پر چھوڑتے ہوئے بولا۔
”دیکھ لو۔“ اس نے دونوں ہاتھ کھلے چھوڑ کر آصف کے سامنے تن کر کھڑے ہوئے۔

کہا۔

آصف اس کے غصے کی وجہ تو کچھ نہ پایا ہاں اس کے انداز پر اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

”کتنی اچھی لگ رہی ہو گل۔“ ڈرنا ہوں تمہیں میری نظرنہ لگ جائے۔“

”ویسے تو تمہیں نہیں اچھی لگتی تھی نا۔“

”کیا؟ کیا؟“

”میرے کپڑے تمہیں پسند نہیں تھے۔ میری باتیں تمہیں اچھی نہ لگتی تھیں نا۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو گل۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ مجھ سے نہیں یہ مصیبت پسنی جاتی۔ گل نے ساڑھی کی طرف اشارہ کر کے جس بھونپن سے کہا آصف کو بے اختیار پیرا آ گیا وہ ہنس پڑا۔

”تو یہ بات ہے جناہ کے غصے کی وجہ اب پتہ چل۔“

”آخر تم مجھے برائیا کیوں چاہتے ہو۔ ایسے نہیں قہمی نا اچھی لگتی؟ اسی لئے نا۔“

”پاگل کیسں گی۔“

”ہاں پاگل ہوں۔ ایک اس مس صاحب کو میرے سر پر بٹھا رکھا ہے۔ ہر وقت سبق ہی سکھاتی پڑھاتی رہتی ہے۔“ اٹھنے یوں ہیں۔ بیٹھنے یوں ہیں بات ایسے کرتے ہیں ساڑھوں مارتے ہیں۔

جیسے مجھے تو پتہ آتا ہی نہیں۔“

”تمہیں سب کچھ آتا ہے گل یہ بات نہیں۔“

”تو کیا بات ہے پھر۔“

”بات۔ بات۔ آں۔ بات یہ ہے۔“

”بات یہ ہے۔ کہ تم زمانائی گوانارن کو شہری طور طریقے سکھانا چاہتے ہو۔“

”زمانائی گوانارن کا لفظ استعمال کر کے تم اپنے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔ گل مسز جوزف کو تمہارا استانی بتانے کا مقصد تو نہیں۔ ویسے حویلی کے کچھ اپنے آداب ہیں۔ ان کی تربیت کے

لئے ایسا کرنا پڑا۔ تم عذریہ حویلی کی بون رہی ہو۔“

”تم ڈرتے تھے کہ میں حویلی جا کر میں ان پڑھ جاہلوں کی طرح رہنے لگی تو تمہیں شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔“

آصف پیار بھری حیران نظروں سے اسے دیکھ گیا۔ گل بانو کی انا کا مسئلہ تھا۔ اور انا کی نہیں تو اس نے بھی گوارہ نہ کی تھی۔

”نہیں تو ہر بات منوں میں سیکھ لیتی ہوں۔“ وہ جیڑھے میں بولی سب باتیں بھی خود بخود ہی آ جاتیں۔ اب مجھے بہت برا لگا ہے۔ تم مجھے حوصلے کے لئے پہلے دل دینا چاہتے ہو۔ اس کا تو یہی مطلب ہوا۔ کہ پہلی گل بانو تمہیں اچھی نہ لگتی تھی۔“ وہ بڑبڑا لے گئی۔

”گل۔“ آصف کئی لمحے اس کی اوٹ پٹانک سینے کے بعد سنجیدگی سے بولا۔ ”یہ تمہارے ذہن میں کیا بات سامنے ہے۔ تم میرے لئے کیا ہو یہ تو ابھی طرح جا بھتی ہو۔ رسی حریت دینے کی بات۔ تو اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے لئے تم ہی سب کچھ ہے۔ تم۔ جو صرف گل بانو ہو۔ دیہاتی یا شہری کا لیبل اس پر چسپاں نہیں۔“

”تو چھوڑ۔ یہ۔“

”یہ سب کچھ فرجاد نے کیا ہے۔“

”کیوں۔“

”وہ چاہتا ہے۔ حوصلے کی پہلی ہمو۔ حوصلے کے آداب سے نا آشنا نہ رہے۔“

”ہو نہ۔ برا آیا حوصلے کے آداب سکھانے والا۔“

”نہ نہ نہ۔ گل۔ فرجاد کے متعلق ایسی بات نہ کہو۔ وہ ہمارا سچا دوست ہے۔ بہت پیارا اور عظیم انسان ہے۔ تم اسے اچھی طرح جانتی ہو۔ تمہارے بابا کے لئے اس نے کیا کچھ نہیں کیا۔ اور اب میرے لئے وہ کیا کچھ نہیں کر رہا۔“

”وہ تو ہے۔“ گل بانو کھینچی ہو کر بولی۔

آصف اسے ساری باتیں بتاتے لگا۔ شادی کی تیاری جس خوش و خروش سے وہ کر رہا تھا۔ جس پیار سے اس فریضے کو سرا انعام دے رہا تھا۔ سب کچھ اسے بتایا۔ وہ مرعوب و متاثر نظر آنے لگی۔

”میری طرح فرجاد کو بھی تمہارے دیہاتی ہونے پر اعتراض ہے نہ۔ تمہارے نا آشنا ہونے کی فکر۔ یہ سارا اہتمام تو اس نے محض حوصلے والوں کے لئے کیا ہے۔“

”حوصلے والوں کے لئے۔“

”ہاں گل۔ میں جیسے بتا دوں۔ کہ میرے اور فرجاد کے علاوہ حوصلے کا کوئی فرد بھی ہمارے اس بندھن پر خوش نہیں۔ لوگ حاسد ہیں۔ برا بھلا کہنے میں پیش پیش ہیں۔ فرجاد نہیں چاہتا۔ کہ وہ

لوگ تم پر کسی قسم کا بھی اعتراض اٹھائیں۔ اسی لئے اس نے مزبور جو ف کو تمہاری حریت کے لئے مقرر کیا ہے۔ یہ کوئی بری بات نہیں گل۔ جس میں نئی زندگی کی قدم رکھنا ہے۔ فرجاد نہیں چاہتا کہ تمہیں کسی قسم کی کوئی بھی دشواری پیش آئے۔“

بات گل بانو کی سمجھ میں آئی تھی۔ وہ سرکاشائی انداز میں دھیرے دھیرے جھنجھ دیتے ہوئے مسکرائے گئی۔

”فرجاد جو کچھ ہمارے لئے کر رہا ہے۔ شاید سکا بھائی بھی اتنا نہ کرنا۔“

”تو۔ تو وہ تمہارا سکا بھائی نہیں۔“

آصف نے گل کی چراگئی کو دور کرنے کو اپنی ساری رو دکاؤ مختصر نظروں میں اسے سناؤالی۔ وہ جھرجھرائی ہوئی تصویر کی طرح تجلی ستی رہی

”چھوٹے مالک واقعی فرشتہ ہیں۔“ وہ عقیدت سے بولی۔

آصف ہنس کر بولا۔ ”اب بھی چھوٹے مالک ہی کو مگی اسے۔“

”برا مالک؟ معصومیت سے اس نے فوراً کہا۔“

”گل۔“ آصف نے پیار سے اس کے گل کے انگلیوں سے چھوا۔ ”بڑا مالک نہ چھو۔“

بھائی جان۔ وہ۔ میرا بھائی ہے۔“

”میں انہیں گل لالہ کہا کروں گی۔“

”اچھا لفظ ہے۔“

”بہت اچھا۔ بہت پیارا۔ بابا کے ویس کی لوکیاں بھائیوں کو پیار سے گل لالہ کہا کرتی ہیں۔ میں بھی انہیں گل لالہ کہا کروں گی۔“ وہ پیار سے بولی۔ آصف مسکرائے لگا۔

”ہوں۔ غصہ گلہ دور ہو گیا اب تو۔“ آصف نے اپنے چہرے میں ہلکے سے شرم لہجے میں کہا۔

”ہاں بالکل ٹھیک۔“ وہ کھل اٹھی۔

”تو اٹھو۔ مجھے ساڑھی میں چل پھر کر دکھاؤ۔“

”گل بانو اٹھا کر ایک دم اٹھی۔ تو اونچی نیل کے سینڈل پر اس کا پاؤں اٹھنے لگا۔ لہرا کر اس نے ہاتھ پھیلائے۔ آصف نے لپک کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔“

”دل ہو تو ایسا۔“

”دوستی ہو تو اس طرح۔“

”احسان کوئی یاد رکھتا ہے۔“

”بہت عظیم انسان ہے۔“

”انسان کہاں فرشتہ ہے فرشتہ ہے۔“

لوگ کوک سیون اپ پتے پاتیں کر رہے تھے اور روشنیوں سے چکاچوند ماحول میں اپنا اندھیرا بن لے کر چلا یہ باتیں سن رہا تھا۔ مسکرا رہا تھا۔

لین

یہ باتیں اسے خوشی دے رہی تھیں نہ تسکین۔ بلکہ اس کا ضمیر اسے بار بار اپنا احساس دلایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب انتہام اس نے اُسے اُسے کے لئے نہیں کئے۔ اس نے اپنی بھرنی محبت کے لئے کئے ہیں۔ گل بانو کے لئے کئے ہیں۔

گل بانو۔ یہ پتلے سے کہیں زیادہ شدت سے وہ چاہنے لگا ہے اور جسے اپنے ذہن سے نکال دیتا ہے وہ کوشش کے باوجود کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ اس پر قاری نہیں۔ وہ بے بس ہے۔

بال کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ دو پہلی بیٹھی تھی۔ جس پر نظریے ہی سرخی اور چمک کا احساس ہوتا تھا۔ وہیں حویلی اور مہمان عورتوں میں گہری گل بانو دین میں بیٹھی تھی۔ خوبصورت مہمان بھل کر لباس اور جگہ کے زورات تو اس کے حسن میں اضافہ کرتے تھے۔ لیکن حسن تو انسان اس کی آنکھوں میں اترنے والے خسار سے ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی بند بانی کجیت سے رہا تھا۔ اس کے قریب ہی اُسے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بار بار گل بانو کے سینہ پر چرے نہوس رہی تھیں۔ گل بانو نظروں کے لمس سے سرخ ہوتی جا رہی تھی۔

انسانے کے بعد رقص و موسیقی کا پروگرام تھا۔ ملک کے بونے کے فنکار مدعو تھے۔ لوگ اپنی اپنی نشستوں پر ہم کر بیٹھ گئے تھے۔ فن کا جادو جاگنے لگا تھا۔ ماحول پر سازندہ کیفیت جاری تھی۔ ناگ بھڑ بھڑ کر داد دے رہے تھے۔ فن کاروں کی گرفت لوگوں کے دلوں ذہنوں اور روحوں پر تھی۔

اس وقت شاید رات کا بیڑھ بچ رہا تھا۔ جب شیشہ چورہری سے حاد بیلا کے خوبصورت گانے پر غصہ کیا۔ ساز و آواز کی سنگت میں غنیمت کا لہر سن لیتا ہوا خوبصورت بیکرنگتوں کا مرکز تھا۔ اسے اپنے فن میں کمال حاصل تھا کہے راگ کے ساتھ اتنا زیادہ ذہب رقص پیش کرنا اسی کا کام تھا۔ اک ”مناخو رقصاں تھا۔ اک روشنی تھی جو دائروں اور نیم دائروں کی صورت میں تحریک رہی تھی۔ ان کیفیت تھی جو دلوں کو گرا رہی تھی۔ اک سرود تھا۔ جو رگ و پے میں اتر رہا تھا۔

حویلی دین کی طرح آرام ستھی۔ رنگ برنگی جھنڈیوں اور نیلے پیلے جھنگے سے قہقروں کے جال حویلی کے در و دیوار پر پھیلے تھے۔ صبر و رواؤں سے روشنیوں کا بھومر تھا۔ حویلی پہلی ہی قہقروں میں اک شان فاختہ سے سر ملنے کے تھی اب اس آرائشی و زیبائشی نے تو دور دور تک دھوم مچا دی۔ میلوں سے اس کی روشنیوں کی جھلکائیں نظر آتی تھیں۔ اور لوگ دور دور سے اس کی جہاوت دیکھنے کو آتے تھے۔

ہر طرف روشنیوں کے ہالے تھے۔ سرخ سپید اور رو پہلی جھنگائیں تھیں۔ پودوں، درختوں اور شاخوں میں قہقروں سے چکاچوند پیدا ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ صحن روشن تھے۔ طویل راہداریاں روشن دن کی طرح جھلک رہی تھیں۔ برآمدوں میں مختلف زاویوں سے نور کا انعکاس بہت بھلا لگتا تھا۔ ارغوانی تالیوں پر روشنیوں لوٹ رہی تھیں۔

جشن بال کی خوبصورتی تو منہ نہ تھی۔ فرجاد کی مہنوں کی کاوش کا نچوڑ دیکھنے والوں کے لبوں پر تھیں۔ تعریف خود بخود رہا تھا۔ ہر طرف چمک دمک تھی۔ گل بانو کی روشنی تھی۔ رنگ و بو تھے۔ سرسراہٹیں تھیں۔ خوشبوئیں تھیں۔ گل بانو تھی۔ جانے کہاں کہاں سے چپرس لائی گئی تھیں۔ خاص کر بے سوچی بھول۔ جو جگہ جگہ گھڑائیوں میں مسکرا رہے تھے۔

بال میں خوب روشنی تھی۔ لوگ ہنس رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ فرجاد بھی مدعو کرنے میں کسی کو بھلا نہیں پایا تھا۔ اسنے لوگ تو شاید عالی نور محمد زندہ ہوئے اور فرجاد کی شادی کرستے جب بھی مجمع نہ ہوئے۔

لوگ فرجاد کی تعریفیں کرتے ہوئے یہی کہہ رہے تھے۔ حویلی کی تاریخ میں ایسی شاندار شادی پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔

فرجاد نے پانی کی طرح پیسہ بھایا تھا۔

دن رات ایک کر کے کام نہ تھا۔

لگوں اور دلچسپی کا عظیم مظاہر کیا تھا۔

ایک سوئے پر فریاد بھی یہ رس دیکھ رہا تھا۔ حار ہوا کی جاو بھری آواز اور شینہ کا
 بدن ۔۔۔ ناگہی شعلہ تھا کسی بجلی کی روشنی ہوئی روشنی بھی ہوتا ہوا نور۔ کبھی ساکت ہو جاتا
 ش میں آجاتا۔ کبھی لپک لپک رہتا۔ کبھی ٹھنک جاتا۔ ذوق کی تسکین کے لئے اچھا سا لپا
 سب لوگ گہرے کی صورت پیش تھے۔ کرسیوں صوفوں کے رخ انداز سے موڑ لئے
 تھے۔ کچھ لوگ قائلین پر ہی بیٹھ گئے تھے۔ کچھ جسم کی ہر جنبش کو قریب
 دیکھنے کے متنی تھے۔ حامد بیلا کا ایک پل فرجاد کے حسب حال تھا۔ پل درج تک میں شکاف
 گیا۔ فرجاد نے بے ساختہ سنج کی طرف دیکھا۔

لیکن

سینچ خالی تھی۔ وہاں آصف تھا نہ گل بانو۔ انہیں گہرے والے لوگ بھی وہاں نہیں
 سب شینہ کو کھینے ادھر آگئے تھے۔

فرجاد نے چاروں طرف نگاہ والی آصف اور گل بانو کیوں نہ تھے۔ اس نے ساتھ
 طاہرہ پائی سے پوچھا۔

”آصف اور گل بانو کہاں ہیں۔“

بھائی خالد اس کی سادگی پر سبے ساختہ ہنس پڑی۔ برابر بیٹھی زلیخا خاتون کے خوب کار اور آنکھ
 سے خورج اشارہ کرتے ہوئے پھر ہنس پڑی۔ فرجاد کچھ نہیں سمجھا۔

تو

وہ اس کے ہاں میں سرگوشی کرتے ہوئے کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔ ”... گئے۔ پڑ کر
 رات یوں ضائع کرنے کی تھوڑی ہوتی ہے۔“

زلیخا بھی ہنس پڑی۔

فرجاد کو یوں لگا جیسے پرانی کسی لہر سے پاؤں چھو گیا۔ کسی بلند دیا کی شعلہ کے
 سے گر پڑنے کا احساس ہوتا۔ آجھی تھوڑی ہی نہ آیا۔ کہ اسے کیا ہوا ہے۔

محفل رقص و سرود ہوئی پر تھی۔ رات بھگ رہی تھی۔ وقت گزر رہا تھا۔ فرجاد چپ چاپ
 وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آیا۔ یہاں اسے اس سارے ہنگامے سے اسے کوئی سروکار ہی
 ہو۔ سب سے رشتہ ٹوٹ گیا ہو۔ کوئی بدشگون نہ رہا ہو۔ کوئی تعلق نہ رہا ہو۔

وہ مضطرب اور بے چین تھا۔ یاد آ رہا اس کی نثریں آصف کے جلد عوی پر پڑ رہی تھیں۔ کا
 ہی دفعہ وہ اپنی کھڑکی میں کھڑے ہو کر ادھر تکتا رہا دو تین۔ ادھر سے آدھے میں نکل آیا اور بجلی کی سر
 روشنیوں کو جانی جانی نکھڑا۔ دیکھا رہا۔ جو پرے غمی کھڑکیوں سے باہر متکس ہو رہی تھیں۔

اور

وہ اپنا خالی پہلو خود فرہ ہو کر مسل رہا تھا۔ اپنا بیڈ کسی اجڑی قبر کی طرح لگ رہا تھا۔ کہ آج پھر
 انا تک لگ رہا تھا۔ کہ کھنکھسی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی دیوار میں سمٹ رہی تھیں اور پھٹ
 چکے تھے۔

”گل بانو۔ گل بانو۔“ اس کا رواں ہواں بے بسی سے پکار رہا تھا۔ وہ مرغ بس کی طرح تڑپ
 رہا تھا۔ بستر پر لیٹے بھی کسی پہلو قرار نہ تھا۔ کروٹیں بدلتا رہا۔ آنکھیں سچ سچ کر سو جانے کی کوشش
 کی۔

لیکن

اس کے من کی تو ایسی کھلبلی مچی تھی۔ نیند کہاں آتی۔ اس کے من کی آنکھیں تو آصف اور
 گل بانو کو دیکھ رہی تھیں۔ حسن و عشق کا کھیل دیکھ رہی تھیں۔ اسکی محرومی اس کا منہ چڑا رہی
 تھی۔

اس نے کیے اٹھا اٹھا کر بے بیچکے اس نے بیڈ کو نوچ لیا۔ اپنا گریبان پھاڑ ڈالا۔ اپنے ہاتھوں
 میں رات کاڑ لئے۔ لیکن بے قرار کی قرار نہ آیا۔ کتنی ہی دیر وہ مجنونانہ حرکتیں کرتا رہا۔

بال سے مترنم آوازیں گھنگھروں کا شور اور داد کی فلک شکاف آوازیں اب بھی آرہی تھیں۔
 غل شاہ عروبی لمحوں میں تھی۔ فرجاد نے کٹاک سے کھڑکی بند کر دی۔ اور پھر پت بھی دھماکے
 بند کر دیئے جن سے جلد عوی کی چھتھی روشنیاں باہر آتی نظر آ رہی تھیں۔

یہ رات فرجاد پر قبر کی رات کی طرح بھاری تھی۔ لمبے لمبے اس سے حساب لیا۔ اور جب
 وہ نیند برداشت کرنے کے قائل نہ رہا۔ تو حویلی کے دوایی خانے سے جا کر وہ بیڈ پر شیشی اٹھا لیا۔

صبح گیارہ بجے تک سوئے پڑے رہتا عزیز و اقارب کے لئے خاصا دلچسپ موضوع بن گیا۔
 طاہرہ بھائی نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا۔ جن کے گانے کی رات تھی۔ وہ تو سویرے سویرے

اٹھ بیٹھے۔ اور جناب گیارہ بجے تک پڑے سوئے رہے۔ ان کے نصی کی نیند تم نے نکالی۔
 فرجاد ایک کمری کھینڈی آہ بھر کر مسکرایا۔

وہ تصادفوں کے درمیان جینا جینا کرتا مشکل ہو آتا ہے۔

آج بھی کچھ ایسا ہی واقعہ ہوا۔ آج کل بانو منٹل دور کی کسی شہزادی کا روپ دھارے تھی۔ وہ اس آن بان۔ جس شان اور جس حکمت سے گلاب کے پودوں کے قریب کھڑی آصف سے تصویر لہرا رہی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ حقیقی شہزادی نہیں۔

حسن کے یہ رنگین جلوے فرجاد کی قوت برداشت سے باہر ہو رہے جاتے تھے۔ کھانے کی میز پر وہ جھک کے ساتھ بیٹھی سب سے منفرد نظر آ رہی تھی۔ آصف اسے دیکھ دیکھ کر جی رہا تھا۔ اور فرجاد اسے تک کر مر رہا تھا۔

”کل لالہ۔“

فرجاد نے اس کی طرف دیکھا۔

”کل لالہ شہزادیاں ایسی ہوتی ہیں۔“ اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

”یوں“ طالعہ بھائی نے پوچھا۔

”یہ۔۔۔ مجھے شہزادی کہہ رہے تھے۔“ وہ آصف کی طرف شوخ نظروں سے دیکھ کر مسکرائی۔

”تم تو آج شہزادیاں سے بھی نمبر لے گئی ہو کل بانو۔“ طالعہ بھائی نے پیار سے کہا اور پھر

اعوں سے بولی۔ ”اس کی نظر اتنا آج بہت پیاری لگ رہی ہے۔ میز پر بیٹھنے اور لوگوں نے بھی

توجہ اس کی تائید کی۔ فرجاد کچھ نہیں بولا حسرت سے اسے گئے کیا۔

آصف گل بانو کی تعریفیں سن کر مسرت ہوا جا رہا تھا۔ اپنی خوشیوں میں گم تھا۔ فرجاد کی

پہچان کے اس نے کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔

ان کو رستے گھمے۔ اور اوقات اپنی انوکھی نوعیت سے رو پڑ رہے تھے۔

اوشام جب وہ نکلے کھیل رہے تھے۔ حوٹلی کی کچھ بچیاں جمل چکی تھیں۔ کچھ چیلے والی

فرجاد بیٹھنے میں پر اکیلا نکل رہا تھا۔ سورج اس کے دیکھنے دیکھنے ہی غروب ہو گیا تھا۔ اور

الٹی ہر تیرے والی لالی بھی ایسا ہلکا ہو رہی تھی۔

فرجاد وہی الجھن میں گرفتار تھا اس کے دل و دماغ پر گل بانو چھائی تھی۔ وہ اپنے جذبات کا

انہماک اس سے تجزیہ کرتا تو گل بانو کو اپنے اسے چھوٹے اسے حاصل کرنے کی لگن تپ رہی

تھی۔ ان خوفناک جذبات سے خودی خائف تھا۔ انہیں کچھ دبانے اور بیش کے لئے ملاوٹینہ کی

دھم دھش کر رہا تھا۔ لیکن تاہم۔ گھبراہٹ اس کے اعصاب پر طاری تھی۔ اگر جذبات کی جنگ

میں ہاری رہی تو کیا ہو گا؟

”کیا بے سے اور دھماکا مچ رہا تھا۔“

”کل لالہ۔“

لے لے کر موت کوئی اپنی مرضی سے تو نہیں خریدتا کہ آدمی مٹا لے میں مارا جاتا ہے۔ دھوکے میں آ جاتا ہے۔

گل بانو اور آصف کو ایک بندھن میں باندھ کر فرجاد نے سوچا تھا۔ کہ وہ اپنے اور گل بانو کے درمیان ایک سبب سے حد فاصل کھڑی کر لے گا۔ اور اپنے شوہر سے سربذات کو اس حد فاصل کا ہوا دکھا دکھا کر اثنا خوفزدہ کر دے گا۔ کہ ان کی اصلی صورت ہی سچ ہو جائے گی۔

لیکن جذبات بڑے تو مند بڑے مند اور بڑے ہی سرکش تھے۔

گل بانو اور بھی تو صرف خیالوں کا مرکز تھی۔

اب

قریب آکر تو کھلا چیخ بن گئی تھی۔

کل اس نے ستاروں پر اسفند لباس پہنا تھا۔ گلے میں کدکن کا خوبصورت گلوند کانوں میں

بڑے بڑے کدکنی آؤ بڑے تھے۔ سرزوزف نے اس کے بالوں کا بڑا خوبصورت شاکل بنایا تھا۔

میک اپ بھی جابک دستی سے کیا تھا۔ وہ بلاشبہ ایک جیتی جاگتی قیامت لگ رہی تھی۔ وہ آصف کے

ساتھ کھیں باہر جاری تھی۔

بانو کی کے قریب فرجاد کھڑا تھا۔ وہ اس کے قریب آئی۔ تو مسکراتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

”گل لالہ۔“ اس نے بڑے پیار سے کہا۔

فرجاد ساکت سا اسے سکتا رہ گیا۔

وہ گفتگو سے مسکرائی اور شاید اس کی جامہ نظروں سے بچنے کے لئے اٹھلا کر بولی ”کیسی گنتی

ہوں گل لالہ۔“

”قیامت۔“ فرجاد کا پی چاچ چچ کر کے۔ لیکن کچھ نہیں بولا۔

”ہاں۔“ فرجاد صرف اسی قدر کہہ سکا۔

آصف کے آواز دینے پر گل بانو تیز قدم اٹھاتے پر آمدے کی طرف چلی گئی۔ فرجاد بہت

کھڑا رہ گیا۔ جسم چاندنی جا بک تھی۔ اس کے جانے کے بعد یوں لگتا تھا۔ اندھیرا ہی اندھیرا بچیل

”گل لالہ۔“

دور سے گل بانو چیخے ہوئے دوڑی آ رہی تھی۔ وہ ہنسی سے بے حال ہو رہی تھی۔ اس
چیخے فرجاد تھا۔

بیار کے کھیل تھے۔ گل بانو اس سے اپنا آپ چھڑا کر بھاگی تھی آصف اسے پکارتے کو پیچھا
تھا۔

فرجاد کے کچھ بھینٹے سے پہلے ہی گل بانو اس کے کندھے کو مضبوطی سے پکڑ کر اس کے پیچھے
ہوئے بیٹھے ہوئے بیٹھی۔ ”دیکھیں گل لالہ۔ دیکھیں آصف کو منع کریں۔“

وہ فرجاد سے چٹی ہوئی شوشی سے چند قدموں پر رک جانے والے آصف کو تک رہی تھی۔
گل بانو کے نرم و گداز جسم کے لمس سے فرجاد کی لسن لسن میں سیال انگ بہہ نکلی تھی۔
آصف کا خیال رہا نہ کسی اور کا۔

اور

گل بانو آصف کا نہ شوشی سے جڑاتے ہوئے فوراً فرجاد کو چھوڑ کر دوسری طرف بھاگا
جاتی۔ تو لعزش کا کوئی خوفناک لمحہ شاید وارد ہو چکا ہو۔

اس کا داغ چکرائے لگا۔ جسم پیٹنے لگا۔ نڈھال اور بے حال ہو کر وہ لڑکھڑاتے قدموں سے
کمرے میں آ گیا۔ بستر میں گر کر اس نے تکیے میں منہ چھپا لیا۔

وہ اپنے آپ سے عاجز آ گیا تھا۔

وہ جذبات کی تنہی اور تیزی سے بوکھلا گیا تھا۔

اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔

دوسرے دن دوپہر تک وہ اپنے کمرے سے باہر نہ آیا۔

”گل لالہ کو آئی نہیں دیکھا۔“ گل بانو نے آصف سے کہا۔

”رات دیر سے سویا ہو گا۔“

”اتنی دیر سے بھی کیا۔ رات انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔“

”ہاں۔ شاید۔“

”مجھے پتہ ہے نہیں کھایا تھا۔ کہیں ان کی طبیعت تو خراب نہیں۔“

”جا کر دیکھ لیتیں۔“

”آؤ دیکھیں۔“

آصف کمرے سے اٹھا اور دونوں ہاتھ میں ہاتھ دے کر فرجاد کے کمرے میں آ گئے۔

”ہائے گل لالہ آپ ابھی تک سو رہے ہیں۔“ گل بانو اس کی مسہری کے قریب جاتے

فرجاد نے بے خواب کھلی کھلی آنکھوں سے اسے دیکھا اور چڑاری سے بولا۔ ”جاگ رہا
ہوں۔“

”کیا بات ہے گل لالہ۔ بخار تو نہیں۔“ گل بانو نے پیٹی پر بیٹھے ہوئے بوی اپنا تیت سے اپنا نرم
موازا ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھ دیا۔ فرجاد نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کانپ گیا۔

”کیا بوا فرجاد۔ لگتا ہے طبیعت ٹھیک نہیں۔“ آصف نے پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ مری ہوئی آواز میں بولا۔

”ہائے اللہ ہمیں بتایا ہی نہیں۔“ گل بانو بڑے پیار سے اس کا سر دبانے لگی۔ ”آصف نے
اس کی گردن کو چھوا۔“ بخار تو نہیں لگتا۔“

”نہیں۔“ وہ اسی طرح مری آواز میں بولا۔ گل بانو کی قربت شعلے کی لپک تھی کہ وہ جل
اٹا۔

”پھر کیا ہوا ہے۔“ آصف گل بانو کے متقابل پیٹی پر بیٹھ گیا۔

”پتہ نہیں۔“ فرجاد نے سرخ سرخ آنکھوں سے آصف کو دیکھا۔

”گل لالہ آپ کے لئے قہوہ بنا لاؤں۔“ جی سنبھل جائے گا۔“ گل اس کے جواب کا انتظار کئے
اور ابھی۔ آصف فرجاد سے باتیں کرنے لگا جنہیں فرجاد صرف سنتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ قہوہ بنا لائی اور پیالی میں ڈال کر بڑی محبت سے فرجاد کو پیالی پیش کی۔

قہوہ تھا گل بانو زہر کا پیالہ بھی دیتی تو فرجاد انکار نہ کرتا۔

وہ بڑی پیاری باری باتیں کرتی رہی۔ آصف مسکراتا رہا اور فرجاد سوچوں میں ڈوبتا گیا۔ جانے
کون کون سا عقلمیں احساس ہونے لگا تھا۔ تصادات اسے بن موت مار رہے تھے۔

ہاں وہ کل بانو کا جذباتی لہس چاہتا تھا۔ اس کا اسے اعتراف تھا۔ وہ فرشتہ نہیں انسان جو ان مرد تھا۔ جوش جذبات سے بھرپور جو ان مرد جو کل بانو کو اپنے تمام تر جنسی تھاقوں سے

اور رہخانہ بامیں چھتار درخت میں بھولا ٹھیک کرداری تھیں۔

”شینا“ معمر ملازمہ اور سرے گزری تو فرجاد نے کتاب سے نظر اٹھائے بنا پکارا۔

”جی مالک۔“

”ذرا کافی بھجوا دو۔“

”اچھا مالک۔“

”ابھی۔“

”بہت اچھا۔“

”ہم تینوں کے لئے۔“

”اچھا مالک۔“

شینا سلیپر تھپتھپے چلی گئی۔ فرجاد نے کتاب سٹول پر پھینک دی۔ چاہا کہ فائل اٹھائے لیکن موڈ نہ بنا۔ کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ جانے کتنی دیر دیو نی پڑا رہا۔

ملازمہ کافی کی ٹرسے لے آئی۔ سبزے فرجاد نے پاؤں ہٹائے اور شینا نے ٹرسے آہستگی سے رکھ دی۔

”جاؤ آصف اور گل بانو سے کو بیٹیں آج اس۔ کافی پی لیں۔“ اس نے شینا سے کہا۔

”اچھا مالک۔“ وہ اپنے مخصوص انداز سے چلتی وہاں سے ہٹ گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آگئی۔

فرجاد نے استفسار یہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”جی وہ۔“ شینا کچھ کہنے ہوئے جھٹکی۔

”کیا ہے۔“ فرجاد گھبرا کر بولا۔

”جی۔“ شینا قدرے مسکرائی۔ ”جی گل بانو پی بی رو رہی ہیں اور مالک شیشے میں ہیں۔ شاید

دونوں میں لڑائی ہو گئی ہے مالک۔“

”گل رو رہی ہے۔“ فرجاد کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”مالک میاں بوی ہیں۔ لڑائی بھڑکا بھی ہو ہی جاتا ہے۔“ شینا فرجاد کی دلی اور ذہنی کیفیت

سے بے خبر مسرور لہجے میں بولی۔ پیار کی لڑائیوں کا اسے تجربہ تھا۔ یہ انوث محبت کی ضامن ہی تو

ہوتی ہیں۔

لیکن فرجاد اپنے فضل کی بیٹ گھبراہٹ میں باندھتے ہوئے تیز قدموں سے آصف کی خواجہ گاہ کی

طرف لپکا۔

پلنگ کے نیچے پر بانڈوں میں سر سرے گل بانو سکیوں سے زور ہی تھپی۔ قدرے ہٹ کر کرسی کی پشت پکڑے آصف کھڑا ہونٹوں کے سرے دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غصے کی ہلکی تھی۔

فرجاد نہیں جانتا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ لڑائی کیوں ہوئی ہے۔ قصور وار گل بانو ہے یا آصف۔ اس نے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔ چند لمحے دروازے میں کھڑا رہا۔ قرآن کو نگاہ آصف پر ڈالی اور برقی کی سی تیزی سے گل بانو کی طرف بڑھا۔

”گل بانو۔“

”گل۔“

”کیا ہو گل۔“

”کیوں رو رہی ہو۔“

”مجھے جتاو گل کیا ہوا۔“

ڈوبے ابھرتے سانسوں میں فرجاد نے ایک ہی زبان میں کئی سوال کر ڈالے۔ گل بانو نے سر اٹھایا۔

اے اس کی روٹی ہوئی حسین اور قاتل آنکھیں۔ پیاز کی خبثی گل جینگے ہونٹ اور کوئل مالک کی لال لال ہتھک۔ فرجاد کا بے اختیار جی چاہا کہ اسے بانڈوں میں بھر کر سینے میں چھپائے۔

گل بانو نے کچھ نہیں بتایا۔ اک روٹھی ہوئی نگاہ آصف پر ڈالی اور پھر سراپاؤ کے حلقے میں رکھ دیا۔

”گل بانو۔“ فرجاد نے بے صبری سے کہا۔

”کچھ نہیں ہو فرجاد۔“ گل بانو کی بجائے آصف نے کہا۔

”کچھ نہیں ہو۔ تو پھر گل رو کیوں رہی ہے۔“ فرجاد نے ہراساں ہو کر پوچھا۔

”ابھی چپ ہو جائے گی۔“ آصف زیر اب مسکرایا۔

”تمہیں شرم نہیں آتی۔“ فرجاد تیز آواز میں بولا۔

”کیوں۔“ آصف کرسی کے گرد گھوم کر اور قریب آگیا۔

”وہ۔ وہ رو رہی ہے اور تم۔“ فرجاد نے اسے گھورا۔

”رونے سے آنکھوں کی کثافت دھل جاتی ہے۔“ آصف نے جسنمرا انداز میں گل کو دیکھ کر

کہا۔ ”جی بھی ہلکا ہو جاتا ہے۔“

”کیوں اسے ہند کرو۔“ فرجاد نے تندر لہجے میں کہا۔ گل بانو نے گھبرا کر سر اٹھایا۔ فرجاد کے لہجے کی

تعلیٰ کسی وحشیانہ قدم کی پیش خیمہ تھی۔

آصف نے اسے گھور کر دیکھا۔ اور پھر تلخ لہجے میں بولا۔ ”یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے فرجاد۔“
ہے کہ دخل اندازی کی بجائے تم کمرے سے چلے جاؤ۔“

فرجاد نے کہا جانے والی نظروں سے آصف کو دیکھا۔ اور پھر سارا غصہ سامنے پرے منتقل کر دیا۔
زبردست ٹھوکر مار کر نکالے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

برسرِ چلیچ تھا۔ فرجاد اب عاجز آ گیا تھا۔ کبھی سوچتا آصف اور گل بانو کو حویلی سے نکال دے۔
پھر اپنی دور کر دے۔ کہ خیال کی بھی پہنچ ان تک نہ ہو سکے۔ اور کبھی ارادہ کرتا کہ خود کہیں چلا
آج۔ دور۔ بہت دور۔ جہاں جا کر وہ گل بانو کو پالنے لگا یا کبھی دیکھنے کی بھی آرزو نہ کر سکے۔

گل بانو حویلی کی رونق تھی۔ بہار تھی۔ اپھل تھی۔ اس کے آنے سے شب و روز ہی بدل گئے
۔ گمراہی کا احساس ہوتا تھا۔ کبھی دعوتوں میں جانا ہو رہا ہے۔ کبھی گھر۔ لوگوں کا اجتماع ہے۔
لی ہالے سنے رنگ بدل کر آنکھوں میں اتر رہی تھی۔ فرجاد کہاں تک اپنے آپ کو بہلا تا نا ان
اور اس کی سوچ کا ایک ہی رنگ تھا۔ وہ اپنے جذبات کے ہاتھوں رکا ہوا انسان تھا۔

بھی کبھی ہم اسے چھوٹے ہو جاتے ہیں کہ اپنی نظروں سے بھی چھپ جاتے ہیں۔ شاید یہ وقت
ابھی نہیں آیا ہوا تھا۔ وہ اپنی نظروں سے بھی اوجھل ہو گیا تھا۔ اسی لئے تو بس رات وہ بلا سوچے
بھگوان کی خواہگاہ کے دروازے میں جا پہنچا تھا۔

برائوں کی وہ نظری ہوئی تاریک رات تھی۔ فضا میں سکوت تھا۔ جو دور کتوں کے رونے
۔ کبھی کبھی درہم برہم ہو جاتا تھا۔ حویلی کے ارد گرد کھڑے اونچے اونچے درخت پر اسرار سی چپ
۔ تھ۔ کبھی کوئی پرندہ پھر پھر آتا تو سکوت غیر محسوس طریق سے لمحہ بھر کو ٹوٹ جاتا۔ حویلی
۔ میں ڈوبی تھی۔ کسی کسی خواہگاہ کی بند کھڑکی کے پیچھے ملبہ کی روشنی تھی۔

آج اپنے کمرے میں مضطربانہ نکل رہا تھا۔ آج سینھ ہاشم کے ہاں دعوت تھی۔ اور گل بانو
۔ ہاں۔ ایسے لباس میں جان محفل نگ رہی تھی۔ سارا وقت فرجاد کی نظریں اسی کا طواف کرتی رہی
۔ آج حسن کا قاتل انداز اس کے لئے ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔

وہی پردہ اس کے ساتھ ہی آئی تھی۔ برابر کی سیٹ پر بیٹھی اسکے جذبات میں طوفانی اپھل
۔ آج اسے وہ مصیبت سے باتیں کر رہی تھی۔ آج آصف کو ضروری کام کے لئے باہر جانا پڑا
۔ اس کی ہم موجودگی فرجاد کو بغاوت اکسار ہی تھی۔ وہ بڑی وحشیانہ سوچیں سوچ رہا تھا۔

ذرا تھک ہو لٹاک سچائی ہے۔ اس کے لئے انسان انسانیت کی حدود و قیود بھی تو دیتا ہے۔

لیکن جو کچھ بھی تھا۔ اس سچے نے فرجاد کو لرزہ برآمد کر دیا۔ اس کی آنکھیں چوہت تھیں۔
اور وہ چاروں طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے کسی انجان بیگم پہ آگیا ہو۔

کئی لمحوں بعد جب وہ پوری طرح سوئے سمجھنے کے قابل ہوا تو وہ کانپ کانپ گیا۔ اگلے قدموں
واپس لوٹا اور اپنی خواہگاہ میں آتے ہی جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔ خوف کی لکڑی اس کی ریزہ کی
ہڈی میں دوڑ دوڑ جاتی تھی۔ وہ کیوں وہاں گیا تھا؟ کیا کرے گیا تھا؟ یہ سوچ جلتی ہوئی سلاخوں سے
مشابہ تھی۔ اس کا ذہن جھلنے لگا۔

اس واقعے نے اسے اندر سے بالکل توڑ پھوڑ دیا۔ وہ اپنے آپ سے خوف کھانے لگا۔ اس نے
اپنے آپ کو سب سے کٹ کر الگ تھک کر لیا۔ کتنے ہی دن وہ آصف گل بانو اور دوسرے جو ملی
کے مکتوبوں کا سامنا نہ کر پایا۔ صبح ہی صبح گھر سے نکل جاتا۔ اور درات خاموش ہو جاتی تو گھر لوٹا۔
آصف اور گل بانو نے پہلے پہلے تو محسوس نہ کیا۔ اس کی مصروفیات کا سوچ کر چپ رہے۔
لیکن جب لاشعری برہمنی مگی۔ تو دونوں کو تشویش ہوئی۔ اس دن دونوں اسی کی باتیں کر رہے تھے۔
”چند نہیں گل لالہ کو کیا ہو گیا ہے۔“

”عجب رویہ اختیار کر رکھا ہے اس نے۔“

”ان سے پوچھنا تو چاہئے۔ آخر وجہ کیا ہے۔“

”وہ بہت گمراہ ہے۔ کبھی نہیں بتائے گا۔“

”آپ تو اس کے بڑے اچھے ہیں۔ دوست بھی ہیں۔ آپ ان سے پوچھیں تو سہی۔“

”اس کا رویہ اتنا درشت اور غیر دوستانہ ہو تا ہے کہ کچھ پوچھنے کی جرات ہی نہیں ہوتی۔“

”میں پوچھوں ان سے۔“

آصف چپ ہو گیا۔ اس کی چپ میں کئی سوچیں مگی دوسرے اور کئی اندیشے گڈمڈ ہو رہے تھے۔

فرجاد کا رویہ ان دنوں واقعی جارحانہ ہو گیا تھا۔ کوئی بات کرتا تو ٹوکاٹ کھانے کو دوڑتا۔ غلبی اور
تشنگی جو اس کے مزاج کا خاصا تھا۔ جانے کہاں تھی۔ پاس ادب رہا تھا نہ لحاظ۔ آصف نے دو
ایک مرتبہ اس سے کھانے کی کوشش کی۔ تو منہ توڑ جواب پایا۔

جارجت برہمنی مگی۔ آصف نے بھی مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی۔ لیکن اس دن کا فائدہ اٹھانے پر فرجاد
کے دھمکا کرانے تھے۔ وہ فائل لے کر اس کے پاس آیا۔ فرجاد آرام سے کرسی میں لیٹا سگریٹ
کے سٹن لگا رہا تھا۔ ایٹش مڑے میں بے شمار کلوں سے بڑے تھے۔ قالین پر مڑے تڑے بت سے
کافندہ تھی۔ میر پرین اور پڑ رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے فرجاد کچھ لکھ کر خود ہی تلف کرتا رہا

فرجاد بھی اپنی ضرورت کے سامنے جھکا ہوا تھا۔ آصف گھر پہ نہیں تھا۔ گل بانو اکیلی اپنی خواہگاہ میں سو
رہی تھی۔ وہ جل جل کر راکھ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ کڑوے کیے دھوئیں گل گل کر جیتا نہیں
چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جذبات کی دھند تھی۔ اس کے سینے میں جذبات کی آگ تھی۔ اسے
فرض کا خیال رہا نہ انسانیت کا پاس۔

وہ اپنے کمرے سے نکلا۔ اور کمرے اندر سے میں ڈوبی یا کھنی میں چوروں کی طرح آہستہ آہستہ
گل بانو کی خواہگاہ کی طرف بڑھا۔ اس کا سانس دھوئیں کی طرح جل رہا تھا۔ اس کا چہرہ غرہ جذبات
سے تھمرا رہا تھا اور اس کا سارا جسم ہکا بھکا ہو کر پتھر کی تراز ہی پر قرار نہیں رکھ رہا تھا۔
گل بانو کے کمرے میں کئی بجلی کی سرخ روشنی کا غبار تھا۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ بیوی دروازہ بھی
کھلا نہیں تھا۔ وہ مغموم کر دوسرے کمرے کی طرف گیا۔ اور پھر تیسرے کمرے کے پردے میں آ
گیا۔ یہ کمرہ کھلے تھے۔ ایک کے بعد دوسرا کمرہ عبور کیا۔

اور

پھر

گل بانو کی خواہگاہ کے اندر روئی دروازے پر آگیا۔

گل بانو مسرے میں محو خواب تھی۔ ریشمی رضائی اس کے سینے تک تھی۔ ایک بازو سر کے
قریب تکیے پر تھا۔ دوسرا رضائی کے اوپر سینے پر رکھا تھا۔ اس کا کھوتی حسن سوئے میں بھی بیدار تھا۔
اس کے چہرے پر فرشتوں کی سی پاکیزگی اور معصومیت تھی۔

ربع حسن تھا۔ یا معصوم پاکیزگی کی قوت۔ فرجاد کبھی کی طرح دروازے میں گڑا ہوا تھا۔ قدم
کمرے کے اندر رکھنے کی جرات نہ ہو رہی تھی۔ وہ غور سے گل بانو کو دیکھ رہا تھا۔

پھر

پھر

اچانک اس نے ایک لمبی چیخ مٹا کر تڑائی۔

یہ چیخ خدا جانے کس نے ماری تھی۔

شرافت کے آخری لمحے نے۔

پاکیزگی کی روح نے۔

ضمیر کے بت نے۔

یا

شاہ

خواب میں ڈر جانے والے کسی شخص نے۔

”فرجاد“ آصف نے اسے پکارا۔

”ہوں۔“

”تھوڑا سا وقت دے سکتے ہو۔“

”کس لئے۔“

”مل کے بارے میں کچھ باتیں کرنا ہیں۔“

”سنا ہے کچھ خسارے کی صورت ہے۔“

”ہے تو نہیں۔ ہونہ جائے۔“

آصف اس کے سامنے کرسی پر بیٹھنے ہی کو تھا۔ کہ وہ غرایا۔ ”یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔“

”میری وجہ سے۔“

”ہاں۔ ہاں۔ تمہاری وجہ سے۔“ حسین اپنی رانگ رلیوں سے فرمت ملے تو ان کاموں کی

بھی دھیان دو۔ شادی نہ ہوئی میاشی کا سرٹیفکیٹ مل گیا ہے تمہیں۔“

”فرجاد۔ کیا کہہ رہے ہو۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“

”میں اپنے کام میں ایمان داری سے مخلص ہوں۔“

”وہ تو نظری آ رہا ہے۔“

”فرجاد۔“

”تم جانتے ہو۔“

آصف فکر کر اس کا منہ نکلنے لگا۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ فرجاد ہی ہے۔ فرجاد جو ا

پیارا دوست اور عزیز بھائی تھا۔

فرجاد نے کچھ ایسا ہی حشر گل بانو کا بھی کیا۔ اس دن اس نے بابا سے ملنے گاؤں جانا تھا۔

تو صبح سے کام پر گیا تھا۔ اب تک نہیں لوٹا تھا۔ گل بانو تیار ہو کر فرجاد کے پاس آئی۔ اس کے

گاؤں جانے کا خیال آ گیا۔

وہ لاہوری میں بیٹھا تھا۔

”گل لالہ۔“ وہ بڑی اناجیت سے بولی۔

”کیا ہے؟“ فرجاد نے اس کے سر پر ایک نگاہ ڈال کر منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے

تندہ لیے میں کہا۔

”گل لالہ۔“ وہ اس کے سامنے آ گئی۔

فرجاد ہاتھ ملتا رہا۔

”گل لالہ۔“

وہ چپ رہا۔

”آپ کو کیا ہو گیا ہے گل لالہ۔ ناراض ہیں کچھ۔“

”اوہ خدا یا۔ یہ راز غم نہیں چاہوں۔“

”خدا ہو گئی۔ گل لالہ۔ آپ بھی کیا چیز ہیں۔ لگتا ہے آپ ہم سے خفا ہیں۔ آصف سے بھی

آپ اچھی طرح نہیں بولتے۔ مجھے پتہ ہے۔“

”کیا پتہ ہے۔“

”آپ ناراض ہیں۔“

”نہیں میں کسی سے ناراض نہیں۔“

”تو پھر اٹھئے۔ گل بانو بس پڑی۔“

”کیوں۔“

”مجھے گاؤں چلنے چلے۔ بابا سے ملے آج کتنے دن ہو گئے۔ آصف کو تو ہم ہی سے فرمت نہیں

ملی۔ آپ چلے میرے ساتھ۔ بابا آپ کو بھی تو بت پڑھتے ہیں۔ آپ کا دل ہی نہیں چاہا کبھی ان سے

ملنے کو۔ چلے آج میرے ساتھ۔“

”میں نہیں جاسکتا۔“

”کیوں۔“

”کہہ دو یا۔“

”ہائے گل لالہ۔“

”گل بانو جلی جاؤ یہاں سے۔“

”بابا سے ملنے کو آپ کا ہی راقعی نہیں چاہتا۔“

”نہیں چاہتا۔ میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی ناٹھ نہیں کوئی رشتہ نہیں۔“

گل بانو کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ آنسو جلی پر تیل تھے۔ فرجاد غصے سے لال

پہلا ہو گیا۔ کتابیں پرے پھینک کر وہ اٹھا تو یوں لگا جیسے طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہو۔

گل بانو کبھی رو گئی اور وہ آنسو کے ریلے کی طرح لاہوری سے باہر نکل گیا۔

"ہوئی اور کام مالک غلام رسول مڑے اٹھا کر جانے کو تھا۔
 "پھر غلام رسول کہاں چلے۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
 "بہتر بن چھوڑ آؤں۔"
 "پھر نہیں آؤ۔ تازہ جانے بیٹا لاؤ۔"
 "ابھا مالک۔"
 "نہرو۔"
 "ہی۔"

ابھار نے سگریٹ راکھ ان میں ڈالتے ہوئے ایک مضطرب سی انگڑائی لی۔ اس کا چہرہ بدایا
 ابل تھا۔ پل بکھرے ہوئے تھے۔ اور آنکھوں میں دیرانی سی تھی۔ ویسے وہ مسکرا رہا تھا۔
 "نام رسول۔"
 "اب مالک۔"
 "میں نے تمہارے لئے بہت کچھ کر دیا ہے۔"

"اپنی بیٹی کی شادی اب دھوم دھام سے کرنا۔ آصف تمہیں روپیہ دے دیں گے۔"
 "نہرو کچھ سوٹ اللاری میں پڑے ہیں۔ تمہارا بیٹا شہر سے آئے تو اسے دے دینا۔ جوتے
 اور پورے ہوں تو لے لے۔ باقی تمہارا کارٹر تمہارے نام کر دیا ہے۔ میں نے کام دام اب
 اس لئے لے لے۔ تنخواہ جب تک جیو گے ملتی رہے گی۔ انا شینا اور محی الدین کا بھی پکا بندوبست کر دیا۔"

فرمان کی باتیں غلام رسول کی سمجھ میں نہ آئیں۔ تو ٹرے وہیں رکھ کر اس کے قدموں میں بیٹھ
 "ان ساری باتوں کی کیا ضرورت تھی مالک۔ آپ ہی کا دیا کھاتے ہیں۔ پھر جب تک زندہ
 آپ کی خدمت میرا فرض ہے۔"
 "تم نے میری بہت خدمت کی ہے۔"

"سرکاریہ میرا فرض تھا۔"
 "فرج باد کچھ نہیں بولا۔ چند لے لے غلام رسول کو کتنا رہا چکر اگمری سانس لی۔ اور آہستگی سے
 "آصف آجائیں تو امیں اداھر بھیج دینا۔ تم جاؤ اب۔"
 "چائے۔"
 "لے آنا۔"

غلام رسول خالی برتن اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔ فرج باد نے نیا سگریٹ سلگایا اور اس کے لیے
 "اٹھ لینے لگا۔ کچھ دیر کی میں شیم راز سگریٹ چوکنے کے بعد اٹھا اور چوٹی کھڑکی کے پردے

"یہ نیلی فائل ان کانڈوں کے ساتھ رکھ دو غلام رسول۔"
 "اچھا مالک۔"
 "وہ سارے رجسٹرار دھر لے آؤ۔ وہ کھلے کانڈ بھی۔"
 "یہ۔"
 "ہاں۔ سارے اٹھا لاؤ۔ سارے۔"

غلام رسول رجسٹرار کا پلندہ الماری کے قریب رکھی میز سے اٹھا لیا۔ اور فرج باد کے ساتھ
 رکھی بیچی سی کشادہ میز پر رکھ دیے۔ فرج باد کے سامنے پہلے بھی کانڈات بکھرے پڑے تھے۔
 تھے۔ رجسٹرار تھیں سرکاری مہوں والے کانڈات تھے۔ عدالتی کارروائیوں کا ذخیرہ بھی کانڈ
 صورت میں ڈھیر تھا۔

وہ گلے دار گھونٹے والی کرسی میں بیٹھا مصروف کار تھا۔ اپنی ذاتی نشست گاہ میں بیٹھا وہ
 تندی سی جانفشانی سے کام کر رہا تھا۔ چائے اور سگریٹ بے تحاشائی رہا تھا۔ اس کی انگلیوں اور
 ہونٹوں پر سگریٹ کے زردی کا سیاہ نشان بڑے واضح نظر آ رہے تھے۔

سگریٹ اب بھی اس کے ہونٹوں میں دبا تھا۔ اور دونوں ہاتھوں سے کچھ کانڈوں کو بہن
 منتہی کر رہا تھا۔ غلام رسول اسکا ذاتی ملازم فائلیں اٹھانے نہ کھتے میں اس کا ہاتھ بنا رہا تھا۔

کئی کانڈات ایک ساتھ تھیں کرنے کے بعد اس نے غلام رسول سے ساری فائلیں رجسٹرار
 کانڈات ایک جگہ اکٹھے کر کے رکھنے کو کہا۔ پھر منتہی شدہ کانڈ ایک بہت بڑے موٹے سے لکھنے
 میں ڈالے اور میز پر رکھ دیے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے بہت بڑا مرحلہ سر کر لیا ہو۔ کرسی کی پشت
 سر ڈال کر اس نے سگریٹ کا دھواں آہستہ آہستہ منہ سے نکالا۔

"بس مالک۔" غلام رسول ساری چیزیں ترتیب سے رکھ چکے کے بعد جانے کی پیالی مڑے
 رکھتے ہوئے بولا۔

"بس۔" فرج باد ویسے ہی نیم دراز تھا۔

بٹا کر بارہ دیکھنے لگا۔ حویلی کے وسیع و عریض چمن کے ایک ایک پودے ایک ایک درخت اور ایک ایک کیاری کو اس کی نظروں نے چھوا۔ چمن کے درمیانی حوض اور فوارے کو بھی وہ سستی ہی دیکھتا رہا۔ کئی سانی یا دیں کئی مسور لے سکتی ہو خوشگوار گھڑیاں اس کے ذہن میں گھوم گئیں۔ کچھ لڑکیں جوانی پر دوران بیلوں درختوں اور گھاس کے قطعوں سے وابستہ تھیں۔ پھر افسردہ گھڑیاں! ذہن میں ڈھل آئیں۔ اماں بی کا جنازہ اسی چمن میں رکھا گیا تھا۔ اور ابا کی لاش بھی عمارت کے پار میاں ہی آئی تھی۔ خوشی و غمی کا چرخی دامن کا ساتھ ہے۔ وہیں چمن میں خوشیوں کے شادمانے! بچے تھے اور ماتمی کرام بھی نہیں ہوئے تھے۔ فرجاد ماضی کے آئینے میں بھانکتے ہوئے بے طہر اور اس تھا۔

اک ٹھٹھی آہ بھر کر وہ کھڑکی سے ہٹ کر پھر کرسی پر آن بیٹھا۔ غلام رسول تازہ چائے لایا تھا۔ فرجاد کے اضطرار کو بھانپ گیا تھا۔ کچھ پوچھنے کی جرات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جرات کرنہ رہا تھا۔ چپکے کئی دنوں سے فرجاد بیگانہ اور بے مروت سا ہو گیا تھا۔ آج اچانک اس کی پرانی خود خلقی عود کر آئی تھی اور وہ کتنی ہی دیر غلام رسول سے باتیں کرتا رہا تھا۔

غلام رسول کو ان باتوں کی کچھ سمجھ نہ آئی تھی۔ الجھن سی ہو رہی تھی۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا! ان وصیت نما باتوں کا آخر مطلب کیا ہے۔

”غلام رسول۔“

”جی مالک۔“

”میرا سوٹ کیس بند کر دیا تھا۔“

”ہاں جی۔“

”بیگ بھی۔“

”جی مالک۔“

”ساری چیزیں اسی طرح رکھی تھیں نا جیسے میں نے بتائی تھیں۔“

”جی سرکار۔“

”بس تمہارا کام ختم ہو گیا۔“

”سرکار۔“

”ہوں۔“

”آپ کہیں جا رہے ہیں۔“

”ہاں۔“

”کلیں۔“

فرجاد کچھ نہیں بولا۔ غلام رسول بڑے عجز سے بولا۔ ”شہر!“

فرجاد نے گوگو کے انداز میں سر ہلایا۔

”کب واپس لوٹیں گے۔“

”کچھ پتہ نہیں۔“

”سرکار۔“

”غلام رسول! آصف آئے ہیں یا نہیں۔“

”میں جانے لارہا تھا۔ تو وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔“

”میرا پیغام دیا تھا۔“

”جی۔“

”انہیں ابھی بھیجو میرے پاس۔“

”بہتر سرکار۔“

غلام رسول آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا کمرے سے نکل گیا۔ اس کی الجھن ابھی تک حل نہ ہوئی تھی۔

ہیں۔ جو ملی میں رہنا ہی بے عزتی ہے۔“

”ہوں۔“

”آصف بھی شاید گل بانو سے متفق تھا۔ فرجوانے دو تین دفعہ اس کی اتنی تذلیل کی تھی۔ کہ خود اس نے جو ملی سے چلے جانا چاہا تھا۔ وہ تو جانے کون سے بندھن تھے۔ پیار کے کون سے ناٹے تھے۔ فرض کی کون سی گرہیں تھیں۔ جو وہ یہاں سے چلے جانے پر قادر نہ تھا۔ وقتی طور پر اہانت آمیز رویے سے دکھ بھی پہنچا اور غصہ بھی آیا۔ لیکن پھر دل کے کسی گوشے میں فرجوانے کے لئے ہمدردی کے شکوے ابل پڑے۔ وہ اسے دنیا کا سب سے دیکھی انسان لگا۔ محروم باپوں اور اہمجا ہوا۔

اس کی زیادتی کے باوجود اسے معاف کر دیتا۔

آج کئی دنوں بعد فرجوانے آصف کو بلایا تھا۔ ورنہ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے بھی کتنے ہی دن ہو چکے تھے۔ آصف نے اپنے آپ کو کاموں میں زیادہ ہی مصروف کر رکھا تھا۔ فرجوانے کیا کر رہا تھا اسے کچھ علم نہ تھا۔

اک نہ معلوم سی بھگک دونوں کے درمیان پیدا ہو چکی تھی۔ یہ نہ معلوم تھی لیکن اس کا وجود زیر محسوس نہیں تھا۔ بے تکلفی جو بھائی بندی کا خاصا تھی اس وجود سے پستی جا رہی تھی۔ اس لیے آصف گل بانو کو بھی فرجوانے کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔ شاید اخلاقی سارے کی ضرورت تھی۔ گل بانو نے سختی سے انکار کر دیا۔ اپنی انا کے معاملے میں تو وہ اذلی خوددار تھی۔

آصف اکیلے ہی فرجوانے کی نشست گاہ کی طرف گیا آہستہ آہستہ قدم اٹھائے وہ کمرے میں داخل ہوا۔

فرجوانے پر لیٹا تھا۔ کفن دہرا کر کے سر تلے رکھا تھا۔ ناگ پر ناگ چڑھائے سگریٹ کے نش لے رہا تھا۔ آصف کو دیکھتے ہی اٹھ بیٹھا۔

”آصف آؤ۔“ بہت دنوں بعد نظر آئے۔ کہاں تھے۔“ فرجوانے نے اپنی مخصوص گفتگویی سے

کہا۔

”میں تو یہیں تھا۔ تم کہاں تھے۔“ آصف نے خشکی کا انداز اختیار کر کر رکھا تھا۔

فرجوانے پر اڑا۔ سگریٹ الٹش ٹرے میں بھجائے ہوئے آصف کو دیکھا۔

”چھوٹا ٹاٹ کھڑے کیوں ہو۔“

”کوئی کام ہے۔“ آصف کرسی پر بیٹھتے ہوئے ٹھنڈے لیچے میں بولا۔

”ہاں۔“

”کیا۔“

”ابھی بتا رہا ہوں۔ پہلے موڈ تو ٹھیک کرو۔ لگتا ہے ناراض ہو مجھ سے۔“

”گل۔“

”جی۔“

”اؤ۔“

”کہاں۔“

”فرجوانے بلایا ہے۔“

”مجھے۔“

”نہیں مجھے۔“

”تو پھر میں کیوں جاؤں۔“

”یونہی۔“

”نہیں میں نہیں جاؤں گی۔ میں نہیں بولتی گل لالہ سے۔ بڑے آئے۔ اتنی بڑی طرح پیش

آئے ہیں۔“

”جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ بہت سمجھ دار۔ بڑا ہوشیار تھا۔ مینے ڈیڑھ سے ہی کچھ ہوا ہے۔

پہلے تو ٹھیک ٹھاک تھا۔“

”بالکل۔“

”کوئی الجھن ہے اسے۔“

”تو اس کا یہ مطلب تو ہوا ہی ہے کہ ہر ایک کو کات کھائے کو دوڑیں۔“

”تم نہیں جاؤ گی میرے ساتھ۔“

”بالکل بھی نہیں۔ اگر میرا پوچھیں تو بے شک کہہ دیجئے گا۔ کہ میں ان سے سخت ناراض

ہوں۔ کبھی نہ بولوں گی۔ وہ ہمارے بغیر جی سکتے ہیں۔ تو ہم بھی ان کے بغیر تھوڑا ہی جائیں گے۔“

”تم تو واقعی پیچیدگی سے خفا ہو۔“

”اور نہیں تو کیا۔ خدا پاک کی قسم آپ کی وجہ سے یہاں رہتی ہوں ورنہ جیسا سلوک وہ کرتے

”کام کیا ہے۔“ آصف فرجاد کی گفتگو کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

فرجاد وہیں بیٹھے بیٹھے اسے سنے گیا۔ دھیرے دھیرے سکراتا رہا پھر سجدہ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں کس سا سچیل گیا۔ چہرے پر دھندلاہٹیں بکھر گئیں۔ وہ اٹھا اور آصف کی کرسی کی پشت پر آکر گھمبیر لیجے میں بولا۔

”مجھے معاف کر دینا آصف میں نے تم کو گول سے بڑی بڑی زیادتیوں کی ہیں۔“

اس کی آواز میں اتنی دوسو دوسو گلیہ تھی۔ کھوفنا، تڑپ کر اٹھا اور اس کے باقیاتل کھڑا ہو کر اس کا چہرہ کٹنے لگا۔ چہرہ جو کسی اجڑی قبر کی طرح بھیا تک لگ رہا تھا۔

”فرجاد۔“ آصف بیٹھ کر کہہ سکا۔

”معاف کر دو گے۔“ فرجاد بے اختیار سا ہو گیا۔ آصف نے بازو پھیلا دیے۔ دوسرے لمے دونوں ایک دوسرے سے بٹکر رہے تھے۔

کئی لمے گزر گئے۔ دونوں جھڑپا ہو رہے تھے۔ فصد ہوا، منگی ٹھٹھ مچ گئی تھی۔ پیار محبت خلوص اور ہمدردی سے دل سیال شے بن کر بہ جانا چاہتے تھے۔ لیکن صبر و ضبط کا دامن نہیں چھوٹا تھا۔

”تمہیں کیا ہو گیا ہے فرجاد۔“ کئی لمحوں بعد آصف نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر آہستگی سے جھنجھوڑا۔

”میں خود بھی نہیں جانتا۔“ وہ سر جھکائے بولا۔

آصف ویسے ہی کھڑے کھڑے اسے کئی لمے بغور دیکھا۔ پھر اس نے اپنے ذہن میں کبھی کبھی ابھرنے والے دوسو سو کو ٹھولا اور جیسے اسے آئینے میں ہرے نظر آنے لگی۔ وہ آستینہ بہتہ لیکن مستحکم آواز میں بولا۔

”تم جھوٹ بولتے ہو۔“

”ہم سب جھوٹے ہیں آصف۔“ فرجاد اپنے بازو چڑا کر اس کی طرف پشت کرتے ہوئے د گلیہ لیے لیے میں بولا۔ ”ہم جھوٹ بولتے ہیں۔ جھوٹ سستے ہیں۔ جھوٹ کو بچ ثابت کرنے کا جھوٹ بولتے ہیں۔“

”تم تسلیم کرتے ہو۔“

”ہاں لیکن جھوٹ کو اپنی ذاتوں میں سول لینے کے بارہد سچائی کی بھی اٹل حقیقت ہے۔ یہ نیزے کی اتنی ہے آصف۔ اس کا عمل مسلسل ہے۔ خیر۔ جہڑو ان باتوں کو تم۔ شاید نہیں سمجھو گے۔“

”میں سب سمجھتا ہوں۔“

فرجاد نے پوری آنکھیں کھول کر آصف کو دیکھا۔ جو بہت ہی متین و سجدہ نظر آ رہا تھا۔ کئی لمے صیب سی خاموشی رہی۔ فرجاد نے یا سکرٹے سلگایا اور آصف کے سامنے بھی سکرٹے اٹھ دیئے۔

”جینجو“

”دونوں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ فضا چمکی اور خوشگوار ہونے کے باوجود بڑی بوجھل لگ رہی تھی۔ نیوی بلو میں سوٹ آصف کا چہرہ گلختہ ہونے کے باوجود اداس لگ رہا تھا۔ اور فرجاد کا رہا تو جیسے درد میں ڈوبا تھا۔ ڈھیلے ڈھیلے ہالے براؤن سوٹی پہنے میں وہ بے حال بے حال سا نظر آ رہا تھا۔“

”اوں! ایک دور سر سے لگا ہیں چرا وہ ہے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ بھی دزدیدہ نظروں سے لے رہے تھے۔“

”ہوں۔“ فرجاد چمکی سے راگ جھاڑتے ہوئے گویا بولا۔

”کس کام کے لئے بلایا تھا۔“ آصف نے سٹل لے کر کہا۔

”میں۔ جا رہا ہوں۔“ فرجاد آہستگی سے بولا۔

”کہاں؟“ آصف نے بھی اسی لیے میں کہا۔

”باہر۔“ وہ بولا۔

”باہر کہاں۔“ آصف نے پوچھا۔

”یورپ۔“ فرجاد کے کہنے پر آصف نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر جیسے اسے یقین نہ آیا جلدی بولا۔

”یورپ۔“

”ہاں۔“

”کیوں۔“

”بہت سوچ بچار کے بعد یہی فیصلہ کر پایا ہوں۔ کہ مجھے یہاں نہیں رہنا چاہیے۔“

”فرجاد۔“

فرجاد چپ چاپ سکرٹ کے کش لیتا رہا۔ مگر اسکوٹ سٹاناٹا سامحوس ہونے لگا۔

”تم کیوں جا رہے ہو۔“ آصف نے خاموشی کو دھیمی آواز میں توڑا۔

”اسی میں بہتری ہے۔“

”نہیں۔“ آصف اٹھتے ہوئے بولا۔ ”خوبی تمہارا صدیوں پرانا نقش ہے۔ تم اسے کیوں

پتہ نہ کر جاؤ۔ بہتر ہے ہم۔“

”آصف۔“ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی فرجاد نے ٹوکا۔ پھر گھمبیر آواز میں بولا

”اوں! کی تبدیلی مجھے راس آئے کی۔ میں یہاں بہت پریشان ہوں۔ میں۔ مگر اپنے آپ سے تنگ آ

چکا ہوں۔“

”اپنے آپ سے؟“ آصف نے آہستگی سے دہرایا۔

”ہاں آصف۔ اپنے آپ سے۔ جو شاید ضرورت سے زیادہ ذلیل ہے۔ یا شاید بہت سچا۔ وہی کتاب ہے جو چاہتا ہے اب۔ اب میں اسے جھوٹ اور سچائی کے معرکہ میں مبتلا نہیں رکھ سکتا۔ میرے بس ہے باہر ہے۔“

وہ سگریٹ کا کش لینے کو رکا۔ پھر کرسی میں تساہل سے پھیلنے ہوئے بولا۔ ”میں اب یہاں دو رہوں گا۔ بیشک جنگ کی سی حالت کا ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ فتح یا شکست کسی ایک کو تسلیم کرنا ہی میں مصلحت ہے۔“

آصف کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سوچوں میں گم تھا۔ اس نے کچھ کھل کر کہا تھا نہ فرجاد نے لیکن سارے معاملے کھلی کتاب کی طرح سامنے تھے۔ دونوں اب ایک گھر میں واقعی نہ رہ سکتے تھے ایک کو جانا ہی تھا۔

فرجاد نے ایک گہری ٹھنڈی آہ بھری۔ سگریٹ ادھ جلا ہی رکھا ان میں رکھ دیا۔ میز پر چائے بڑا سا لفافہ اٹھایا جس میں تھپی کئے ہوئے کانڈزات تھے۔ اٹھ کر آصف کے قریب آیا۔ لفافہ اس طرف خاموشی سے بڑھا دیا۔

آصف نے قدرے مڑے ہوئے لفافے کو دیکھا اور پھر فرجاد کی ویران نظروں سے اپنی اہم ہوئی نظروں ملا دیں۔

”یہ سارے کانڈزات ہیں۔“

”کس کے۔“

”بعد میں دیکھ لیتا۔ پتہ چل جائے گا۔ پوری پوری تفصیل ہے۔ تمہیں کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔ مختار نامہ بھی ہے۔ ساری بیڑیں ہیں۔ میرے جانے کے بعد دیکھ لیتا۔“

”تم جاکر رہے ہو۔“

”آج شام ساڑھے چھ کی تلاویٹ ہے۔“

”اتنا چاکا اور ایسی ان ہوئی بات آصف کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بے اختیار بولا۔ ”مذاق کر رہے ہو۔“

”میں۔“ فرجاد کا لہجہ مستحکم تھا۔

”نہیں۔ نہیں فرجاد۔“ آصف نے اسے کندھے سے پکڑ لیا۔

”میری سیٹ بک ہو چکی ہے۔ سارے انتظامات بھی مکمل ہیں۔“ فرجاد بولا۔

”کب؟“

”کچھ کمر نہیں سکتا۔“

”کیوں۔“

”ابھی تو صرف جانے کا پتہ ہے۔ کب۔ کب۔ مجھے علم نہیں۔“

”تو۔ تو تم واقعی فیصلہ کر چکے ہو۔“

”صرف فیصلہ نہیں۔ اپنے کو عملی جامہ دینا چاہتا ہوں۔ میری فلاویٹ ساڑھے چھ بجے کی ہے۔“

”۔“

”آصف نے چوہٹ اٹھیں۔ تفریق کو، کھانا اور پھر آہستگی سے سر جھٹکاتے ہوئے بولا۔“

”بہتے کی کیا ضرورت تھی۔“

”تمہارا مطلب ہے میں نے یہ سب کچھ پیپ پیپ کر لیا۔“ ”نہ۔ نہ۔ بوجھل آواز

میں۔“

”چھپنے کی کوشش میں تو ظاہر ہوئے جا رہے ہو۔“ آصف نے سب سامنے کر دیا۔

”فرجاد نے چونک کر آصف کے چہرے کی طرف دیکھا۔ فرجاد کا راز راز نہیں تھا۔ آصف

کا چہرہ آئینہ تھا۔ سب کچھ صاف صاف نظر آ رہا تھا۔

دونوں کی حالت عجیب سی تھی۔ ایک دوسرے کے سامنے مجرموں کا سا احساس لئے کھڑے

تھے۔ چپ چاپ۔ لیکن خاموشی بول رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ سن رہی تھی۔

لفافہ کھڑکی ہی میں رکھ کر فرجاد رخ پلٹ کر دیوار سے پشت نکال کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا داغ

حوالہ دھواں تھا۔ جسم بالکل بے جاں ہوا جا رہا تھا۔ کھڑے ہو گا بھی دشوار تھا۔

”مجھے افسوس ہے آصف۔“ فرجاد ان کی باتوں کے جواب میں خود ہی کہہ اٹھا۔ ”مجھے معاف

کردینا۔ میں یہاں سے دور جا رہا ہوں۔ اتنی دور کہ تمہیں کسی کنایت کا موقع نہیں دوں گا۔ یہاں

رہتا تو تمہارے لئے بھی وجہ پریشانی بن جاتا۔ اب تو۔“

”فرجاد۔“ بے اختیار ہو کر آصف نے اسے لپٹا لیا۔ ”کاش۔ کاش۔ مجھے پہلے پتہ ہوتا۔

کہ۔ تم۔“

فرجاد نے آصف کے شانے پر ٹکا ہاتھ زور سے نفی انداز میں ہلایا۔ زبان سے کچھ نہیں

بولا۔ ہاں اس کے سینے میں ٹوٹی ٹکڑیوں کی دھمک آصف نے اپنی چھاتی میں محسوس کی۔ اس کا دل

پگھل رہا تھا اور کہیں سے کروا کروا دھواں اس کی آنکھوں میں گھسنے لگا تھا۔

ارادوں کا علم نہیں تھا۔ پھر بھی سب سمجھ جاتے کی کوئی کوفت کو دل میں تیز سے کی لٹی کی طرح اترتا۔
مردوں کر رہے تھے۔ سوگوار نفعنا تیار رہی تھی کہ فرجاد بیش کے لئے جا رہا ہے۔

اس کی بوڑھی مائے جان نے جب اسے پیار کرنے کے لئے سینے سے لہلہایا۔ تو وہ بے اختیار ہو کر رو
دی۔ فرجاد کا دل بھی پھر آیا۔ اور اس کی خوبصورت حسین آنکھیں دھندلا گئیں۔ کتنی ہی دیر وہ اٹا کا
ہاتھ چرو دو دوں ہاتھوں میں لئے دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ شفیق چہرہ پھر کبھی نظرنہ آئے گا۔

وہ ہر چہرے کو کچھ ایسی ہی الوداعی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ چہرے ایسے تھے۔ جنہیں واقعی
دو نگاہوں میں جذب کر لیتا چاہتا تھا۔ غلام رسول بھی ان میں سے ایک تھا۔ وہ کتنی ہی دیر اسے
پائے کھڑا تھا۔ اس نے جب سے آنکھ کھولی تھی۔ اٹا اور غلام رسول کو شفقتیں اور محبت
بمبارد کر کے پایا تھا۔

غلام رسول رو رہا تھا۔ اس نے آثار بھانپ لیا تھا کہ فرجاد ایک طویل مدت کے لئے جا رہا ہے
۔ یہ طوالت اتنی ضرور تھی۔ کہ اسے یقین ہو رہا تھا۔ اپنی زندگی میں فرجاد کو پھر نہ دیکھ پائے گا۔
فرجاد نے اس سے چند گھنٹے پہلے کو کچھ کہا تھا۔ اس سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ کہ وہ
دوبلی کو بیش کے لئے چھوڑ کر جا رہا ہے۔

رخصت ہونے سے پہلے فرجاد حویلی کے ایک ایک حصے میں گیا۔ دروہام کو لگا ہوں کا دروازی
کھلا کیا۔ اماں بی کے کمرے کی تو ایک ایک چیز کو چھوا۔ یہ کمرہ اسے بیش آغوش مادر کا احساس دلاتا
تھا۔

وہ حویلی کے پچھلے میدان کی پشت پر اپنے آبائی قبرستان میں بھی گیا۔ اماں بی عالی نور محمد اور
ابو جہاں حسین کی قبروں پر فاتحہ پڑھی۔ زندوں سے چھڑنا تو مشکل تھا ہی اسے تو اس وقت مٹی کے ان
اجروں سے چھٹنا بھی دکھ دے رہا تھا۔ لیکن۔ لیکن۔ پھر بھی اسے جانا تھا۔

آصف پھر آیا ہوا تھا۔ فرجاد کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ لیکن زبان لنگ تھی۔ آنکھوں میں
دیرانی اور چہرے پر کرب و کوفت کے سائے لہرا رہے تھے۔ دونوں اپنے اپنے وجودوں میں یاویسیوں
داہو بہہ سیتے تھے۔ ایک دوسرے سے قریب ہونے کے باوجود دور دور رہتے تھے۔

”فرجاد کے اچانک سہمہ ریا رچلے جانے کی خبر گل بانو تک بھی پہنچی تھی۔ پہلے تو اسے کچھ سمجھ
ہی نہ آئی لیکن جب حویلی کے ہر فرد کی زبان سے تشویش کے انداز میں باتیں سنیں تو وہ بھی اداس ہو
گئی۔ لیکن فرجاد سے ناراض تھی۔ اپنے کمرے سے باہر نہ آئی۔

فرجاد سب سے مل چکا۔ تو اس کی آنکھوں میں گل بانو کے انتظار کی ترتیب تھی۔ آصف یہ
مردوں کر رہا تھا۔ دو ایک دفعہ گل بانو کو بلا بھیجی تھا۔ لیکن وہ ناراض جو تھی۔ نہ آئی۔
”گل سے نہیں ملو گے۔“ آصف نے خود ہی فرجاد سے کہا۔

فرجاد کے جانے کی خبر خاصی دھماکہ خیز تھی۔ جس نے سنا مجسم سوال بین گیا۔

”کہاں جا رہا ہے۔“

”کیوں جا رہا ہے۔“

ہر زبان پر ایسے ہی سوال تھے۔ رشتہ دار عزیز۔ نوکر چاکر ایک دوسرے سے یہی سوال بار بار کر
رہے تھے۔ ہر کوئی لپک کر فرجاد تک پہنچ رہا تھا۔ آصف سے پوچھ رہا تھا۔

دونوں حتی المقدور سب کو اطمینان دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بے زبانی سے جو دونوں کے
درمیان معاہدہ ہوا تھا۔ اسے بھلا رہے تھے۔

”ہائے ہائے یہ بھی کیسا اندھیر۔ پورے گھر میں کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔ سیرت تفریح کے لئے جا
تھا۔ تو یہ پورا رستہ کیوں اختیار کیا۔“ خالد بھالی نے زبردست شکوہ کیا۔

”بھئی یہ اپنے مالک آپ ہیں۔ پہلے کون سا ہم لوگوں سے پوچھ کر پوچھ کر قدم اٹھاتے تھے۔
جواب جانے کی خبر پہلے سے نشر کر دیے۔“ فوزی کی امی ہنستے لمبے میں پھریں۔

”وہ پہلے بتا بھی دیتے تو کیا فرق پڑتا۔“ رحیم خالو نے کہا۔

”اس اچانک خبر نے تو سن سن کر دیا مجھے۔“ آصف بچا بولے۔

”چھ مہینے سال تو لگ ہی جانے لگا۔ پورے دس کا معاملہ ہے۔ خدا آگے پیچھے خبر رکھے۔“ دلگنجیہ
نے گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔

حویلی کے کئی عزیز مرد جو عرس لڑکین لڑکے کے بچے بوڑھے فرجاد کی نشست گاہ میں اسے گھیرے
ہوئے تھے۔ دروازوں میں اس کے ملازمین بھی منہ لٹکائے کھڑے تھے۔ غلام رسول تو بار بار
آنکھوں کے گوشے پونچھ رہا تھا۔ مسکرائے کی کوشش ناکام ہوتی جا رہی تھی۔ سب سے چھڑنے کا
تجربہ خاصا تلخ تھا۔

رواگی میں تھوڑا وقت رہ گیا تھا۔ اس کا سامان گاڑی میں رکھا جا چکا تھا۔ اور وہ سب عزیزوں
سے آخری بار مل رہا تھا۔ کسی سے مصافحہ کر رہا تھا۔ کسی سے گلے مل رہا تھا۔ کسی کو فرجاد کے

”وہ آئی نہیں۔“ فرجاد نے بھرموں کی طرح سر بھٹا کر کہا۔
”تم سے ناراض ہوں۔“

”کیوں؟“

”بہت دنوں سے تم اپنے آپ میں گم تھے نا۔“

”ہاں۔ میں نادام ہوں۔ اس سے بہت ترشروٹی برتا رہا ہوں۔“

”اسی لئے، وہ تم سے خفا ہے۔“

فرجاد پتلی کی مسکراہٹ یوں پر لاتے آصف کو دیکھ کر رہ گیا۔

”وہ تم سے بہت پڑ کر رہتی ہے فرجاد۔“ آصف نے خمیرے آواز میں کہا۔ فرجاد نے چونک کر

اسے دیکھا۔ وہ بے طرح ہوا گیا۔

آصف چند لمحوں پہلے چپ رہا۔ پھر ہاتھ میں پکڑی، دوڑک چلی کہ انگلی کے گرد دھراتے ہوئے سچیدگی

سے بولا۔ ”پیارے بیٹا، عموں پر اٹل اٹل سچائی ہے آصف۔ ہاں اس کی قسمیں الگ الگ ہو جاتی

ہیں۔ کس یہ مبتلا ہے۔ انہیں جس۔ کس روحانی قدرے کس آفاقی گلن۔“

فرجاد اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اثبات میں سر آہوں آپ ہل گیا۔ آصف اسے گل بانو کے پاس

لے آیا۔ گل اپنے کمرے میں تھی۔ آصف اندر داخل ہوا۔ فرجاد دروازے ہی میں رک گیا۔

”گل آصف۔ نہ پکارا۔“

”جی۔“ وہ بولی۔

”ادھر دیکھو تمہارے گل لالہ آئے ہیں۔“ آصف نے کہا۔

”آئے ہیں تو میں کیا کروں۔“ وہ خفا تھی۔

”گل۔“

”ہوں۔“

”گل لالہ آئے ہیں۔ وہ جا رہے ہیں۔ یہاں سے۔“

”جیسٹ ہیوٹ کے لئے۔“ فرجاد نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ گل بانو اور آصف نے بیک

وقت فرجاد کی طرف دیکھا۔

فرجاد کے چہرے پر ویرانی اور خشکی اس طرح بکھری تھی کہ دیکھنے والی نظریں چاہنے کے باوجود

ترپ اٹھتی تھی۔ گل بانو اپنے گل لالہ کا اتنا مغموم اداس اور پریشان چہرہ دیکھ کر اپنی خشکی اور

ناراضگی بھول گئی۔ بے اعتبار ہو کر آگے بڑھی اور فرجاد کے کندھے کو پکڑ کر بولی۔ ”میں گل لالہ

نہیں۔ آپ کہیں نہیں جاسکتے۔ میں چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔ میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔

میں گل لالہ کبھی نہیں۔“

فرجاد بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ گل بانو اس کے کندھے سے لگی کھڑی سسک رہی تھی۔ اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ جسم سے سارا خون جمع ہو کر دماغ میں بھر گیا تھا۔ ہاتھ بانو بے سکت تھے۔

اور اچھے پڑنے کی مٹھی مٹھی پوندیں آگئی تھیں۔

آصف بالکل خاموش کھڑا تھا۔

چند لمحوں جیسے عالم نزع میں گزرے۔

پھر فرجاد نے اپنے گلے ہوئے بے جان ہاتھ اٹھائے۔

دھیرے سے گل بانو کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

اس کا سر بھٹکا۔

اور

اس کے ہونٹ گل بانو کی پیشانی سے چوم گئے۔

پیار کا جذبہ بنیادی طور پر اک اٹل سچائی ہے۔

ہاں۔

اس کی قسمیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔

خدا جانے۔

پیار کی یہ کون سی قسم تھی۔

لیکن۔

آج سہ پہر کا واقعہ انوکھی نوعیت کا تجربہ تھا۔ فرجاد ہاتھوں میں سر دیے اسی کے متعلق سوچ رہا تھا۔

یہنا۔

گل بانو تھی۔

گل بانو۔

یہنا تھی۔

جب وہ ہوش واپس آیا تھا۔ تو بڑی حد تک حواس باندھ ساتھ۔ یہنا خوف کی لہریں کر اس کے وجود میں کچھ پیدا کر رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے برسوں پہلے کے واقعات پھرے دہرائے جانے کے سامان ہو رہے ہیں۔ آزمائش کی وہ کیفیتائیں جن سے فرجاد حاصل کرنے کے لئے وہ مسلسل مہین سال دیار فریض میں پھٹکا پھرا تھا۔ اپنے گھر سے دور بھاگا تھا۔ اپنے اہول سے اپنی فضا سے متہ موڑ گیا تھا۔ پھرے اس کی راہ میں تازہ دم ہو کر آن کھڑی ہوئی تھی۔

لیکن۔

اب اس کی سوچوں کے زاویے بدل رہے تھے۔ اس کے ٹکان ذہن چرے پر کچھ ٹھانگنی عود کر رہی تھی۔ اس کی خوبصورت سیاہ آنکھوں میں کچھ چمک سی آگئی تھی۔

وہ انھہ کر کرے میں مٹنے لگا۔ اک سرور آئینے جیسی اس کی رگوں میں پھیلنے لگی۔ اس نے اپنی سرکٹ پھونک ڈالے۔ کتنی بار کرسی میں بیٹھا۔ بستر میں لیٹا۔ کھڑکی کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

وہ سوچ رہا تھا۔

کہ جذبے صادق ہوتے ہیں۔ پیارا اٹل چٹائی ہے۔ وقت ہمیشہ بے رحم ہی نہیں رہتا۔ قدرت کے کرکھ کو پہنچ ہے۔ اور کھو کر دے دیتی ہے۔ گل بانو اس کا پہلا اور سچا پیار تھی۔ حالات و واقعات نے اسے اس کی پہنچ سے دور کر دیا تھا۔

لیکن۔

گل بانو اب یہنا کے روپ میں پھر آگئی تھی۔ وہی قد و قامت وہی حسن و جمال وہی سیاہ لہراتے بال۔ وہی چال و ڈھال وہی ہنسنے کا انداز۔ دل کے ویران چونکے میں بے پرتی طرح فٹ آ رہا تھا۔ عمر بھر کی مایوسیوں کا یوں اور نامرادیوں کا قدرت اسے شاید صلہ دینے والی تھی۔ اسی لئے بیس سال کی مسلسل کمبانی کے بعد وہ وہ طون ٹون کیا تھا۔

اس لئے۔

یا گل۔

فرجاد نے ایک طویل انگڑائی لی۔ اور بیڈ کے کنارے پر اٹھ بیٹھا۔ گھڑی دیکھی رات کے بجتے والے تھے۔ فرجاد نے سر کو دو تین بار جھکا پھر انگلیاں بالوں میں الجھائیں۔ اس کے ہاتھ تھامے ہی رہے۔ وہ کتنی دیر باضی کی بھول حلیوں میں کھویا تھا۔ کتنے توان تر سے سب باتیں یاد آ رہی تھیں۔

اس کا یورپ جانا۔ پھر ملک ملک۔ شہر شہر گھومنا۔ نئے نئے لوگوں سے ملاقاتیں۔ نئے چہروں سے شناسائی۔ کتنے چہروں کی رعنائیوں میں ڈوبا۔ کتنی حسین دوشیزائیں اس کی زندگی آئیں۔ مشرقی دیں کا پر اسرار سا شہزادہ مغربی حسیوں کی توجہ اور دلکشی کا مرکز بنا رہا۔ اس نے خوب کلیاں کوچیں خوب پھول روئندے۔ جنسی اشتیاق مانے کے لئے باسی خوراک پر بھی اکتفا کر آوارہ اور آہرد باندھ لڑکیاں بھی راہ میں آئیں۔ تو تسکین ملی۔ کتنے سال وہ اخلاق و کردار کی وہ حد توڑ رہا۔ جن کے تحفظ کے لئے وہ برسوں شہقت کرتا رہا تھا۔ وہ وطن کی گرفت سے نکلا تو اس۔ ہر قید تو ڈالی۔ اصول و ضابطے سب کو خیر باد کہا۔ شراب اور عورت۔ وہ کتنے سال صرف ان چیزوں کے گرد گھومتا رہا۔

لیکن بے قرار روح کو قرار نہ آیا۔ اس کے اندر شکست خوردگی کا احساس بڑھتا پھیلتا گیا۔ پھر کچھ عرصہ اس نے محض راحت میں گزارا۔ یہ بھی راس نہ آئی۔ تو مس ایڈنا سمتر ساتھ اذ و ابی بندھن باندھ لئے۔ ایڈنا کے حسن نے اسے معروب نہیں کیا تھا۔ بلکہ ایڈنا مسکراہٹ اسے گل بانو کی مسکراہٹ کا پر تو نظر آیا تھا۔

یہ شادی انکھوں اور سکھوں کا استخراج تھی۔ فرجاد مسلسل دس سال نہ ڈوبا۔ نہ کنارے لگا۔ ایڈنا سے علیحدگی میں بھی فرجاد کی ذہنی بے چینی کا بکثرت وصل تھا۔ دو تین سال سے وہ پھر پھر رہا تھا۔

اب گل بانو کی موت کی خبر اسے یہاں پہنچ لائی تھی۔ اسے اپنا گھوڑا دیا تھا۔ گھر جو گل بانو مرنے کے بعد اس کے لئے آخری گوشہ عافیت تھا۔

اس لئے۔

فرجاد کو یوں لگا جیسے خوشیاں اس کے سینے کی وسعتوں سے زیادہ ہی پھیل رہی ہیں۔ وہ اس کے
میں مسکرائے جا رہا تھا۔ یہ مسکراہٹ اس کی روح کی گہرائیوں سے اُٹھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں
میں مستقبل کے سامنے اور سفرے پہنے گھل رہے تھے۔

مستقبل جو آہنی دیوار ہے۔ اور جس سے پار ہم کچھ نہیں دیکھ سکتے۔ صرف قیاس آرائیوں اور
قیافوں کا ہی سارا پیلے ہیں۔ یہ قیاس اور قیافے حال ہی کی کوکھ سے تو جنم لیتے ہیں۔ ہم ان کی
سورہوں سے ہی پورا پورا اندازہ لگا لیتے ہیں کہ یہ کتنے خوشگوار یا ناخوشگوار ہوں گے۔

فرجاد کا اندازہ خوش کن تھا۔ وہ اپنے دل میں مینا کے لئے وہی جذبات رقصاں پا رہا تھا۔ جو
مذہبوں پہلے تلخ بانو کے لئے اس کے سینے میں موجزن تھے اور جنہیں دیانے کے لئے مٹانے کے لئے
وہ غم غم بٹھا رہا تھا۔ ملک ملک کی خاک چھائی تھی۔ حسین چروں میں پناہ پانے کی کوشش کی تھی۔
جہن و ساروں میں بادیں کی کوشش کی تھی۔

لیکن اس کا پیار سچا تھا۔ اُمّت تھا۔ انوث تھا۔ یہ ہر پھر کر پھر اپنے مرکزی طرف آ رہا
تھا۔ اپنے محور کو لوٹ رہا تھا۔

وہ بے انتہا سمجھتا تھا۔ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے نرم نرم لطیف بالوں کے دوش پر اڑا جا رہا ہے۔
جیسے گلریز وادیوں میں گھوم پھر رہا ہے۔ جیسے جنتی بوؤں کی زوہیں آں بیٹھا ہے۔

قدرت کس قدر بڑی تھی۔ خدا سے بزرگ و بڑبڑستار جیم و کریم تھا۔ فرجاد کو راواں
سر شاہ تھا۔

اور

کتنی ہی مدت کے بعد اسے بارگاہ ایزدی میں سر جھکانے کا خیال آیا۔ وہ اس عظیم طاقت کے
حضور مجید و ریزہ ہو کر جذبات شکر کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ جس نے اس سے گل بانو جبین کر پھروے
دی تھی۔

اس نے کبڑے تہہ ل کئے۔ وضو کیا اور مجدد شکر ادا کیا۔ وہ سر جھکائے کتنی ہی دیر بیٹھا رہا۔
اسکی آنکھیں خوشی سے غم غم ہوتی رہیں۔

وہ جذبات کی رود میں کچھ اس تیزی سے بہہ رہا تھا۔ کہ اسے احساس ہی نہ ہوا۔ کہ اس کے اور
میتا کے درمیان میں سال کا طویل عرصہ حاکم ہے۔ مینا۔ مینا ہے گل بانو نہیں۔ اٹھارہ اسی سالہ
نوجوان جو ابلی اور وہ خود اویس عمری کی دھلان پر۔

لیکن۔

شاید

جذلوں کا وقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ لمحوں کے اسیر نہیں ہوتے ان پر زمان و مکان کی
کرفت نہیں ہوتی۔ یہ کبھی چھوٹے ہوتے ہیں نہ بڑے بیش ایک سے رہتے ہیں۔ عمر کا گھٹنا بڑھنا
ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ یہ سدا بہار ہوتے ہیں۔

اس رات فرجاد بارہ ایک بجے تک اپنے جانے پہچانے شہری سڑکوں پر گھومتا رہا۔ کئی پرانی
دکانوں پر گیا۔ کئی سٹے پر بس کے ادارے دیکھے۔

وقت گزاری کا حیلہ تھا وہ نئی گھومتا پھرتا رہا۔

ہم سمجھتے ہیں ہم وقت کو گزارتے ہیں۔ لیکن وقت ہمیں گزارے چلا جاتا ہے۔

انسان غرض کا بندہ ہے۔ فرجاد بھی انسان تھا۔ وہ جن جذلوں کے تحت وطن لوٹ آیا تھا۔ وہ
جانے کہاں روپوش ہو چکے تھے۔ اب تو اسے اپنی نئی خوبصورت اور پر آسائش زندگی کی تنہا چین
نہیں لینے دے رہی تھی۔ کب رات ڈھلے اور نیا سورج طلوع ہو۔ فرجاد آرام دہ بستری پر بے قراری
سے کروٹیں بدلتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

سوئے جاگئے رات کت ہی گئی۔ پچھلے سپر وہ بے خبر ہو گیا اور ان کے کندھ کمرے میں وہ دن
پڑے تک سوتا رہا۔ شاید سارے فیصلے کر کے چین پا لیا تھا۔ ایسی ٹینڈ تو پچھلے چھپ چھپ میں برسوں میں نشہ
آوردہ و آئینہ امتحان کر کے بھی نہ پائی تھی۔

دس بجے کے قریب ٹیلیفون کی مسلسل بجنے والی گھنٹی نے اسے بیدار کیا۔ وہ اٹھا۔ تو ہشاش
بشاش تھا۔ جسم پکا پھکا اور روح تازہ دم تھی۔ میرے کو لانے کے لئے اس نے تیل بجائی۔ اور خود
منسل خانے میں کھس گیا۔ حویلی وہ پورے شاہانہ ٹھاٹھ یا ٹھہرے جانے کے لئے تیار ہونا چاہتا تھا۔

لیکن قدرت کو منظور نہ تھا۔ کہ وہ آصف اور گل بانو کے گلشن حیات کو مرکا نہیں۔ بیوں فوت ہو گئے۔ یوں بیٹا جو پہلے ہی ماں کی آنکھوں کا نور اور باپ کے دل کی ٹھنڈک تھی۔ بہت ہی پیاری اور لاڈلی ہو گئی۔

آصف بیٹا کا باپ تھا۔ اس کی ہر حرکت جس بات کی غماز ہوتی۔ اسے پتہ چل جاتا۔ منہی منی کر لیا۔ اب وہ اتنی بڑی ہو گئی تھی۔ وہ ایک ایک لمحہ جس نے اس کے وجود اور ذہن کو تغیر کیا تھا آصف کی نظروں میں تھا۔ پھر کیوں نہ اسے بیٹی کے اخلاق کردار اور عادات کا پتہ ہوتا۔

بیٹا نے ابو سے جب کوئی بات منوائی ہوتی تھی۔ تو انداز خطاب ایسا ہی ہوتا تھا۔ اگر ابو یوں مسکرا کر پوچھ نہ لیا کرتے۔ تو وہ ان کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر جھول جایا کرتی تھی۔ ابو کو اس کی بات ماننا پڑتی۔

جب تک گل بانو زندہ تھی۔ وہ اکثر آصف سے الجھ جاتا کرتی۔

”بہت سرخسار ہے ہیں آپ اسے۔“

”اتنی بڑی ہو گئی۔ سنجیدگی آئی نہیں رہی اس میں۔“

”جے جالاؤ لڑکیوں سے کبھی نہ کرنا چاہئے۔“

”آپ آسے بچہ ڈریں گے۔“

”ہر بات پوری کر دیتے ہیں اس کی۔ کچھ رعب داب بھی ہونا چاہئے باپ کا۔“

آصف مسکرا دیا کرتا۔ بڑی محبت اور ملاصرت سے گل بانو کو سمجھاتا۔ ”بیٹا بہت اچھی بچی ہے۔

اس کی تربیت جس طرح ہوتی ہے۔ لاڈ پیار سے اس کے کردار کو جلائے گی۔ مجھے اپنے خون کا پتہ ہے۔ انشاء اللہ میری بیٹی کبھی نہیں کمرے کی۔ یہ چاؤ کھنے دقتی ہیں۔ بیٹی ہے کسی نہ کسی دن پرانی ہو جائے گی۔ یہ دور یاد کیا کر کے کل بانو تمہارے بابا بھی تو تم سے اتنا پیار کرتے تھے۔ نا۔“

اور

کبھی کبھی گل بانو کو چھیننے کے لئے کہتا۔ ”تمہارے بابا نے تمہاری محبت کی راہ بھی ہموار کر دی تھی۔ تم نے مجھے جلا کر انہوں نے تمہیں میرے حوالے کر دیا۔“

گل بانو اکثر شہر کا سرخ ہو جاتی۔ لیکن کبھی آصف کے سر بھی ہو جاتی۔ ”تو آپ بھی بیٹی کے لئے ہاں راہ ہموار کریں گے۔“

”ہاں گل۔ بیٹا کے انتخاب کو میں رد نہیں کر سکتا۔ اور مجھے یقین ہے۔ کہ رد اپنے باپ کی طرح اس کا انتخاب بھی لا جواب ہو گا۔“ آصف ہنس دیتا۔ اور گل بانو بھی ذرا ب مسکراتی لگتی۔

گل بانو کے بعد تو آصف کی زندگی بیٹا پر ہی مرکوز ہو چکی تھی۔ وہ سوچتا گل بانو کو واقعی اس سے لاڈل محبت تھی۔ وہ خود اس سے فضا کے ہاتھوں دور ہو گئی۔ لیکن بیٹا کو اپنا عکس بنا کر آصف کے

”ابو۔“

”ہوں۔“

”ابو جانی۔“

”جی بیٹے۔“

”ابو جان کی۔“

”ہاں ہاں کو۔ لگتا ہے۔ کوئی بڑی ہی فرمائش ہے جو اتنی چالوسی ہو رہی ہے۔“

”ہائے ابو۔ میں تو یوں ہی پیار سے آپ کو بلا رہی ہوں۔“

”اچھی طرح سمجھتا ہوں اپنی بیٹا کو۔“

”واقعی ابو۔“

بیٹا کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔ آصف بھی اخبار میز پر رکھ کر مسکراتے لگا۔ دن اپنی مسافت طے کر رہا تھا۔ مطلع ابر آلود تھا۔ اسی لئے سورج کی قزاق قدرت سے کم تھا۔ ورنہ دس گیارہ کا محل ہو۔ تو پیش بھلسانے کے درپے ہوتی ہے۔ لیکن ساون کا آغاز گرمی کی حدت و شدت کو کم و بیش کرنا تو رہتا ہے۔ ریم جھم گھٹائیں آگئیں تو بل بھر جس محل تھل۔ ہوا میں موج میں آجائیں۔ تو پھر موسم کی رنگینیاں لگنا کتنا۔ آج بھی موسم کے طور پر کچھ ایسے ہی نظر آ رہے تھے۔ بال گھر گھر کرینہ چرخم آ رہے تھے۔ صبح تو خاصا تھا۔ لیکن اب ہوا چلنے لگی تھی۔ یہ ہوا خشک نہ تھی خشک تھی۔ جس سے ارد گرد ہوائی بارش کا پتہ چلتا تھا۔

آصف رات ہی گاؤں سے واپس آ گیا تھا۔ دھان کی فصل کی ہوائی ہو رہی تھی۔ حسب عادت وہ یہ کام اپنی گھرائی میں کر دیتا تھا۔

آج وہ گھر پہنچا تھا۔ اپنی نشست گاہ میں بیٹا اخبار دیکھ رہا تھا کہ بیٹا آگئی۔

اور جس انداز سے اس نے ابو کو مخاطب کیا۔ آصف کے لئے سمجھنا مشکل نہ رہا۔ کہ کوئی فرمائش کرنے والی ہے۔ یا کسی چٹک پائی کی اجازت لینے کی تمہید باندھ رہی ہے۔

اٹھارہ اسیں سالہ بیٹا آصف کی کھلکی اولاد تھی۔ اس کے بعد اور سترے تین بچے پیدا ہوئے۔

لے بھور گئی۔

”ہاں تو بیٹے جی۔ کیا کہنا ہے۔“ آصف نے ہلکی سی انگڑائی لیے ہوئے کہا۔

”ابو۔ ناصرہ نامی لڑکی کے متعلق میں نے آپ کو بتایا تھا۔“

”وہ۔ وہ بیٹیم لڑکی۔ جس کی شادی کا کوئی سلسلہ ہے۔“

”ہاں وہی۔“

”پھر۔“

”تو لائے کچھ روپے۔“

”نکلتے چائیں۔“

”کم از کم“ فیٹا نے اپنے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں پھیلاتے ہوئے مسکرا کر ابرو کو دیکھا۔

”پانچ سو۔“

”ہوں۔“

”اور پیسے بھی تو جمع ہوئے ہوں گے۔“

”سارے گروپ نے دیئے ہیں ابو۔“

”پھر تو کافی جمع ہو گئے ہوں گے۔“

”بس کسی نے سو کسی نے پیچاس؟“

”اور ہمارا بیٹا پانچ سو۔“

”کوئی زیادہ تو تھوڑے ہیں ہی ابو۔ اتنے امیر ہیں اور۔“

آصف کھل کر ہنس رہا۔

”بیٹے جی۔ آپ سے اتنی دفعہ کہا ہے کہ آپ اتنے امیر نہیں ہیں جتنا اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔“

یہ سب۔

”بس ابو۔“ فیٹا نے ہاتھ احتجاج کے طور پر اٹھایا۔ ”رام کہانی نہ شروع کر دیجئے گا میں

ٹکالے پیسے۔ دیر ہو رہی ہے۔ آج سب نے نغمانہ کے گھر جمع ہو کر فیصلہ کرنا ہے۔ کہ کیا کیا جائے

ناصرہ کی شادی کے لئے۔“

”ہوں۔“

”ابو۔“

”ہوں۔“

”آپ کو خوشی نہیں ہوتی کہ آپ کی بیٹی اتنے اچھے اچھے کام کرتی ہے۔ پتہ ہے ابو میرا سامنا

گروپ مجھے کرپٹ دیتا ہے۔ شکا کہ تو مجھے کبھی ہی ریاضا مرے۔ اور یوسف و عمران بھی بیٹا دیا

کہ بیٹ ہی کہہ کر مجھے بلاتے ہیں۔“

”دیکھی کے کام کا اشتہار نہیں ہونا چاہئے بیٹے۔“ آصف نے سر تلے ہاتھ کر سر کر سی کی

بابت پر رکھ دیا۔

”نیا میز پر آ بیٹھی۔“ دس بھی نہ ابو۔ سب میرا انتظار کر رہے ہوں گے سارا گروپ بیٹھا ہو

گا۔“

آصف نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا۔ غور سے بیٹا کو دیکھا۔ اس نے چند دن ہوئے حویلی کے کسی

لباس سے کچھ اتنی اڈنی خبر سنی تھی۔ موقع اچھا تھا پوچھنے کا اسے یقین تھا کہ بیٹا اس سے کوئی بات

نہی نہ رکھے گی۔

”بیٹا بیٹے۔“

”جی۔“

”سنا ہے تمہارے گروپ میں ایک اضافہ ہوا ہے۔“

بیٹا نے ایک دم سر اٹھا کر ابرو کو دیکھا۔ ابو کی نظروں سے وہ بھانپ گئی۔

”ہاں ابو۔“

”کون ہے وہ۔“

”ارش۔“

”ارش۔“

”بہت اچھا انسان ہے ابو۔ بہت تخلص۔“

بیٹا کے گالوں پر شفق کی سرخیاں لہرائے لگی تھیں۔ اور آنکھوں میں ستاروں کی ہلک سی کھل گئی

تھی۔ ارشی کے متعلق وہ بھی ابو کو بتانا ہی چاہتی تھی۔ اچھا ہی ہوا بات ان کے علم میں آگئی تھی۔

آصف نے ارشی کے متعلق کئی سوال بیٹا سے پوچھے۔ تعاقب کتنی ہے۔ کر آیا ہے۔ مشغل کیسے

ہیں۔ اخلاق و کردار عمراور رکھ رکھاؤ کے متعلق پوچھتا رہا۔ بیٹا بھی کسٹبل منسلک کر بڑی سچائی سے

بات کا جواب دیتی رہی۔ اس یوں لگ رہا تھا جیسے کراہنہ ان میں بیٹھی ہے۔ احتیاط لازم تھی۔

اماں کو حاضر رکھنا تھا۔

”اچھا تو صاحبزادے ملازمت کی تلاش میں ہیں۔“

”ہاں ابو۔ بیکار دوں میں خوش و غصہ کا کام کر رہے ہیں ہمارے ساتھ۔ عمران کے بڑے بھائی

لے گا اس فیوہر پکے ہیں۔“

بیٹا نے بھی جتنی معلومات فراہم ہو سکی تھیں۔ ابو کے حضور پیش کر دیں۔

”آپ ان سے ملنا چاہیں گے۔“ بیٹا نے امید کے چراغ جلائے۔

”ہوں۔“

”آپ جاؤں ابو۔“

”آؤ گی کب۔“

”جب فرصت ہوگی۔ شاید شام تک آتا ہو۔ ہو سکتا ہے دوپہری کو آجاؤں۔“

آصف چنر لمبے کچھ سوچتا رہا۔ ٹینا نے اپنا چمک دوپٹہ نگلے میں برابر بکرا۔ نوٹ بیگ میں رکھے۔

اور ابو کو خدا حافظ کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔

”سنو بیٹی۔“

”جی۔“

”آپ اپنے پورے گروپ کو کل چھوٹی سی جائے پابلی میں بلا لو۔ ہوں۔“

ٹینا نے بڑی خوبصورت چمکتی اور مسکراتی نگاہ ابو پر ڈالی۔ اور پھر انصلاقی لہرائی کرے سے

بھاگ گئی۔

امتحان کا پہلا مرحلہ وہ یقیناً کامیابی سے نپٹا آئی تھی۔

”کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ کسی دن بلا لو۔ مل لیں گے۔“

”تو پھر جو جائے ابو ایک زبردست پابلی۔“

”نہ سمجھتی نہ۔ پابلی کے لئے وقت نہیں میرے پاس۔“

”ہں آپ کے پاس تو وقت کبھی ہو نا ہی نہیں۔“

”پابلیا غصہ۔“

”اور نہیں تو کیا۔ شاکہ نہت اور نغمان کے بھی تو ابو ہیں۔ ذرا بات منہ سے نکلی فٹ سے

تیار ہو جاتے ہیں۔ ایک ہمارے ابو ہیں۔ کہ ساری عرو و سروں کا حساب کتاب کرتے ہی گزار

دی۔“

آصف ٹینا کے انداز پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن وہ دو عجمی رو عجمی عجمی تھی۔ آصف نے

پرلی میز پر رکھا اپنا بریف کیس کھینچا۔ کھینچوں پہ رکھ کر کھولا۔ اور پانچ نوٹ نکال کر بریف کیس بند

کر کے قالین پر رکھ دیا۔

”لو بھئی۔“ اس نے پانچوں نوٹ ٹینا کی طرف بڑھا دیئے۔

”شکریہ۔“ ٹینا چھٹا ہمت کی اداکاری کرتے ہوئے بولی۔

”ہاں تو ٹینا بیٹی۔ یہ ارشی میاں ہیں کس خاندان کے۔“ آصف نے ٹینا کی دلچسپی کا اندازہ کر لیا

تھا۔ اس کا موڈ ٹھیک کرنے کو پوچھا۔

”ایک جراثیم پیشہ خاندان کے۔“ وہ جان بوجھ کر جل کر بولی۔

”کیا۔“ آصف حیران ہوا۔ تو کھٹک کر ہنس پڑی۔

آصف بھی مسکرائے لگا۔ وہ نوٹ مٹھی میں پکڑے پکڑے اٹھی۔ اور پشت سے ابو کے گلے

میں بائیس ڈال کر اپنی ٹھوڈی ان کے کندھے پہ رکھے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ”سول بج

عبداللطیف کو آپ جانتے ہیں۔“

”ہاں۔“

”ارش نہیں کا بیٹا ہے۔“

”اوہ۔ اچھا۔ لطیف کا بیٹا ہے۔ میرے ان سے اچھے تعلقات ہیں۔“

”وہ بھئی۔“

”ہاں۔ ہاں۔ عدالت کا اور میرا تو برسوں کا ساتھ ہے۔ یہ دو سری دفعہ پوسٹ ہو کر میاں آئے

ہیں۔ میں ملوں گا ان سے۔“

”میں ارشی کو آج ہی بتاؤں گی۔ یقیناً اسے آپ کے اور اپنے ابو کے تعلقات کا علم نہیں

تھا۔“

ہوئے فرجاد کی طرف اشارہ کیا۔ ”صاحب کو ڈرائیونگ روم میں بٹھا کر ابو کو ان کی اطلاع دے

۔“

وہ فرجاد کی طرف دیکھے بنا اپنی گاڑی میں جا بیٹھی۔

فرجاد نے بیئرے کو ہاتھ کے اشارے سے واپس کر دیا۔ وہ بعد شوق بیٹھا کو تک رہا تھا۔

بیٹھا نے گاڑی سٹارٹ کر کے شرارت سے فرجاد کو ہاتھ ہلایا۔ اور پھر گاڑی نکال کر لے گئی۔

جاسنے کیوں یہ اچھا سا ادھر عمر آوی اسے ہائوس ہائوس سا لگا تھا۔ ذہن پر کافی زور دیا۔ لیکن
وادیہ آیا۔ کہ پہلے اسے کب اور کہاں دیکھا ہے وہ اس کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ لیکن اسے اچھا لگا
تھا۔ خدا جانے اس کی شکل و صورت ہی اچھی تھی۔ یا چہرے پر مسکراہٹ بڑی اپناہٹ لئے تھی۔

یا

یا شاید وہ شائستہ اور مذہب ہی اتنا تھا کہ اسے اچھا لگتا ہی جاسنے تھا۔

گاڑی نغمات کے گھر کی طرف لے جاتے ہوئے وہ اسی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر
سے پہنچی تھی۔ اس نے انتظار میں بیٹھے شائستہ، نغمات، ”نزدت“، ”غزالہ“، ”سلف عمران سلیم“، ناصر اور
ارش بھی اس کے گرد بٹھ گئے۔

وہ سر جھکا کر بھڑوں کی طرح سب میں گھر کر کھڑی ہو گئی۔ جب سب بول چکے تو اس نے سب
لے سامنے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ”جاں بخشی کی طلب جا رہوں۔ شرمندہ ہوں کہ واقعی دیر ہو گئی۔“

”تمہیں احساس ہوتا جا رہے تھا کہ انتظار کتنی کوئی دیتا ہے۔“ بیئرے سے ارشی نے کہا۔
”اوہ چکیلی دھوپ جیسی مسکراہٹ اپنے ریلے ہونوں پر لاتے ہوئے اس انداز میں بولی۔“

”تمہارے لئے دیر ہو گئی۔“

”بیئرے لئے۔“

”ہاں۔“

وہ کیوں کر۔“

”پھر ہاتھوں لگی۔ چلو پہلے اس کام سے پٹ لیں۔“

سب نغمات کے چھوٹے سے ڈرائیونگ روم میں آ بیٹھے۔ نغمات کی اوری اور ڈیڑی بھی ان کی
انٹل میں شریک تھے۔

نغمات کی چھوٹی بیٹوں نے سب کو شروپ پیش کئے۔

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ناصر کی شادی کا مسئلہ پیش ہوا۔ تقریباً دو ہزار روپے جمع ہوا تھا۔

”آئی۔ آپ ہی بہتر طور پر جانتی ہیں۔“ بیٹھا نے نغمات کی امی سے کہا۔ ”اس کے پیسے کو کس
طرح خرچ کیا جائے۔“

بیٹھا بھلاتے ہوئے وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکلے۔ برآمدہ جیسے پھیلا گئ کر عبور کیا۔ باہر
اس کی گاڑی اس کی کھڑی تھی۔ برآمدہ کی پہلی دو سری بیڑی اتاری لیکن تیسری پر اس کے قدم
رک گئے۔ اور اس نے جلدی سے گھوم کر پیچھے دیکھا۔

فرجاد برآمدے کی بیڑیاں چڑھ چکا تھا
وہ بھی تیزی سے گھوما تھا۔ در اس کی نظرس پتک پہڑوں میں جلوس شہر سیاہ آنکھوں اور
گھٹاؤں ایسے بالوں والی بیٹھا۔ میں اٹک گئی تھیں۔

بیٹھا نے اپنی خوبصورت آنکھوں کو حیرانی کی سرت سے دو ایک بار جھپکا۔ خوشی تو اس کے
اٹک اٹک سے یوں بھی پھوٹ رہی۔ انتہائی انداز میں اسے سلام کیا۔ جلدی سے بولی۔ ”آپ ک
والے ہیں نا؟“

فرجاد کو اس کی بات پر ہنسی آگئی۔ سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”ابو آگئے ہیں تمہارے۔“

”جی رات ہی آگئے تھے آپ نے ان سے ملنا ہے نا۔ دیکھئے محترم اگر تو آپ ابو کے بے تکلف
لے والوں میں سے ہیں تو ادھر چلے جائیے۔“ بیٹھا نے نفست گاہ کی طرف ہاتھ۔ اشارہ کیا۔

”اور اگر بے تکلف نہیں تو۔ تو کیا کرنا ہو گا۔“ فرجاد شوق سے جیسے بوللا۔ اپنی آنکھوں
ساری لہروں فریز چمک کر کے وہ بیٹھا کو دیکھ رہا تھا۔

”تو ادھر۔“ بیٹھا نے بھی خوشی سے سامنے ڈرائیونگ روم کے پورے سے دروازے کی طرف
اشارہ کیا۔ وہ مڑی اور تیسری بیڑی اترنے لگی۔

”بیٹھا۔“ فرجاد نے پکارا۔

”جی۔“ وہ رگ گئی۔

”تمہارے ہاں ممان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنے کا دستور ہے۔“

وہ کچھ خفیف سی ہوئی۔ پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”معاف کیجئے گا میں جلدی میں ہوں۔“
پھر اس نے باہر جنوں کی طرف دیکھا۔ بیڑا ادھر ہی اُتر گیا تھا۔ اس نے تیزی سے بیئرے کو گھوما

”ہاں آئی۔“ تقریباً سبھی نے متفق ہو کر کہا۔ لغمان کی اہی مسکرائیں۔ اور بھران سب جذبے کی تحریف کرتے ہوئے بولیں۔ ”میرے خیال میں تو بھر ہو گا۔ ناصروہ کی اہی سے پوچھ جائے۔ چائے ان کی ضروریات کتنی اور قسم کی ہیں۔“

”ہاں یہ صحیح ہے۔“ ڈیڈی بولے۔

”تو پھر آپ ہی چاہیے اسکے پاس۔ ہمارا کام ختم۔“ ینانے کہا۔ بیگ میں سے اپنے پانچ روپے نکال کر شانلہ کو دیے۔

”ابھی۔ سارے پیسے تمہارے پاس ہیں۔ آئی کو دے دو۔ آپ خود ہی جا کر ناصروہ کی اہی مل لیں گی۔“

”ینانا زہدہ یاد۔ سب موجوداتوں نے مل کر نورو سا لگایا۔ ینانا مسکرائے گئی۔

”یہ اسرار اہی کی ہمت سے جمع ہوا ہے۔“ شانلہ بولی۔

”نہیں آئی۔ یہ سب کی محنت کا نچوڑ ہے۔“ ینانا اسکاری سے بولی۔

”اللہ جس ہمت سے بچے۔ تمہارے خیالات بہت اچھے اور نیک ہیں۔“ آئی بولی۔

لغمان کی اہی اور ڈیڈی کی بچوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے ان کے نیک جذبوں کو سراہتے۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر چلے گئے اور سب ہم عمروں نے شور شرابا شروع کر دیا۔ عمراور وقت اپنے تقاضے بھی تو ہوتے ہیں۔

گھنٹہ بھر بعد جب محفل برخواست ہونے لگی۔ تو ینانے کل شام سب کو اپنے ہاں آبلے دعوت دی۔ یہ چائے ابوبکی طرف سے تھی۔

خوشی کے اظہار کے طور پر سب نے نمایاں بھائیوں۔ اور کل شام ملنے کی خوشی کا اظہار کر ہوئے سب چل دیے۔

ارشلی ینانے کے ساتھ تھا۔ ینانا کو بازار سے کچھ چیزیں خریدنا تھیں۔ دونوں بازار کی طرف لئے۔

ارشلی کو جتنیں تھا۔ ینانے آتے ہی بڑی حسین سرگوشی کی تھی۔ وہ اس بارے میں ینانا پوچھنا چاہتا تھا۔

ینانا گاڑی چلا رہی تھی۔ اور وہ برابر میں بیٹھا اس سے اسی بات کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

”کوئی خاص بات نہیں تھی۔“ وہ خوشی سے اٹھلاتے ہوئے بولی۔

”پھر بھی۔“

”بہت بڑی بات تھی ارشلی بہت بڑی۔“

”اللہ۔ تم کیا کہتے ہو ینانا۔ کبھی کبھی تو بھی کچھ۔“

”یہی تو لطف کی بات ہے۔“

”چاہے دوسرے کے لئے سراسر پریشانی کی بات بن جائے۔“

تم تو بالکل ہوارشی۔ ایک دم بے وقوف۔

”شکر ہے۔“

”اور تمہیں تو کیا۔“ یہی پریشانی کی بات ہوتی تو میں یوں فس فس کر تمہیں بتا سکتی تھی۔“

”ہاں۔ یہ بات تو ہے۔“

”ہونا بے وقوف۔“

”مانتا ہوں جناب۔“

وہ فس دی۔ اس کے خوبصورت دانت چمک رہے تھے۔ اور سنہری رنگت میں لالی لرا رہی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر ارشی کو ستاتی رہی۔ اور جب وہ سنجیدگی سے غصے میں آگیا۔ تو وہ شوح لہجے میں بولی۔ ”موڈ ٹھیک کرو پھر بتاتی ہوں۔“

”نہ تاؤ۔“

”نہ یعنی ناراض نہیں ہونا۔ ہاں تو سنو ارشی۔ نہیں سنتے۔ نہ سنو۔ میں پھر بھی بتاتی ہوں۔ وہ ”وہ سڑک کاموڑ کاٹنے ہوئے بولی۔ وہ مجسم بنی تھی۔

آج ابونے تمہارے متعلق پوچھا ہے مجھ سے۔“ اس نے شوح شوح نظروں سے ارشی کو دیکھا۔

”میرے متعلق؟“ وہ غصہ بھول کر جلدی سے بولا۔

”غصہ ہوا ہو گیا نا۔“ وہ پھر فس دی۔

”کیا پوچھا انہوں نے۔ تم نے کیا کہا۔“

”میدان مار لیا۔ بس۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔“

”کھل کر بتاؤ۔ مجھے ابجھن ہو رہی ہے۔“

”ینانے مزے لے لے کر اسے چڑا کر سنا سنا کر ساری باتیں کہہ دیں۔ ارشی بے پناہ خوشی محسوس کرتے ہوئے سرشار نظر آنے لگا۔

”مار لیا نا میدان۔“ ینانے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”واقعی۔“ وہ ہلک رہا تھا۔

”اب تو پڑ پڑ نہیں ہو گی۔“

”وہ تو جب تک تمہیں پانہ لوں گا ہو گی ہی۔“

”بزدل کہیں کے۔“

”سر تسلیم خم ہے۔“

”ارشی۔“

”ہوں۔“

”ویکھو۔ کل آؤ گے تاہمارے ہاں۔“

”سر کے بل جتاپ۔“

”یہ بے تکلی بائیں نہ کرو۔ ہاں تو کل ذرا ایک سٹارٹ بن کے آنا۔ سمجھے۔“

”بہت اچھا صاحب۔“

”ابو بٹا ہر سیدھے سادے لگتے ہیں۔ لیکن ہیں بڑے ہوشیار۔ کل تمہاری جانچ پرکھ ہوتا ہے۔“

”ماضی رہا اسی سے کام لیتا۔ ڈرنا سمجھنا بالکل نہیں۔“

”مجھے تو ابھی سے ڈر لگ رہا ہے تمہارے ابو سے۔“

”ہائے اللہ تم کتنے فضول آدمی ہو۔“

”سارے القابات آج ہی دیتے ہیں مجھے۔“

”تمہیں کیا پتہ ارشی آج میں کتنی خوشی ہوں۔“

”اسی خوشی میں مجھے احسن بے وقوف بدھو اور جانے کیا کچھ باری ہو۔“

”کیا فرق پڑتا ہے ہو تو ارشی۔ کیوں۔! وہ ہنس کر بولی۔ ارشی بھی مسکرائے لگا۔ گاری سمجھان

آباد بازار سے گزر رہی تھی۔ بھیل اور شور شرابے نے دونوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ جیتا

اعتیاد سے گاڑی چلانے لگی۔

”آصف۔“

”ہوں۔“

آصف کرسی میں نیم دراز میز پر پاؤں رکھے اخبار پڑھ رہا تھا۔ کسی نے اسے پکارا۔ اس نے بے

خیالی میں ہوں کہہ دیا۔

لیکن

ایک دم اسے احساس ہوا جیسے یہ آواز قریب سے نہیں برسوں کے فاصلے سے آئی ہو۔ اس

آواز میں اتنی مٹھاس اتنی اپنائیت اور اتنی قربت تھی۔ کہ اس نے جلدی سے اخبار چرے سے ہٹایا

اور

پھر

اس کی آنکھوں نے جو دیکھا۔ اسے یقین نہ آیا۔ اس نے سر کو ہٹکا۔ آنکھیں کھولیں بند کیں

۔ اپنے ہونے کو چھو کر محسوس کیا۔

فرداد شوق اور تجسس سے اسے دیکھ رہا تھا۔ آصف کی زندگی کی دہلیز پر بڑھاپا دستک دے رہا تھا

۔ وہ پہلے کی طرح ہٹا کٹا نہیں رہا تھا۔ ماتھے پر بڑی واضح شکنیں تھیں۔ آنکھیں عینک سے ناطہ ہوؤ

چکی تھیں۔ کندھے کچھ جھکے سے لگتے تھے۔ ہاں اس کی رنگت ویسی ہی دودھیا تھی۔ دودھیا جس میں

سرخ تھلی ہوئی تھی۔

”تم۔ تم۔“ وہ کرسی سے اٹھ چلا کر کھڑا ہو گیا۔

”آصف۔“ فرداد بے اختیار ہو کر بازو پھیلائے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔

”فرداد میرے عزیز۔“ وہ بھی جیسے کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح تھا۔

وہ دونوں بے تابی سے ایک دوسرے کی جانب بڑھے۔ اور خلوص نپاک اور محبت سے بے غلطی ہو

گئے۔

”اوہ آصف۔“ فرداد صرف اسی قدر کہہ سکا۔

طرح ایک بلک کر رو دیتا۔ دیوانوں کی طرح سر پچھتا۔ اپنی بیچوں سے عرش و فرش بلا کر رکھ دیتا۔ چمچڑ جانا قیامت سے کم تو نہیں ہوتا۔ ایسی صورتیں جو ہمارے دلوں کے قریب رہتی ہیں۔ جو روروں میں اتر جاتی ہیں۔ جن کے دم سے دنیا آباد کلتی ہے۔ جن کے ہونے سے اپنے ہونے کا احساس جیتا ہے۔ وہ چمچڑ جائیں۔ عدم کی دباؤوں میں کھو جائیں۔ قضا کے ججزوں میں ہیں جائیں۔ موت کے شعلے میں آجائیں۔ تو قیامت ہی آجاتی ہے۔ زندگی زندگی نہیں رہتی۔ اسے جیتے ہوئے بھی موت آجاتی ہے۔ اور پھر جو بھی وقت گزرتا ہے وہ زندگی کا نہیں موت کی زندگی کا وقت ہوتا ہے۔

آصف بائیں کر رہا اور فرجاد بائیں انداز میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ لیکن وہ اس وقت چمچڑنے کے عذاب سے دوچار نہیں تھا۔ گل بانو یمنان کرجی رہی تھی۔

”تم خوش قسمت ہو آصف۔ پالا فرجاد بولا۔“ گل بانو مر کبھی تمہاری نظروں سے ابو بھل نہیں ہوئی۔ تمہیں جیسے کا سہارا اب ٹھکانے کے روپ میں دے رہی ہے۔“

”تو۔ تو تم ٹھکانا کو جانتے ہو۔ اسے دیکھ لیتے ہو۔ کب کہاں؟“ آصف ٹیک ہٹا کر آنکھیں ہاتھوں سے صاف کرتے ہوئے بولا۔ تجسس و دیکھ اس کی آوازیں غالب تھیں۔

فرجاد دھیرے سے مسکرایا۔ ”کل اسے دیکھا تھا۔“

”تم کل بھی آتے تھے۔“

”ہاں۔ ٹھکانے بتایا نہیں تھا۔“

”نہیں تو۔ اس نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔“

فرجاد جالے کیوں مجھ سا گیا۔ پھر آہستگی سے بولا۔ ”اسے میں نے اپنے متعلق کچھ بتایا بھی تو نہ تھا۔“

”ہوں جیسی۔ وہ کبھی سمجھی ہوگی۔ کہ تم اس کے ابو کو کوئی ملنے والے ہو۔“

آصف نے کہا۔ لیکن پھر جلدی سے بولا۔ ”تم کل آئے تھے۔ تو چلے کیوں گئے۔ کہاں رہے رات۔ حد ہو گئی تھی۔ کس طرح تمہارا دل چاہا۔ اپنے گھر میں بیس برس بعد آنے کے بعد یوں اجنبیوں کی طرح لوٹ جانے کو فرجاد تم کتنے ٹھنور ہو۔ شقی القاب بھی کون تو بے چارہ ہو گا۔ کسی سے ملے بھی نہیں۔“

فرجاد کے لبوں پر چراغ کی لو کی طرح مسکراہٹ تھری رہی تھی۔ وہ آصف کو کل والے سانچے کے متعلق کیوں کرتا تا۔ کیسے کہہ دیتا۔ کہ میرے تو واس ہی تم ہو گئے تھے۔ ٹھکانا دیکھ کر اپنی ہوش نہ رہی تھی۔ کسی سے کیسے ملنا کیوں کر مائل ٹھہر جاتا۔

آصف اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ”آؤ فرجاد جو ملی کے کینوں سے نہیں ملو گے۔ کیا کچھ نہیں ہو گیا

تمہارے بعد۔“

”میرے دوست میرے بھائی۔ آصف کی آواز بھی ٹوٹ گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو والمانہ انداز میں پلٹا رہے تھے۔ سرت کی بلخار تھی۔ سینے بھرے تھے۔ آوازیں رندھی تھیں۔ اور آنکھوں میں غمی تھیرنے لگی تھی۔ دونوں یوں مل رہے تھے۔ جیسے بیس برسوں کی حدیں نہیں موت کی حدیں پھلانگ کر مل رہے ہوں۔ مری تو چکے تھے دونوں ایک دوسرے کے لئے۔ آصف کو یہ علم نہیں تھا۔ کہ فرجاد کہاں ہے۔ کس حال میں ہے۔ کیا کر رہا ہے۔ اور فرجاد کو بھی تو علم نہ تھا کہ آصف کہاں ہے کیا ہے۔

کئی گھنٹوں بعد دونوں ایک دوسرے کے بازوؤں میں بازو دینے ایک دوسرے کو خاموش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اور شاید جدائی کے گھاؤ مل نہ پائے تھے۔ وہ بے اختیار نہ پھر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

اور

پھر

جب کتنی ہی دیر بعد وہ والمانہ پن سے لپٹ لپٹ کر مل چکے۔ آصف کو یقین آگیا کہ فرجاد ہی اس سے مل رہا ہے۔ تو دونوں کرسیوں میں بیٹھ گئے۔

”اب بھی یقین نہیں آ رہا فرجاد۔ کہ تم۔ واقعی تم آگے ہو۔“ آصف نے کہا۔

”مجھے تو پتہ یقین ہے کہ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔“ فرجاد نے پیار سے اپنا ہاتھ آصف کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے شرمیلے میں کہا۔

”بڑے پھول ہو۔ ایسے گئے۔ کہ لوٹ کر دیکھا بھی نہیں۔“

فرجاد اپنے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھپتھپتے ہوئے مسکرائے گیا۔

”کہاں چلے گئے تھے۔ کیا کرتے رہے۔ کب آئے۔“ آصف ایک ہی سانس میں کئی سوال کر گیا۔ وہ دکھ اور سکھ کی ملی جلی کیفیت سے پوچھا یا ہوا تھا۔

”بس یہی بس۔ تم نے آگے اسٹے سوال داغ دیے۔ پہلے مجھے پوچھنے دو۔“ فرجاد اطمینان سے بولا۔ ”میری تو اکیلی جان تھی۔ وقت گزری گیا۔ اب پھر تمہارے سامنے ہوں۔ تم اپنی کو۔“

”گل بانو۔“ آصف کی آواز ٹوٹ گئی۔

”ہاں۔ مجھے علم ہے وہ۔“ فرجاد آہستگی سے بولا۔

”دو سال ہوئے وہ ہمیں جھوڑ کر چلی گئی تھی فرجاد۔“ آصف آبدیدہ ہو گیا۔

فرجاد سر جھکا کر بیٹھا اپنے ہاتھ مسلا رہا۔ آصف اس کی پیاری اور موت کی باتیں کرنے لگا۔

لیکن فرجاد پر عجیب سی بے حس طاری تھی۔ اس کی نگاہوں میں یثنا کا سر لہا گھوم رہا تھا۔ وہ یقین ہی نہ کر رہا تھا۔ کہ اس مٹی کے ڈھیر میں گل بانو سوئی پڑی ہے۔
گل بانو کبھی نہیں مر سکتی۔ وہ نہیں مری۔ وہ امر ہے۔ وہ ہے اور رہے گی۔ فرجاد کے ذہن میں کچھ ایسے ہی خیالات تھے۔

اس کی آنکھوں سے اپنی محبوب بیڑی کی یاد آنسو بن کر رہنے لگی۔
فرجاد نے بٹانوں، دھبکے، بوتل، تو شاید اس وقت وہ آصف کے گلے میں بائیس ڈال کر چوس لیا۔
فرجاد کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ بیس سال طویل عرصہ تھا۔ یثینا یہاں بہت کچھ ہو گیا، ہو کا۔
جیسے کون کون رانی ملک عزم ہو چکا ہو گا۔ اسے سب سے پہلے انا اور غلام رسول کا خیال آیا۔ پھر
کئی مانوس چہرے نظروں میں گھوم گئے۔ معرلوگوں کے متعلق تو پوچھنے کا حوصلہ ہی نہ ہوا۔ کہ جاننا
تھا۔ موت انہیں دامن میں چھپا چکی ہوگی۔

آصف اس کا ہاتھ فرجاد جہاز سے دھاتے ہوئے بولا۔ ”حویلی میں سی تبدیلیاں آچکی ہیں۔
کچھ لوگ مر گئے۔ کچھ دوسرے شہروں میں جا رہے۔ وہ رہنمائی رہی ہے۔ نہ گمراہی۔ چند خانہ دار۔
گئے۔ وہ بھی اپنی، اپنی جگہ ہیں۔“

فرجاد کچھ نہیں بولا۔ حویلی کی تبدیلی اس کی ظاہری حالت ہی سے حشر تھی۔ یہ تبدیلی اس
نے کئی ہی محسوس کر لی تھی۔

فرجاد کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ معرلوگوں میں سے اصف پچھا صرف حیات تھے وہ بھی چار پائی سے
گلے تھے۔ طالب بھائی بیوہ ہو گئی تھیں۔ فوزی کی شادی ہو گئی تھی۔ راشدہ تین بچے چھوڑ کر نکلتے
سال مر گئی تھی۔ سلیم امجد اور طاہر دو بیٹے چائے تھے۔ نئی پودہ اللہ جانے کہاں بکھر چکی تھی۔
حویلی کے کئی دالانوں میں سامان بند تھا۔ اور بڑے بڑے تالے بڑے تھے۔ غیر آباد اور سنسان
سی ہو چکی تھی۔ آصف نے اپنی رہائش کا کچھ حصہ پوری عمارت سے الگ تھلک کر کے از سر نو
بنوایا تھا۔ یہ حصہ نئی طرز کے پتیلے کی طرح تھا۔

فرجاد کے آنے کی خبر جلد ہی حویلی میں پھیل گئی۔ ہوا سے جانتے پہچانتے تھے۔ تڑپ کر پلے۔
جو نہیں جانتے تھے۔ وہ تجسس سے دوڑے۔ کیوں کہ فرجاد کا غائبانہ احوال تو تھا ہی۔

تو کدوں چاکروں میں بھی دو چار ہی فرجاد کے وقوف کے باقی تھے۔ اب ان کی اولادیں تھیں۔
جو فرجاد کا نام تو جانتی تھیں۔ لیکن پہچانتی نہ تھیں۔

پہچانتیں بھی کیسے۔ کئی تو اس کے جانے کے بعد دنیا میں وارد ہوئے تھے۔ کچھ ایسے تھے۔
جنہیں ماؤں کی گود میں دودھ پیتے چھوڑ دیا تھا۔ اب جوان ہو گئے تھے۔ خوجوں والے ہو گئے تھے۔
طالب بھائی فوزی کی امی اصف پچھا سب ہی اسے مل کر رو دیکھے۔ خوشی اور غم کا بے پایاں اظہار
جانے آنسوؤں سے ہی کیوں ہوتا ہے۔

آصف فرجاد کو گل بانو کی آخری آرام گاہ پر بھی لے گیا۔ آصف کی آنکھیں بھر بھر آئیں۔ اور
اس کی آواز شدت جذبات سے لوتی رہی۔ قبر ہاتھ بھیرتے ہوئے وہ بے اختیار سا ہو رہا تھا۔

”جی ایو۔“

”ادھر آؤ۔“

”ہاں ہوں ایو۔ یہ جڑیں بازار سے لائی تھیں کمرے میں رکھ لوں۔“

”جلدی آؤ۔ بہت جلدی۔“

”کوئی خاص بات ہے۔“

”بہت خاص بہت بڑی۔ بس ایک منٹ میں آؤ۔“

”اگلی۔ ابھی آگئی۔“

بیٹا دوڑتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف گئی۔ آصف نے مڑ کر فرجاد کو دیکھا جو دیوار پر لگی ایک اپنی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ بظاہر لاوا کھڑا تھا۔ لیکن اس کی روح ہمہ گوش اپنی بیٹا کی آواز سن رہی تھی۔ یہ آواز برسوں کے نائلے سمیٹ آئی تھی۔

بیٹا بھاگ بھاگ کمرے میں جڑیں پیچیک کر ڈرا نینگ۔ روم میں آگئی۔ وسیع و عریض ڈرا نینگ روم میں بہت سے لوگوں کو دیکھ کر وہ ہلکا ہلکا

”اگر آجاؤ بیٹے۔“ آصف نے مشرقی کونے میں رکھے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اسے اپنی طرف

یا۔

بیٹا نے سب کو مجموعی سلام کیا اور پھر ایو کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ ”کیا بات ہے بہت سے

ل آئے بیٹے ہیں۔“

فرجاد اپنے قدموں پر گھوم کر بیٹا کو دیکھنے لگا۔ وہ اب آصف کے صوفے کی پشت پر تھا۔

بیٹا نے فرجاد کو دیکھا۔ مسکرا کر بولی۔ ”آپ؟“

فرجاد بڑی لگاؤ سے مسکرایا۔

”ایو۔“ بیٹا آصف کے قریب کھڑے ہو کر فرجاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”آپ کل

ہا آئے تھے۔ مجھے آپ کو جانا بھول گیا تھا۔“

”تم جانتی ہو انہیں۔“ آصف نے مسکرا کر پوچھا۔

”صرف اتنا کہ یہ کل بھی آئے تھے۔ اور آج جب میں جا رہی تھی۔ تو یہ برآمدے میں کھڑے

۔۔“

”اور اس نے اتنا بھی نہ کیا کہ مجھے تم تک پہنچانے کی تکلیف ہی گوارا کرتی۔“ فرجاد نے

صورت سا گھوک کیا۔

”دیکھو بیٹے۔“ آصف نے پوچھا۔

”میں جھوٹ تو نہیں کہہ رہا۔ تو یہ۔۔۔ ممانوں سے ایسا سلوک ہوتا ہے یہاں۔“

سب سے مل ملا کر فرجاد اور آصف ڈرا نینگ روم میں بیٹھے۔ یہاں بھی بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ قریب اور بے تکلفی سے ملنے والے عزیز تھے۔ میں برسوں کی چینی کمانیاں سنارہے تھے۔ سن رہے تھے۔

فرجاد خوق و تجسس سے سب کی باتیں سن رہا تھا۔ اپنی روزیدار تو اس نے چند لفظوں میں سنا دی تھی۔ زمینوں اور گاؤں والوں کے بارے میں اس نے آصف سے پوچھا۔ تو وہ مسکرا کر بولا۔

”تمہاری امانت کی اپنی طرف سے پوری پوری حفاظت کی ہے۔“

میری امانت۔“ فرجاد نے پوچھا۔

”ہاں۔ تم تو وصیت نامہ تحریر کر گئے تھے۔ لیکن میں نے تمہارا حصہ تمہارے نام ہی رکھا ہے۔ تمہاری اطلاع کے لئے کہہ دوں کہ تمہارے نام پر تک میں اب اتنی خطرہ رقم جمع ہو چکی ہے۔ کہ

دو دو ہاتھوں اطلاع تک بھی ختم نہ ہوگی۔“

”میرا سب کچھ تمہارا ہے آصف۔“ فرجاد نے مسکرا کر کہا۔ ”پہلے بھی اور اب بھی۔ تم جانے

کیوں مجھے اپنے سے الگ کرتے رہتے ہو۔“

”یہ بات نہیں فرجاد۔“

”تو اور کیا ہے۔“

”بس ضمیر بھی کوئی چیز ہوتی ہے“

”تمہارے ضمیر نے اتنے سوالوں میں مانی نہ کر لی۔ اب یہ بات نہیں چلے گی۔ میں اور تم برابر کے

شریک ہیں۔ یہاں کی ہر چیز کے زمینوں کے مل کے اور تک بیٹھنے کے۔“

آصف کچھ کہنے ہی کو تھا۔ کہ باہر گاڑی رکھنے کی آواز آئی۔

”بیٹا آئی ہے۔“ آصف نے کہا۔

فرجاد کی آنکھوں میں چمک آگئی اور اس کا دل سینے میں دھک دھک کرنے لگا۔ جلد ہی اس

نے اپنے آپ پر قابو پایا اور بولا۔ ”ہلاؤ اسے۔“

”بیٹے۔“ آصف نے داخلی دروازے کے قریب جا کر پکارا۔

فرجاد نے شوخ لہجے میں کہا۔ سب دھیرے دھیرے مسکرا رہے تھے۔ مینا کچھ خفت محسوس کرنے لگی تھی۔

”انہیں بچاؤ بیٹھے۔“ آصف نے فرجاد کی طرف دیکھ کر کہا۔

بیٹھے نے باپ کے پہلو میں بیٹھے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ فرجاد بھی صوفے کے دوسرے سر پر آن بٹھا۔ مینا جیسے تماشائی تھی۔ سب اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

”حافظ پر زور دو۔“ فرجاد نے کہا۔

”غور سے دیکھو انہیں۔“ آصف بولا۔

”کیا بچی کو بولا رہے ہو۔“ طاہرہ بھابی جلدی سے بولی۔ ”وہ کیسے بچکانہ کہتی ہے۔ بھلا۔ اور پندرہ کھس سے پہلے کے ڈرامے چاہیے۔“

مینا نے اچانک گردن موڑ کر فرجاد کو غور سے دیکھا۔ حیران ہوئی۔ پوری آنکھیں کھول کر۔ لمبے دیکھتی رہی۔ پھر تصویروں کی مشابہت سے یہ جانتے اسے دیر نہ لگی کہ اس کے پاس فرجاد ایسا بیٹھے ہیں۔

”آپ فرجاد اکل تو نہیں۔“ مینا حیرت تجسس اور شوق سے گڑ بڑائی گئی۔ سب اٹھاتی اور میں گردنیں ہلاتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

”اوہ شاباش۔ میری بیٹی بڑی ذہین ہے فرجاد۔ دیکھا کیسے بچکانہ لیا تمہیں۔“ آصف بیٹی کی طرف ہنست پر ہاتھ پڑتے ہوئے ہنس کر کہہ رہا تھا۔ بیوی نے ہی مزے مزے ایک تک فرجاد کو کتے کی سی گئی اور فرجاد ان جانی بچکانی نظروں سے مرعوب ہوا جا رہا تھا۔

”واقعی آپ اکل فرجاد ہیں۔“ وہ حیرت زدہ تھی۔

”ہاں بیٹے آپ فرجاد ہی ہیں۔“

”یقین نہیں آ رہا۔ کہ میں انہیں تک رہی ہوں۔“

”یقین نہ آنے والی بات تو ہے ہی۔“

مینا اب مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی کی جگہ شوخی ابھر رہی تھی۔ چند لمبے فرجاد کو دیکھتی رہی۔ پھر ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”اکل آپ کو چھو کر دیکھ لوں۔“

سب اس بات پر ہنس پڑے۔ اس نے واقعی انگلی سے فرجاد کا کندھا چھوا۔

”گلے ملو بیٹے۔“ آصف نے بڑے پیار سے کہا۔ ”تمہارے بڑے پیارے اکل ہیں۔“

”جی جی۔“ کہتے ہوئے مینا نے بے تکلفی سے فرجاد کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔ فرجاد ہنسا گیا۔ مینا میں گلے پاؤں نظر نہ آتی تو شاید وہ اسے اس وقت سینے سے لگا کر دیرانہ شفقتوں کا بحر مہیاں اظہار کرتا۔ لیکن اب تو میں جس چور تھا۔ ذہن میں اچانک چمکی تھی۔ وہ مینا کے امانت پیار کا جواب نہ

دے سکا۔ جلدی سے اس کے بازو گلے سے نکال کر ہاتھوں میں قیام لے۔

”مجھے بے حد شوق تھا آپ کو دیکھنے کا۔ اب اسے اتنی باتیں سن رکھی تھیں۔ آپ کے متعلق وہ اظہار شوق کر رہی تھی۔“

”اچھی باتیں ہی بتاتی تھیں نا ابو نے۔“ فرجاد اپنی رگ و پے میں سنسنی محسوس کر رہا تھا۔

”اچھی بری ساری۔“ وہ شوخی سے ہنسی۔

اس کی ہنسی گلے بالوں کی ہنسی تھی۔

”بہت شر ہے یہ۔“ آصف نے پیار سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے فرجاد سے کہا۔

”ہے نازی گلے بالوں۔“ اچانک طاہرہ بھابی نے کہا۔ اور فرجاد کی تائید کے لئے اس کی طرف ہنسی کی۔

وہ مینا کو پیار سے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

میں تو اسے جب بھی دیکھتی ہوں۔ گلے بازو یاد آ جاتی ہے۔“ رافیہ خالد نے ایک گرمی سانس اٹھوئے کہا۔

اور

پھر گلے بالوں کی باتیں ہونے لگیں۔ فرجاد سر جھکا کر سنتا رہا۔ اس نے بہت کم باتیں کیں۔ مینا فرجاد کو دیکھ رہی تھی۔ اور خوش ہو رہی تھی۔

”کل اکل دھوکا کھا گئے تھے ابو۔ مجھے دیکھتے ہی پکارا گلے بالوں۔“ وہ شوخ نظروں سے فرجاد کو دیکھتے ہوئے بولی۔ اور پھر گلے کی واردات کچھ بڑھا چڑھا کر بیان کرنے لگی۔

سب ہنستے مسکراتے رہے۔

”اچھا تو ابو۔“ وہ اب باپ سے مخاطب تھی۔

”ہوں۔“

”کل میرے پورے گردن کی چائے ہے۔ یاد ہے آپ نے آج کہا تھا۔“

”ہاں ہاں ہو جائے گی۔“

”اوں ہوں۔ اب ایسی دیکھی نہیں ہوگی ابو۔“

”تو کیسی ہوگی۔“

”ایک دم بہت گریو۔“

”وہ کیوں۔“

”واہ جی۔ اب تو اکل فرجاد کے آنے کی خوشی بھی شامل ہو گئی ہے۔ میں اپنے سب دوستوں

ن کا کاتبانہ تعارف تو کروا چکی ہوں۔ اب سب انہیں دیکھیں گے۔ تو حیران رہ جائیں گے۔“

”حیران کیوں۔“ فرجاندے پوچھا۔

”اتنے اچھے سے پیار سے اٹکل جو اچانک وارد ہو گئے۔“ وہ بولی۔ اور پھر خوشی خوشی اٹکل کو اپنے دوستوں سیلیوں اور مشغلوں کے متعلق بتانے لگی۔ اس کی باتوں کا انداز گل بانو کا تھا۔ اور وہ اسی کی طرح بنا پوچھے ہر بات تفصیل سے بتائے جا رہی تھی۔

شکر ہے ڈنڈوں کی دنیا جتنی ہوتی ہے۔ ہم جو کچھ سوچ رہے ہوتے ہیں۔ جس انداز سے رہے ہوتے ہیں۔ دوسروں کو پتہ نہیں چل جاتا۔ جو کچھ محسوس کر رہے ہوتے ہیں اور جس انداز سے محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ بھی کوئی نہیں جان سکتا۔

کوئی نہیں جان سکتا۔

میں برس بعد اپنی چھتوں سے سکون پایا تھا۔ یا ٹینا کو دیکھ کر برسوں کی محرومی کا احساس مٹ گیا تھا۔ فرجاندہ کی سکون کی نیند سویا۔ کہ جب اٹھا تو ڈنڈوں دل و دماغ اور وجود سب ہٹکے ہٹکے ہو گئے تھے۔ شام ہوئی سے اس کا سامان آگیا تھا۔ اور اس کے ذاتی کمرے کھول دیئے گئے تھے۔ اس کی عدم موجودگی میں بھی ان کمروں کی دیکھ بھال ہوئی رہی تھی۔ کتنا چھین پایا تھا اس نے اپنی خواب گاہ میں۔ اس کی حالت ہلکتے ہوئے اس بچے کی سی تھی۔ جو اب کی آغوش میں آتے ہی پرسکون ہو جاتا ہے۔ ناشتے کی میز پر ٹینا اس کے پهلویں بیٹھی اپنی شوخ چھچھل اور شریر باتوں سے مغلوط کرتی رہی۔

”اٹکل آپ اتنے سال کہاں رہے۔“

”کس کس ملک کی سیر کی۔“

”کس کس شہر کو دیکھا۔“

”مستقلہ کہاں رہے۔“

”اپنا وطن یاد آتا تھا۔“

”آپ نے شادی بھی کی تھی۔ تو پھر اکیلے کیوں آ گئے ہماری مہم چچی کہاں گئیں۔“

وہ اوپر تلے سوال کئے جا رہی تھی۔ فرجاندہ مسکرائے جا رہا تھا۔

”یہ تمہارا بڑا حساب لے لے گی۔“ آصف نے نیکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے مسکرا کر فرجاندہ سے کہا۔

”ہم پورا حساب دینے کو تیار ہیں صاحب۔“ فرجاندے کہا۔

”اٹکل آپ نے بہت بہت۔ بہت ہی اچھا کیا جو آ گئے۔“ ٹینا نے خوشگوار لمبے میں کہا۔

”شاید۔“ فرجاندہ مسکرایا۔

”شاید نہیں۔“ ٹینا۔ ”ٹینا بولی۔“ گھر میں کچھ رونق تو ہو گئی۔

”ہاں جیسی۔“ آصف بولا۔ ”شے بچ کہ رہی ہے۔ بیچاری اکیلی بہت بور ہوئی رہتی تھی۔ میں

گھر کا کاروباری آدمی۔ یہ۔“

”کاروباری آدمی نہیں۔ مشین کہئے۔“ ٹینا نے شامی انداز میں کہا اور پھر فرجاندہ سے مخاطب ہو

”اور بھی بہت سے شوق ہیں۔“ ٹینا بولی۔
 ”آہستہ آہستہ کھلے گی۔“ آصف نے چاہتے چاہتے ہوئے کہا۔ ”ٹاک میں دم کر دے تمہارا۔ ذرا
 غلط ہی رہنا۔ زیادہ دلی قوت تو۔“

”ہائے ابو۔“ ٹینا نے جلدی سے کہا۔ ”میرے سامنے ہی انکل کے کان بھرنے لگے۔
 ”اس سے کچھ نہیں ہو گا نہ۔“ فرجاد نے کرسی میں چیخے پڑے ہوئے کہا۔ ”تمہاری ہر خواہش
 پوری ہو گی۔“

”اوہ شکر۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی اور پھر فرجاد کی غصہ بازی سے بکڑ کر ہلاتے ہوئے بولی۔
 ”پارے پارے انکل۔ آپ بہت اچھے ہیں۔“
 وہ ٹیکس میز پر پیچک کر باہر نکل گئی۔

”بت چالوس ہے۔“ آصف نے اس کے جانے کے بعد پیار سے کہا۔ فرجاد آنکھوں میں
 چاہتے خواب لے اے نکلے گا۔

شام ٹینا کے دوستوں کی چائے تھی۔ وہ سارا دن بت مصروف رہی۔ ڈارینک روم نمیک
 کر دیا۔ کھانے کے کمرے کو درست کیا۔ اور چائے کے لیے دھکاٹی ہوئی جیزین ترتیب سے رکھیں۔
 فارغ ہو کر وہ ندادھو کر بیکے نیلے رنگ کے سادہ سے کپڑے پن کر برآمدے میں آگئی۔ جہاں
 اونچی پشت والی سفید پھولدار کرسی پر فرجاد ایک شاہانہ نمکنت سے بیٹھا تھا۔ سامنے چار باغ کریاں
 پڑی تھیں۔ درمیانی میز پر ایلی ٹرے اور سگریٹ رکھے تھے۔ دائیں ہاتھ مرلی تھی۔ جس میں
 کھانے پینے کی کچھ جیزین تھیں۔ جگ اور گلاس جالی سے ڈنکے تھے۔ فرجاد کے آنے کی خبر جنگل کی
 آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ صبح سے لوگ ملنے آ رہے تھے۔ ابھی ابھی چند دوست اٹھ کر گئے تھے۔
 ”انکل۔“ ٹینا نے اس کی پشت پر آتے ہوئے پکارا۔

ٹینا کی آواز تو وہ صدیوں کے فاصلے سے بھی پہچان سکتا تھا۔ اب اس کے اس مخاطب سے اسے
 الجھن تھی۔ وہ اسے انکل کہتی تھی۔ فرجاد بے چینی سی محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن کھل کر کچھ کہنے
 کی ہمت کہاں تھی۔

ٹینا گھوم کر اس کے سامنے آئی۔ ہلکے نیلے رنگ کے لباس میں اس کا گلابی چہرہ یوں لگ رہا تھا۔
 جیسے ٹھہرے ہوئے صاف و شفاف پانی میں گلاب کا ترنہ پھول ہو۔ اس کے سیاہ بال پشت اور
 آنکھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ شاید کھانے کو کھلے چھوڑ رکھے تھے۔

فرجاد اسے چشم شوق سے دیکھنے لگا۔
 ”یہ لوگ آپ کی جان چھوڑیں گے بھی۔“ ٹینا نے ہنس کر کہا۔
 ”سلسلہ لباہی ہے۔“ وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

کر بولی۔ ”ابو کو تو سوائے زمینوں اور حساب کتاب کے اور کسی بات کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ جب
 دیکھو اپنے ہی جھنجھٹے میں پڑے ہیں۔ پتہ ہی نہیں ہو گا کہ ایک دو اگلوٹی بیٹی گھر میں اکیلی پڑے
 پڑے پور ہو جاتی ہے۔“

”جھوٹی کہیں کی۔“ آصف نے پرانے شفقت سے اسے گھورا۔ ”سارا دن غم گھر میں پڑی
 رہتی ہو۔ اتنے دوست ہیں تمہارے۔ فرجاد آج ہی دیکھ لینا چاہے پر بلایا ہے۔ اپنے دوستوں کو۔“
 ”دوست سیلیاں اپنی جگہ ابو کی۔“ ٹینا منہ پھلے ہوئے بولی۔ ”آپ اپنی جگہ۔“
 ”خیر۔“ آصف مسکرا رہا تھا۔

”دیکھیں انکل۔“ ٹینا نے رینگنے لگے کہ ان آدمیوں کو کہ۔ یہ جو ابو ہیں نا ہمارے۔ کبھی ہمارے ساتھ
 ایک گھنٹہ سے زیادہ نہیں بیٹھے۔ کبھی کوئی کھیل نہیں کھیلا۔ بیٹھناں کوں۔ تو فرصت نہیں ناش لہو
 جیس کے لیے وقت نہیں۔ چنگ باسیرو تقریر کے لیے تو گھٹائش ہی نہیں۔“

آصف کھٹکھٹا کر ہنس دیا۔
 ”ہو نہ۔“ ٹینا رو دھ گئی۔

فرجاد نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ اور پھر آصف سے بولا۔ ”بڑے سنگین الزامات ہیں
 تمہارے خلاف۔“

”اے کی طعانی اب تم کر دیتا۔“ آصف نے کہا۔
 ”بالکل۔“ فرجاد کے کپڑے میں شوق اور لگن تھی۔
 ”ہں۔ اب تو خوش ہو نا۔“ آصف نے ٹینا سے کہا۔ ”تم بھی بیکار تمہارے انکل بھی بیکار۔
 جی بھر کے پروگرام بنانا۔ بیرو تقریر کے۔ کھیل کے۔ اور۔“
 ”کیوں انکل۔“ ٹینا نے فرجاد کی طرف دیکھا۔

”ضرور ضرور۔ تمہارے ابو کی کو تائیوں کی ساری کسر پوری کر دیں گے۔“ فرجاد نے چاہنے کی
 پیالی میں چٹے سے چٹنی ہلاتے ہوئے کہا۔

ٹینا نے خوش ہو کر چوڑی کی طرح ہلکی ہنسی۔
 ”انکل مجھے بڑی چیزوں کا شوق ہے۔“ وہ خوش ہوئے ہوئے بولی۔

”مثلاً۔“ فرجاد نے پوچھا۔
 ”مثلاً۔“ وہ ہنس رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سارا دن چمک تھی۔ اور اس کے

خوشی ورت سفید دانت چارباہر رسیدے بھرے بھرے گلابی ہوٹوں سے مس ہو رہے تھے۔ ”مثلاً
 گھوٹے نہ بھرنے کا۔ کھینے کا گاٹے بجانے کا۔ پی پی جگہیں دیکھنے کا۔ نئے نئے لوگوں سے ملنے کا۔“
 ”ہں۔؟“ فرجاد نے اس کی باتوں کی ساری حلاوت روح میں جذب کرے ہوئے کہا۔

”انکل اب آپ تیار ہو جائیں نا۔“

”کیوں۔“

”ہائے اللہ آپ کو اتنی جلدی بھول جاتا ہے۔ آج پارٹی ہے میرے پورے گروپ کی۔“

”اوہ۔ خوب یاد دلایا۔“

”آپ جلدی سے تیار ہو جائیں نا۔ میں سب سے آپ کا تعارف کراؤں گی۔ کتنی خوشی رہی ہے۔“

”واقعی؟“

”واقعی۔“

فرجاد سگریٹ کے چھوٹے ٹکڑے کش لیتا رہا۔

”تم تیار نہیں ہو گی۔“

”میں تو تیار ہوں۔“

”یہ کپڑے پہنو گی۔“

”تو اور۔“

”پارٹی ہے۔ کوئی جھلس کر تالیاں پہنو۔“

”میرے پاس سب سادہ کپڑے ہیں۔ میں ایسے ہی کپڑے پہنتی ہوں۔“

”ہم اپنی ٹینا کے لیے رقص برق لباس ہوا کریں گے۔“

ٹینا اظہارِ تشکر کے طور پر مسکرائی پھر بولی۔ ”مجھے یہی کپڑے اچھے لگتے ہیں“

”اوں ہوں۔ کل شاپنگ کے لیے چلیں گے۔“

”اچھا انکل۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔ اب آپ جلدی سے تیار ہو جائیں لوگ آنے ہیں

والے ہیں۔“

فرجاد اٹھا اور ٹینا کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

برآمدے کے پہلے گھماؤ پر وہ دائیں ہاتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ اور فرجاد اپنے کمرے میں

آگیا۔

شام نو عمر لڑکے لڑکیوں کا بڑا خوبصورت اجتماع تھا۔ بات بے بات قہقہے ابل رہے تھے۔ جوانی

ہزات خود حسن ہے۔ سبھی لڑکے لڑکیاں خوبصورت لگ رہے تھے۔ عمر کا تقاضا تھا۔ فکر تھا نہ تپتی

ماضی۔ حال میں مست تھے۔ چھیڑ چھاڑ بے تکلفی کی ضامن تھیں۔

ٹینا نے سب کو انکل فرجاد کے بیس سال بعد لوٹ آنے کی خوشخبری سنائی۔ خوشی خوشی سب

سے تعارف کروایا۔

ارشلی سے متعارف کرواتے ہوئے حسین سی راز داری کے عالم میں بولی۔ ”ارشلی یہی ہیں انکل فرجاد۔ یہاں کی ہر چیز کے واحد مالک جن کے متعلق میں نے تمہیں بتایا تھا۔

ارشلی ٹینا کا اشارہ سمجھ گیا۔ وہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔

”اب بے دھڑک ہو کر ابو سے ملو ارشلی۔“ ٹینا مسکراتے ہوئے اسے ابو کے پاس لے گئی۔

پارٹی جس مقصد کے تحت کی گئی تھی۔ ابو بھی جانتے تھے اور ٹینا بھی۔

ارشلی کو آصف کے پاس چھوڑ کر ٹینا پھر فرجاد کے پاس آگئی جو اپنے ارد گرد گھیرا ڈالے نوجوانوں

سے بڑی بے تکلفی اور بشاشت سے باتیں کر رہا تھا۔

ٹینا کے دوستوں نے بھی فرجاد کو بے حد پسند کیا۔ گھل مل جانے والے بزرگ نوجوانوں کو اچھے

لگتے ہیں نا۔

ادھر ارشلی اچھا خاصا انٹرویو دے رہا تھا۔ ٹینا اسے خوشی سے دیکھ کر آنکھوں سے شرے

اشارے کر رہی تھی۔ لیکن وہ آصف کے رویے سے برا مسرور تھا۔ امید کا چمکتا دمکتا چہ نظروں سے

ابو جھل نہیں تھا۔

یقیناً آصف نے اسے ٹینا کے لیے پسند کیا تھا۔

”ابو کو کچھ نہیں ہوا۔“

”تو پھر؟“

”ابو نے۔“

”کیا کہا ابو نے۔“

”تمہیں۔“

”مجھے؟ ہاں۔ کیا ہوا مجھے۔ واللہ بولو تو بیٹا۔“

”تمہیں ابو نے رب تکٹ کر دیا۔“

بیٹا نے یہ کہتے ہوئے اپنا چہرہ دو دونوں آنکھوں میں چسپا کیا۔

اور

ارش

پر یوں کے دہس کے اس شہزادے کی طرح جس نے دیو کی آواز پر مڑ کر دیکھ لیا تھا۔ اپنی جگہ پتھرا کر جم گیا۔ ایک گھٹنا زمین پر ٹیکے دوسرے کے بل بیٹھے بیٹا کے گلے پر رکے رہ گیا۔ آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھلیں اور ہونٹ نیم دائرے کی صورت میں وا۔ وہ تو پلک بھینکا بھی بھول گیا۔

بیٹا نے اٹھلیوں کی دروزوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ تو گھبرا کر ہاتھ چہرے سے ہٹا کر ارشی کے کندھوں پر رکھ دیے۔ شرارت بھول بھال وہ سختی سے اس کے کندھے ہلاتے ہوئے بولی۔ ”ارش میں نے تو مذاق کیا تھا۔ خدا قسم مذاق۔ ابو نے تو تمہیں بہت پسند کیا ہے۔ اللہ قسم۔“

ارش کو حواس میں آتے کئی لمبے گئے۔ جب اس نے سختی سے بیٹا کے ہاتھ پکڑ لیے تو بیٹا کھلکھلا کر نہیں پڑی۔

”ایسا مذاق بھی کیا کرتے ہیں۔“ وہ شامی انداز میں بولا۔

”تمہاری آزمائشیں مقصود تھیں۔“ وہ ہاتھ پتھرا لے ہوئے ہنس کر بولی۔ ”پورا اتر آ کر آنا۔“

اس نے خر بے صورت نظروں سے بیٹا کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”سو فیصد۔“ وہ اترائی۔

”اور جو میرا دل بند ہو جاتا تو“ وہ جھک کر تے ہوئے بولا۔

”چلو اب قلمی ہیرو بننے کی کوشش نہ کرو۔“ وہ ہنسی۔

خدا قسم بیٹا۔ ایک لمحے کو تو مجھے یوں لگا جیسے دل بند ہی ہو گیا ہے۔“

”بہت زور درج ہو۔“

”کیوں۔“

وہ خاصی پریشان نظر آرہی تھی۔ چہرے پر فکر کے سائے تھے۔ آنکھوں میں ٹھہری ہوئی کیفیت۔ بال بکھرے بکھرے سے اور لباس سے جیسے خاصی لاپرواہی برتی ہوئی تھی۔ چوڑا کالا دوپٹہ اس نے پیٹ رکھا تھا۔ اور زردی مائل سرخ کپڑے استری سے بے نیاز تھے۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے ابھی ابھی بس سے نکل کر آئی ہو۔

وہ ندی کے اوپر والے گھمٹاؤ کے قریب ایک بڑے سے پتھر بڑے ٹھکے ٹھکے انداز میں آ بیٹھی تھی۔

ارش اس کا منتظر تھا۔ اسے دیکھتے ہی والدینہ اس کی طرف بڑھا۔ لیکن سو گوار انداز دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

بیٹا کچھ نہیں بولی سر جھکائے منتظر چہرے لیے بیٹھی اپنی آدھ کھلی پٹیا کو کھولتی گوندتی رہی۔

”بیٹا۔“ ارشی چند لمبے چپ چاپ اسے سکتے رہنے کے بعد بے صبری سے بولا۔ وہ ایک اداس نظر اس پر ڈال کر بے رنگ مسکراہٹ لیں پر لا کر پھر اپنے شغل میں لگ گئی۔

”چپ کیوں ہو بیٹا۔“ وہ گھٹنے کے بل گھاس پر بیٹھتے ہوئے اس کے قریب ہو گیا۔

وہ پھر بھی کچھ نہیں بولی۔

ارش اس خاموشی سے کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس کی گھبراہٹ اور پریشانی لازمی تھی۔

”آخر کیا بات ہے بیٹا۔ کچھ تو کہو۔ مجھے اب سمجھن ہو رہی ہے۔ پریشان کیوں ہو۔“ گھبراہٹ سے بولکھٹاے ہوئے ارشی نے اس کا گھٹنا پھر زور سے ہلایا۔

”ارش۔“ وہ جیسے رودی۔

”بیٹا۔“ ارشی کی آنکھیں پھٹ جانے کو تھیں۔

”ابو۔“ وہ صرف اسی قدر کہہ سکی۔

”کیا ہوا ابو کو۔ خدا کے لیے جلدی بتاؤ۔ مجھے تو وحشت ہونے لگی ہے۔ کہہ بھی چکو۔ کیا ہوا ابو کو۔؟“

”میری طرف غور سے دیکھتے تو پتہ چل جاتا۔ ہنسی تو روکے نہ رک رہی تھی۔“
 ”میں تجارا بھولا بھالا پیدا ہوا سدا آوی کیسے جان جاتا کہ تم اداکاری کر رہی ہو۔“
 ”خیر ایسے بھولے بھالے اور سیدھے سادے بھی نہیں ہو۔ ہاں تو کوئی کیا بنا ملازمت کا۔ کال ال
 آئی کیس سے۔“

”دو جگہ سے۔“

”پھر۔“

”یہ دونوں جگہیں میری پسند کی نہیں۔“

”اے چھوڑو پسند و پسند۔ بس کرو کیس نوکری۔ شرط ہی پوری کرتی ہے۔“

”شرط کیوں۔“

”اور کیا۔ کوئی یہ نہ کہے لوگا کھلو ہے“ وہ شوفی سے ہنس پڑی۔ ”بہت حیر ہوتی جا رہی ہو۔“
 ارشی دانت کچکا پتے ہوئے مسکرایا۔

”جگہ کہتے ہو۔ جب سے انکل فرجاء آئے ہیں نا۔ میں بہت خوش رہنے لگی ہوں۔ ورنہ پہلے تو
 جہیں پتہ ہی ہے۔ گھر میں دل ہی نہ لگتا تھی۔ پوری ہوتی رہتی تھی۔“

”اب نہیں ہوتی۔“

”توبہ۔ وقت ہی نہیں ملا پور ہونے کو۔ سچی انکل فرجاء تو بہت ہی اچھے ہیں۔ اسنے خوش مزاج
 ایسے کھانڈرے سے۔ اور دل تو اتنا بڑا ہے۔“

”میتانے دونوں بازو جہاں تک پھیلا سکتی تھی پھیلا دیئے۔ ارشی کو اس کی ادا پر ہنسی مٹینا لے
 دونوں بازو جہاں تک پھیلا سکتی تھی پھیلا دیئے۔ ارشی کو اس کی ادا پر ہنسی آگئی۔ وہ بولا۔ ”بہن
 دولت مند آدمی ہیں۔“

”نہیں ارشی۔ دل کی بھی بات ہوتی ہے۔ دولت خرچ کرنا بھی کسی کی کو آتا ہے۔“

بات ہوتی ہے۔ دولت خرچ کرنا بھی کسی کو آتا ہے۔“

کی کی ”ہوں۔“

”دیکھو نا اس دن مجھے شاپنگ کے لیے لے گئے۔ بھی تمہیں کیا بتاؤں ارشی انہوں نے میرے
 لیے خوبصورت خوبصورت ڈریس خریدے۔“

”اچھا۔“

”ہاں ارشی۔ کچھ ڈریس شاپنل بننے کی لیے دیئے ہیں۔ ایک تو کوچی ڈریس ہوا نا ہے۔ اور ایک
 سفید میکسی بننے دی ہے تاروں سے بھری ہوئی ہوگی۔ وہ پتہ ہے میں کس دن پہنوں گی۔“

”کس دن۔“

”اپنی برتھ ڈے پر۔“

”کب ہے تمہاری برتھ ڈے۔“

”دینس کو۔“

”اس ماہ کی۔“

”ہاں ہاں۔ زبردست فکشن ہو گا اس دلہہ۔ انکل انٹرکون میں دعوت دے رہے ہیں۔“

”بڑے شگاف ہیں۔“

”اور نہیں تو کیا۔ اور جانے ہو۔ مجھے پریذنٹ کیا دے رہے ہیں انکل۔“

”کیا؟“

”گاڑی۔“

”گاڑی؟“

”ہاں صاحب گاڑی۔ نئی گاڑی۔ کیا سمجھے؟“

”میتانے آکھیں شرارت سے نچاتے ہوئے ارشی کو لکھا۔ ارشی کچھ نہیں بولا۔ صرف مینا کو تنک
 کیا۔“

”میتانے اپنے ہاتھ ارشی کے ہاتھ پر مارتے ہوئے کہا۔ ”عشش ہی عشش ہے ارشی۔ کیا یاد کرو گے۔
 کس تو ابر بادبی سے پلا پڑا۔“

ارشی نے خاموشی سے سر کو ہنسی ہلایا۔

”تمہیں خوشی نہیں ہوئی ارشی۔“

”کس بات کی۔“

”میں کہ مینا دو دولت مندوں کی اکلوتی وارث ہے۔“ وہ کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔ ”عشش کریں گے
 ہم ارشی عشش۔ انکل فرجاء کے پاس بے پناہ دولت ہے۔“

”ہوگی۔“ ارشی شجیدگی سے بولا۔ ”مجھے ان کی دولت پر کچھ نہیں کرا۔“

”ہائے ہائے۔“ مینا نے ارشی کی ٹھوڑی کو پھونکا۔ ”غیرت شان جوانان دی۔“

”ہاں مینا یہ بات غلط نہیں۔ تمہیں جو کچھ میں ہوں۔ اسے قبول کرنا ہو گا۔“

”وہ تو کیا حضور۔“ وہ کھل کر ہنس دی۔

”بس تمک ہے۔“

”دیکھن تمہیں بھی تو کچھ کم میں ہوں اسے قبول کرنا ہو گا۔“

ارشی کچھ لا جواب سا ہو گیا۔

”وہ ہنسی کی پھوار برساتے ہوئے بولی۔“ دیکھو ارشی دھن آپ برس رہا ہے۔ تو ہمارا کیا قصور۔“

انگل فرجاد نہ آتے تو ان کی دولت ابو نے مجھے تھوڑا ہی دے دی تھی۔ ہماری قسمت کہ انگل آ گئے۔ اور اب سب کچھ جیسے پھوپھو بھاؤ کر مل رہا ہے۔ سمجھے۔“

”سمجھ گیا۔“

”بس اب برائے نام نوکری کر لو۔ ابو تمہاری درخواست مسترد نہیں کریں گے۔“

ارشی نے نیٹا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں قدیلوں کی طرح روشنی دے رہی تھیں۔ وہ پہلا ہے کہیں زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔

دولت کا موضوع بدلے کو ارشی نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ ”تمہیں کیسے یقین ہے۔ کہ ابو میری درخواست مسترد نہیں کریں گے۔“

”بس سمجھ پتہ ہے۔“

”کچھ کما تھا انہوں نے میرے متعلق۔“

”ہاں۔“

”کیا۔“

”کننے لگے اگر ارشی بیکار نہ ہوتا تو میں آج ہی تمہارا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیتا۔“

اس نے بڑا سنجیدہ انداز اختیار کیا۔

”جھوٹی کہیں کی۔“ ارشی نے اس کو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

”مہاتو تمہاری مرضی۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ اور پھر پرے ہٹتے ہوئے ارشی کا منہ چڑایا۔

”بہت مست ہوئی جا رہی ہو۔“ ارشی نے لپک کر اسے پکڑنا چاہا۔ وہ مست ہرئی کی طرح کد کڑے لگاتی بھاگی۔

ارشی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

دونوں ہٹتے ہٹتے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ کبھی گھنے درختوں کے گرد پکڑ لگاتے۔

کبھی بڑے پتھروں کے۔ اور کبھی ندی پر بھولے پل پر پہنچ جاتے۔

حسن و عشق کا معصوم کھیل جیسی کی پھوار اور لکھن کرے قشوق میں جاری تھا۔

”انگل۔“

”ہاں گل۔“

”پھر گل۔“

”کیا فرق پڑتا ہے۔“

”آپ کو میرا نام اچھا نہیں لگتا۔“

”لگتا ہے۔“

”تو پھر گل کیوں کہتے ہیں۔“

”ہوں۔“

”ہاں۔ اکثر آپ مجھے گل کہتے ہیں۔“

”مجھے گل کہنا اچھا لگتا ہے۔“

”ہونہ۔ گل کہتے ہیں گل بانوی کہہ دیا کریں۔“

”گل بانوی سہی۔“

”نہ جی۔ ایسا پرانا نام۔ مجھے آپ نیٹا اور صرف نیٹا کہا کریں۔ کہ میں مجھے اچھا لگتا ہے۔“

”نیٹا جی تو تمہارا اصلی نام نہیں۔ پھر بیکار کا نام کوئی بھی رکھا جاسکتا ہے۔ نیٹا کہہ لیا یا گل پکار لیا۔“

”جی ہاں۔ مجھے صرف نیٹا کہا کریں کہ میں نیٹا ہوں بس۔“

”اچھا صاحب جو مرضی۔“

”ہاں تو کیسے نیٹا۔“

”نیٹا۔“

نیٹا ریمٹ گھماتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی فرجاد اس کے سپید موتیوں ایسے دانتوں کی خوبصورتی سے مرعوب ہو گیا۔

تھے۔ ہوائیں خشک تھیں اور بڑی فراخ دلی سے لڑاتی پھر رہی تھیں۔ ٹینا اور فرجاد ریکٹ لیے کورٹ میں آگئے تھے۔ ملازموں کے چھوٹے پورے بیچ ارد گرد کن کھڑے تھے۔ سامنے برآمدے میں طاہرہ بھابی اور سمیدہ بیگم بھی کرسیاں ڈالے بیٹھی تھیں۔ طاہرہ بیگم اپنے پوتے کے لیے سو سڑھنا رہی تھی اور سمیدہ بیگم بچی کے فراق میں لیس ٹانگ رہی تھی۔

”چلے نکل۔“

”چلو۔“

”مروس میں کیوں گی۔“

”ہیش تم ہی کرتی ہو۔“

”آپ کو اعتراض ہو تو آج آپ کر لیں۔“

”نہیں نہیں۔ چلو تم ہی شروع کرو۔“

دونوں اپنے اپنے کورٹ میں آگئے۔ خاناساں کے بیٹے نے ایک طرف سے قدرے اٹھا ہوا لال ٹیلی رسیوں کا بیٹ درست کیا۔

ٹینا دائیں ہاتھ آگئی۔ اس نے ہلکے پھولدار سرمئی پکڑے پہنے تھے پھولوں کے ہرنگ پاؤزی دوپٹے تھا۔ جسے اس نے کمرے گرد باندھ لیا۔ اور اس کی جیتے ایسی کرکچھ اور تنگ ہو گئی۔ کمر کی تنگی نے اس کے جسم کے سارے اہجار اور بھی واضح کر دیے۔ وہ ایک تراشا ہوا بہت لگ رہی تھی۔

”مروس شروع۔“ ٹینا نے شل کاک اجمال کر ریکٹ اوٹھا کیا۔ ”لو ال۔“

”لو ال۔“ فرجاد بڑبڑایا۔ بڑی چاہت سے اس نے ٹینا کو دیکھا۔ پوائنٹ ٹینا کو لانا۔ فرجاد کی نظریں ٹینا کے وجود میں آئیں تھیں۔ شل کاک کا تو احساس ہی نہ تھا۔ پھر کھیل ذرا جاندار ہوا۔ وہ لون۔ لون۔ قہری لوہ کے بعد فرجاد نے بھی پوائنٹ لیا۔ قہری لون ہوا۔

لیکن ساری ہمت و قوت مجتمع کرنے کے باوجود بیگم ٹینا نے جیت لی۔ وہ خوشی سے اچھلی ارد گرد کھڑے پہنچے بھی نمایاں نہ ہوئے۔ فرجاد کو اس شکست میں بھی مڑو ملا۔

ٹینا ہی کے اصرار پر کھیل پھر شروع ہوا۔

فرجاد کوئی کندہ کلاڑی نہ تھا۔ کھیل کے داؤ بیچ بھی آتے تھے لیکن اس کا دھیان شل کاک سے کہیں زیادہ فوٹنل کاک کی طرح اچھا نہیں لڑاتی تھی۔ ٹینا بھی اس وقت۔

بارنے کی دوسری وجہ ان کی عمر اور سر لیا بھی تھا۔ تیسری بیگم پر وہ ہانپنے لگے۔

”بس سمی۔“ اس نے سیم ختم کر دی۔

”ابھی سے۔“ ٹینا اور کھیلنا چاہتی تھی۔

دونوں بیڈ منٹن کھیلنے آئے تھے۔ ہاتھوں میں ریکٹ پکڑے کورٹ میں کھڑے تھے۔ جوبلی کے پچھلے کھن میں یوں تو برسوں پرانا بیڈ منٹن کورٹ تھا۔ لیکن فرجاد نے از سر نو اسے ٹھیک کر دیا تھا۔ گراؤنڈ اچھی طرح ہموار کروا کے لائنیں لگوائی تھیں۔ بنائیت منگوا لیا تھا۔ ریکٹ اور شل کاک بھی بھی بہت سے منگوا لیے تھے۔ ایک دن باتوں باتوں میں ٹینا نے کہا تھا کہ اسے کھیلوں میں بیڈ منٹن بہت پسند ہے۔ لیکن جوبلی میں کوئی ایسا ساتھی نہیں ملتا۔ جو اس کے ساتھ گھنٹوں کھیل سکے۔

”میں کھیلا کروں گا تمہارے ساتھ۔“ فرجاد نے کہا تھا۔

”آپ کھیل سکیں گے۔“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”کیوں نہیں۔“

وہ حسب عادت ہنس پڑی تھی اور بولی تھی۔ ”دیے آپ کو کھیلنا یا چاہیے۔ انکل اتنے موسم۔“

موسم کو اسے پسند نہیں۔ اچھی ورزش ہو گی۔ ایک دم سارٹ ہو جائیں گے۔“

فرجاد کو اپنے باکل پہ فرسبی جسم کا ایک کھ کھوا احساس ہوا۔ یہ کھ کوفت وہ تھا۔ ٹینا اپنے دونوں ہاتھ اس کے پیٹ پر رکھ کر دہاتے ہوئے خوشی سے ہنسی۔ ”انکل یہ آپ کی گول مول نمی اندر پہنی جائے۔ تو خدا قسم آپ بہت ہی اسارت ہو جائیں۔“

دوسرے ہی دن فرجاد نے باقاعدگی سے بیڈ منٹن کھیلنے کا ہتہام کیا۔ پھر صبح و شام دونوں یہ کھیل کھیلے۔

عموں کے تقاضے جاندار حقیقت تھے۔ کہاں انہیں سالہ ٹینا جس کی رگ رگ میں جوانی خون کی جگہ بارہن کر دوڑ رہی تھی۔ جس کا جسم پچھلے ہوئے بڑی سی پلک رکھتا تھا۔ جو دائیں بائیں یوں دھری ہو جاتی تھی۔ کہ کسی پھیل کر سبز شاخ کا گمان ہو۔ جو تین فٹ آسانی سے اچھل کر ٹنٹل کاک کو ریکٹ دکھائی تو بڑی کینے کے اچھلنے کا احساس ہوتا۔ جو ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف دو دو گر جاتی۔ تو کسی جل جھلی کے تیرنے کا انداز لگتا۔ تیز اور پھرتی تھی۔ اس کے شل کاک بے حد خوبصورت لگتے۔ اس کے کس کس کا جواب نہ تھا۔ کہاں بیٹا لیس سالہ فرجاد جس کے جسم پر وقت کے قدموں کے گہرے نشان تھے۔ جو مونا بہت خشک نہیں تھا۔ لیکن جسم بھاری ضرور ہو گیا تھا۔ جو تیزی اور پھرتی نہیں دکھا سکتا تھا۔ جو اچھل نہیں سکتا تھا۔ تیر کر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک نہ جاسکتا تھا۔ عموں کا فرق تو واضح تھا۔

لیکن جذبول کی تو کوئی عمر نہیں ہوتی۔ یہ تو بیٹہ ایک جیسے رہتے ہیں بیٹہ ایک جیسے۔

جان

سدا بہارا!

آج موسم خوشگوار تھا۔ جات پھر ریش ہوئی رہی تھی۔ اب بھی تلخے بدل آسمان میں تیر رہے

”شام کو کھیلیں گے۔“ وہ سانس بحال کرتے ہوئے بولا۔
 ”ہائے اللہ اتنی جلدی آپ کا سانس پھول جاتا ہے۔ انکل آپ کو اپنا علاج کرانا چاہئے یا نہ
 دھت کم کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔“

دونوں ساتھ ساتھ چلتے چلتے انھوں میں ریکٹ لئے برآمدے کی طرف آگئے۔ ٹینا بالکل تازہ دم
 تھی۔ ریکٹ کو تیزی سے گھماتے ہوئے انکل کو وزن کم کرنے کے مشورے دے رہی تھی۔
 طاہد بیگم اور سعیدہ کے قریب سے گزرتے ہوئے دونوں نے سلام کیا۔ فرجاد کا سانس ابھی
 تک پھولا تھا۔ ٹینا ہلکی اور چاق و چوبند تھی۔ وہ بار بار فرجاد پر ہنس رہی تھی۔

دونوں برابر چلتے برآمدے کے گھماؤ مڑ گئے۔ تو طاہد بیگم نے آگے کو جھک کر سعیدہ
 سرگوشی کی۔ یہ فرجاد تو بالکل جیسے بچہ ہی بنا ہوا ہے۔ یہ کھیل اب بھلا اس سے کیسے جاسکتے ہیں۔
 ”ہاں بھابی۔ دیکھا سانس کیسے پھول رہا تھا۔“

”ہر بات وقت پر اچھی لگتی ہے بی بی۔“
 ”ٹینا تھی خواتین سے کھیل کی۔ اسی کے لئے کیلتے ہیں۔ ہر بار دہرائی جاتے ہیں۔“
 ”تو لو۔ کیا تو عمر بھر سے جیت پائیں گے۔ کہاں وہ کہاں ٹینا۔ فرجاد قدم اٹھاتے ہیں۔“
 چھلانگ لگا جاتی ہے۔

دونوں کچھ دیر اسی موضوع پر باتیں کرتی رہیں۔ پھر طاہد کے ہاتھ تیزی سے سلاخیوں پر پلٹ
 گئے۔ اور سعیدہ یس ٹانگ کر فرما کر تہہ کرنے لگی۔

چاروں تاش کھیل رہے تھے۔ ٹینا اور فرجاد آٹے ساٹے بیٹھے تھے۔ آصف اور نصیر ساتھی
 تھے۔ نصیر کو سوپ اچھی لگتی تھی نہ دی۔ وہ تو تلاش کر رہا تھا۔ فرجاد اور ٹینا کی خاطر چند بانیاں
 کھیلیں پھر آٹا کر کے پیمیک دیے۔ آصف تو جیسے موٹے کی تلاش میں تھا۔ بندھا بندھا کھیل
 رہا تھا۔ نصیر کے بچے پھینکتے ہی بولا۔

”بس جی بی۔ بت کھیل لیا۔“

”ایو۔ ابھی سے بس۔“ ٹینا بچے سمیٹتے ہوئے بولی۔

”بیٹے مجھے تھوڑا سا کام کرنا ہے۔“ وہ کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ کر بولا۔ ساڑھے دس بج رہے
 ہیں۔ سونا نہیں۔“

”تھیں تو ہی کھاتے اور سونے کے سوا کچھ بھی نہ آیا آصف۔“ فرجاد نے سگریٹ سلاگتے
 ہوئے کہا۔

”تو تم دونوں کا ارادہ ابھی اٹھنے کا نہیں، نصیر اٹھتے ہوئے بولا۔

”بالکل بھی نہیں۔ ابھی تو ہم کھیلیں گے۔ کھیلیں گے۔ خوب کھیلیں گے کیوں انکل۔“ ٹینا
 بچے پھینکتے ہوئے بولی۔

”ہم تو چلے بھی، نصیر نے جھک کر اپنی ماچس سگریٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”خدا حافظ۔“ ٹینا نے مسخرے پن سے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

”خدا حافظ۔“ مسکراتے ہوئے نصیر نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

”چھت والے طویل و عریض خوبصورتی سے آرامتہ کمرے میں بیٹھے تھے۔ باہر دم جم
 دہائی تھی۔ اور یونوں کا ترنم خوشگوار محسوس ہو رہا تھا۔ چوڑے چوڑے دروں کے پردے ہوا
 سے لہرا رہے تھے۔ جب تیز ہموکا آتا۔ تو پردے دور تک اٹھ جاتے اور برآمدے سے باہر آنے
 لے آسمان میں حیرتے کالے بالوں میں چمکتی جلیاں چکاچودند کر دیتی۔

ہوا کے ریلے سے کبھی کبھی ہلکی سی پھوار اور تک آ جاتی۔ خوبست بھلی لگتی۔ یہ پھوار کی زد

میں بیٹھی بیٹا کے بالوں میں موتیوں کی طرح چمک رہی تھی۔

ارغوانی قالین پر گاؤں کیوں کے سارے بیٹھے فرجاد کی نگاہیں بڑے شوق سے ان موتیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ بیٹا گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ قریب ہی کیسٹ پڑا تھا۔ جس میں اس کے پسندیدہ گانے ریکارڈ تھے۔ بچے سر میں گانے فضا میں ترنم بکھیر رہے تھے۔ یوں دلوں میں ہلکی سی دھندلاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ کروڑا کسپا لیکن خوشبودار دھواں بیٹا کو ہمیشہ سے پسند تھا۔

”نصیر اور آصف کے اچھے جانے پہ بیٹا نے کیسٹ کی آواز قدرے اونچی کر دی۔

”پانٹوں۔ اس نے پتے پھینکتے ہوئے فرجاد سے پوچھا۔

”پانٹو۔“ وہ سرگیت کا کٹ لیتے ہوئے بولا۔

بیٹا نے پتے بانٹے۔ سوپ شروع ہو گئی۔ اسے پتے کچھ اچھے نہ آتے تھے۔ اس لئے مزہ برا بنا۔ فرجاد سکرانے لگا۔

”بار جاو گی اس دھن۔“ وہ بولا۔

”کھیلے تو چاہیے۔ ہارنا میں نے نہیں سیکھا۔

”تو اب سیکھ لو گی۔ میرے پتے ایک دم شاندار ہیں۔“

”دیکھوں گی۔“

”پھینکنا۔“ فرجاد نے اسے متوجہ نہ پا کر کہا۔

بیٹا نے ہاتھ میں پکڑے سارے پتے پھینک دیئے۔ اور کیسٹ اٹھا کر قریب رکھ لیا۔

”یہ کیا۔“ فرجاد نے چراگئی سے پھینکے ہوئے پتے دیکھے۔

”بس اٹکل۔ سنئے دربار ستار پر کسی خوبصورت دھن بج رہی ہے۔“ وہ آکھیں بند کرتے ہوئے

بے سدھ سی نظر اُٹائی۔

فرجاد کھٹکی بانڈے اسے کئے گئے۔

”گاؤں کیلئے یہی کہانی ہے۔“ وہ آکھیں بند کئے وہ نیم درواز ستار کی دھن سن رہی تھی۔

فرجاد تھے ہوئے وقت کی طرح اسے ایک ٹک کے جا رہا تھا۔ دھن ختم ہوئی تو وہ ایک دم سنبھل کر بیٹھ گئی۔ سر کو قسین و آفرین کے انداز میں ہلاتے ہوئے بولی۔ ”لطف آگیا۔“

”بہت پسند ہے ستار۔“ فرجاد نے کہا۔

”بے حد۔“

”بجائے آئی ہے؟“

”اوں ہوں۔“

”صرف سننے کا شوق ہے؟“

”بجائے کا سننے سے کہیں زیادہ ہے۔“

”تو پھر سیکھ کیوں نہیں؟“

”ابو۔“ بیٹا نے آکھیں گھماتے ہوئے اسے مسئلہ خیر انداز میں کہا۔ کہ فرجاد کو ہنسی آگئی۔ پھر

مرا لیا شوق سننے اس نے پوچھا۔ ”میں بندوبست کروں۔“

”ہائے اٹکل آپ کتنے اچھے ہیں۔

”کل ہی ستار آچا ہے گی۔“

”ابو سے پہلے پوچھ لیں۔“

”میرا کوئی حق نہیں تم پر۔“

”جی۔ جی ہے۔“

فرجاد نے کچھ اس انداز سے اور کچھ ایسی نظروں سے بیٹا کو دیکھ کر کہا۔ کہ وہ کچھ ہو کھلا سی گئی۔

لیکن جلد ہی اس کا ذہن آئینے کی طرح صاف تھا۔ اٹکل اسے بہت زیادہ چاہتے تھے۔ یہ اس کو پتہ

تھا۔ چاہت کا یہ رنگ لمحہ بھر کو عجیب سا محسوس تو ہوا۔ لیکن فرشتوں کی نیت پر کبھی شک ہو سکتا

ہے۔

دوسرے ہی دن ستار آگئی اور اسی ہفتے استاد زاہد علی خان بیٹا کو ستار سکھانے پر مامور ہو گئے۔

بیٹا کی خوشیوں کا شکندہ نہیں تھا۔ پہلے پہلے تو ابو سے ڈری جھجکی۔ لیکن فرجاد کے سامنے

”آصف کے کچھ کہنے کا سوال ہی کیا تھا۔ آصف نے دے لفظوں میں کچھ کہا تو فرجاد بولا۔ ”صلاحیتوں

اکھاؤں معافی کے قابل نہیں ہوں۔ بیٹا کی بہت سی صلاحیتیں ترسناک کر رہے ہوں۔“

”اچھا بھئی تم جانو اور بیٹا۔“ آصف نے بحث میں الجھنے کی بجائے ہتھیار ڈال دیئے اور یوں بیٹا

چھوٹی اور اطمینان سے ستار سیکھنے لگی۔

شوق اور لگن فن کو جلا بخشنے میں بیٹا کو جیسے اور کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا۔ استاد کے آنے

سے گھنٹوں پہلے اور اس کے جانے کے گھنٹوں بعد وہ ستار کے تاروں سے سُر نکالتی رہتی۔ گھنٹوں

کے بل ایک طرف کو جھکی ستار تھا۔ وہ دوڑے دوڑے انداز میں مضرب سے تاروں کو چھیرتی تو

ممانے بیٹھے فرجاد کو مضرب کی ہر ضرب اپنی رگ جاں پر پڑتی محسوس ہوتی وہ ہلکیں جھپکاتے بنا

اسے دیکھے جاتا نکل بانو کے ایسے ایسے روپ اس سے پہلے تو نہیں دیکھے تھے۔ یہ حسن جہاں سوز۔ یہ

گافراوا نہیں۔ یہ قاتل انداز فرجاد ہی دار بڑے تواتر سے کہا رہا تھا بڑی مسرت افزا لذت تھی۔ اسے جا

دہا تھا۔

زمن اپنے محور کے گرد گھومتی ہے۔ گھماؤ کی رفتار اور انداز ازانی ہیں۔ اسے صرف گھومنے کا

بیٹھا تھا۔

کھینٹے کھینٹے اچانک بیٹا نے کمر اٹھایا۔

”کل۔“ فرجاد نے اس کی طرف دیکھا۔ یہ کیا حرکت۔“

”بس۔“ بیٹا نے خوشی سے کہا۔ ”کل کیوں کہا مجھے۔“

”اٹھاؤ پورڈ۔“ فرجاد نے سمجھنا نہ انداز میں کہا۔

”نہیں اٹھائی۔“ وہ ہنسی۔

”اٹھاؤ۔“ فرجاد رعب وال رہا تھا۔

”نہیں۔“ مگر تے جسے کی طرح ہنسی پھوٹ پڑی۔

”اٹھائی ہو یا۔“

”فرجاد کرسی سے اٹھنے کو ہی تھا۔ کہ وہ خوشی سے۔ مستان ادائی سے شرارت سے“ نہیں

اٹھائی نہیں اٹھائی۔“ اتنے اٹھا بیٹھا گی۔

فرجاد اسے پکڑنے کو بیچھے لپکا۔

بیٹا کے جسم میں تو بجلیاں بھری تھیں۔ وہ ہنسنے ہوئے قہقہے لگاتے ہوئے دوڑ رہی تھی۔ اوپر

والے لیے برآمدے سے وہ دم دم کرتی میڑھیاں اتری۔ چلی بارہاری میں بھاگتی ہوئی بیوی جن

میں آگئی۔

فرجاد اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ سانس پھولا تھا۔ باپ رہا تھا۔ پھر بھی اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ لپک

رہا تھا چھٹ رہا تھا۔ دونوں آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ پیچھے چلاتے قہقہے لگاتے ہوئے۔

اور بہت سی

خیر

اشارہ باز نظریں۔

ان کا تقاب کر رہی تھیں۔

طالعہ بھائی نے توکل پر انگلی رکھ کر کہا۔ ”ہے یہ ہے فرجاد کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ سیگ کناکر

چھڑوں میں شامل ہونے والی بات ہے۔“

”اسی بے تکلفی بھی کیا۔“ نوری نے عاوار انداز میں کہا۔

”فرجادی نیت لگتا ہے۔۔۔۔۔۔“ عیدہ کچھ کہتے ہوئے چپ ہو گئی۔

طالعہ بھائی مسکرا کر بولی۔ ”ہرج تو کلی نہیں۔“

”اے ہے کہا۔“ نامی نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ ”کمال بیٹا کمال فرجاد۔ عمروں کا فرق تو

دیکھو۔“

پتہ ہے بے سمدھ لگن کے ساتھ اسے یہ پتہ تھوڑا ہی ہوتا ہے کہ سورج کی تیز نگاہیں اس پر جمی ہیں۔ یہ نگاہیں اور گھماؤ مل کر اس کے وجود کو کبھی کالا اور کبھی سپید کر دیتے ہیں۔ وہ تو گھومتے ہیں اس قدر مگن ہوتی ہے کہ یہ بھی احساس نہیں ہوتا۔ شدت و تندی سے وہ اپنی جگہ سے بھی کھسکی جاتی ہے اور جگہ سے ہٹتا ہے سرگرم سے دوچار کرتا ہے۔

فرجاد بھی زمین تھا جو بیٹا کے گرد گھوم رہا تھا۔ اندھے سے اور روشنی سے بے نیاز سرودی اور گرمی سے بے خبر۔

فرجاد اور بیٹا کا اس قدر تھل مل جانا۔ اکٹھے رہنا۔ کبھی بیٹھنا۔ کبھی کھڑک۔ کبھی ناش کبھی لٹو کھینا۔ اور کبھی گھٹنوں ستار لٹے۔ فکار اور پرستار۔ سب سے روتا سورج کی آنکھوں میں چھپنے لگا تھا۔ پھر فرجاد بیٹا کے لئے جس طرح پیہر خرچ کر رہا تھا۔ اس کی فرائض مند سے نکل بھی نہ پاتی تو پوری کر دیتا۔ خوبی والوں کے دسے دسے لفظوں میں ایک موضوع بن رہا تھا۔

اب ان کی حرکتوں پر آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہو جاتے تھے۔ لیوں پر طنزیہ مسکراہٹ آجاتی تھی۔ اور کوئی نہ کوئی جلتا ہوا جملہ زبان سے نکل جاتا تھا۔

ابھی دونوں ہی پہلے کی بات تھی۔ بیٹا اور فرجاد کمر کھیل رہے تھے۔ بیٹا کمر کی مشاق کھلاڑی نہ تھی۔ ہریا بار جاتی۔

فرجاد اپنی کامیابی پر خوشی سے جلا اٹھا۔ خوب تائیاں پھینتا اور بیٹا کو چراتا۔

”کھیل کھو تو پھیلے۔“

”آگئیں ہم سے کھیلے۔“

”مانے ہوئے کھلاڑی ہیں مانے ہوئے۔“

”حت۔ حت۔ برا تیرس آتا ہے۔ لو اس دفعہ میں جان ہو جو کہار جاؤں گا۔“

بیٹا کو غصہ آجاتا۔ اس کے رخسار تھمتھماتے لگتے۔ اور وہ زیادہ مستعد ہو کر جیتنے کے لئے کھیلنے لگتی۔

ہرے ہرے کپڑوں میں وہ ان چھوٹی گلاب کی کٹی بنی فرجاد کے سامنے کمر کے دوسری طرف کرسی پر بیٹھی تھی۔ اپنے سیاہ بالوں کی تاگن ایسی چوٹی اس نے اپنے گلے کے گرد ہلکا سا چکر دے کر کندھے پر ڈال رکھی تھی۔ کبھی کبھی گل بانو جب کام میں مصروف ہوتی تھی۔ تو بالوں کو اسی انداز سے گلے کے گرد بچھا کر کندھے پر ڈالاکرتی تھی۔ انسان مرنے کا انداز نہیں مرنے میں منتخل ہوتے رہتے ہیں۔

فرجاد کو اس پر اتنا پتا آرہا تھا کہ بازوؤں میں بھر کر سینے میں سیٹھ لیتا چاہتا تھا۔ آج اسے اپنے صبر و ضبط کے بند فوٹے محسوس ہو رہے تھے۔ جانے وہ کس طرح اپنے بے قابو جذبات کو قابو کے

اور

یوں یہ کاناپھوسی۔ اندر ہی اندر پھیلتی گئی۔ کوئی جن میں تھا کوئی مخالف۔ آصف بھی قربان۔
والمانہ پن سے کبھی کبھی سوچوں میں ڈوب جاتا۔ وہ بھی آنکھیں رکھتا تھا۔ اک دنیا دیکھی تھی۔ نہ
ان مراحل سے گزرا تھا۔

لیکن

فرجاد کے متعلق کوئی آخری فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ فرجاد بہت مگر انسان تھا۔
اس کی چاہت ہو سکتا ہے۔ برسوں کی محرومی اور اپنوں کی دوری کا نتیجہ ہو۔ اس چاہت میں
بھی ممکن تھا ایک اچھے دوست اور شفیق باپ کے جذبات ہوں۔

اور اور

یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ فرجاد کل بانو کے ہونے کو یٹنا میں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔
یہ سب آصف کے ذہن کے مفروضے تھے۔ حقیقت کیا تھی۔ ابھی تک وہ اس تک نہیں پہنچ
پایا تھا۔

تیار ہو کر یٹنا نے قد آدم آئیٹینے میں اپنا سر لایا دیکھا۔ تو پیسے خود بھی اپنے آپ کو پہچان نہ پائی۔
اسے اپنے قاتلانہ حد تک حسین ہونے کا شاید پہلی بار احساس ہوا۔ اور اس احساس کے ساتھ ہی
اس کی آنکھوں میں غماز پھیل گیا۔ اور وہ ہنوں پر چار مارا مجسم۔ ارشی کا سر لایا اس کی نظروں میں
گھومتے گا اور وہ اپنے آپ کو سمجھنے ہوئے ارشی کے متعلق سوچنے لگی۔

فکشن ہوٹل میں تھا۔ شاندار عشا یہ تھا۔ فرجاد کی طرف سے دی گئی اس دعوت میں بے پناہ
گھروں کو بلایا گیا تھا۔ ساڑھے سات کا وقت دیا گیا تھا اب سات بجنے والے تھے۔ حویلی کے سبھی
لوگ تیار ہو رہے تھے۔ جو تیار ہو جاتا۔ بیٹی برآمدے کی طرف آ جاتا۔ یوں کافی ہجوم ہو گیا تھا۔
انہیں ہوٹل تک پہنچانے کے لئے گاڑیوں کی لمبی قطار برآمدے کے سامنے سے ہوتی ہوئی پچھلے
پہن تک چلی گئی تھی۔

فرجاد نے سیاہ مائل نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ یہ بلاشبہ اس کے بہترین سوٹوں میں سے
تھا۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ آنکھوں کی پر اسرار سیاہیوں میں راز گھل رہے تھے۔ وہ بڑی بے چینی
لے یٹنا کی آمد کا منتظر تھا۔ یٹنا کا لباس اس نے خود اپنی مرضی سے تیار کروایا تھا۔ وہ اس کی بچ بچ یٹنا
کے خوبصورت پیکر پر دیکھنے کو بے تاب تھا۔ اس نے اپنے زیورات کا وہ بھاری سیٹ بھی یٹنا کو پہننے
کے لئے دیا تھا۔ جو اس کی تاروں بھری میکی کے ساتھ موزوں تھا۔ اور نئے یٹنا پہننے کے حق میں نہ
تھی۔ کہ اس سے تو پوری دلنوی دکھائی دے گی۔ فرجاد کے اصرار کے سامنے یٹنا کا انکار موم کی طرح
پھسل گیا تھا۔

یٹنا برآمدے میں آئی۔ تو سب کی نظریں دادو حسین لئے اس کی جانب اٹھ گئیں۔ فرجاد تو
فرجاد اسے تو ہر کوئی سکتا ہی رہ گیا۔

”ہائے اللہ مجھے تو شرم آنے لگی ہے۔“ وہ نظروں کے انہماک سے سرخ ہوتے لگا کر بولی۔
لوگوں کے سامنے کیسے جاؤں گی۔“

”ہاشاء اللہ۔“

”نظر دور۔“

”خدا اپنے حفظ و امان میں رکھے۔“

”کتنی پیاری لگ رہی ہو بیٹا۔“

”نظر اُتارنا چاہئے۔“

”آصف صدق ضرور دیتا بنی گا۔“

سب بیٹے بیٹیاں بلا میں چلے گئے۔ کسی نے پیار کیا۔ کسی نے پشت پر ہاتھ پھیر کر ہمارے لڑکیوں بالوں نے تو بیٹنی جملے گئے۔ لاکے حسین بھری نظروں سے دیکھ کر مسکرائے۔ بیٹا شرمیلی سی مسکراہٹ سے شکر یہ ادا کرتے ابو کی طرف بڑھی۔

”سالگرہ مبارک ہو بیٹے۔“ آصف نے اس کی پیشانی پر شفقت سے بوسہ دیا۔ پھر وہ کھڑے فرجاد کی طرف مڑی۔ مسکرائی اور لچاتے لچاتے لمبے میں بولی۔ ”انکل! آپ نے تو مجھے پوری دوسری دہائی ہی بنا دیا۔“

فرجاد کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

”اب یہ زور اُتار دو انکل۔“ بیٹا اس کی نظروں کے انداز سے جھپٹتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔“ فرجاد نے حکمانہ انداز میں کہا۔

اور

اور گرد دکھری عورتوں کی نظروں کے آہٹیں میں کئی چارے ہو گئے۔

فرجاد نے ہاتھ میں پکڑی موٹر کی چابی ہٹائی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”سالگرہ مبارک ہو۔“

”شکریہ انکل۔“ بیٹا نے چابی لے لی۔ اور فرجاد کے ہاتھ کو اظہار عقیدت کے طور پر تھام لیا۔

سب نے فرجاد کے ہتھے کی راد کے طور پر تائیاں بنائیں۔ اور اسی شور شرابے میں کوئی فرجاد کی اس کیفیت کو نہ دیکھ سکا۔ جو بیٹا کے ہاتھ تھام لے کر اس کے چہرے کے آئینے میں منعکس ہو کر اگلاں حقیقت بن رہی تھی۔ ہوٹل کا وسیع و عریض ہال دو شینوں سے بھرا ہوا تھا۔ سالگرہ کی مناسبت سے ہال کی آرائش کی گئی تھی۔ جو جدید و زیب و دلربا تھی۔ دو شینوں کے حسین استراچ میں آکر کمرہ کی خوبصورت دھنیں فضا کو انتہائی خوشگوار بناتی تھیں۔

لوگوں کا سب بڑا اجتماع تھا۔ رنگ و نور کا سیلاب امنڈ رہا تھا جھلکے زور۔ سرماسے رشتہی لباس۔ علی اور غیر علی پر فوج، سگریٹ کے دھوئیں۔ قہقہے مسکراہٹیں سب غلط ہو رہے تھے۔ بیٹا اور فرجاد دونوں ہی ہجوم میں گھرے تھے۔ دونوں کی اہمیت اپنی اپنی جگہ تھی۔ فرجاد شادمان جان پہچان والوں عزیزوں اور دوستوں کو بیس سال کے طویل عرصے کے بعد مل رہا تھا۔ بیٹا کی سالگرہ تھی۔ لوگ مبارک باد کے لئے اس کی طرف بھی متوجہ تھے۔

مبارک سلامت اور ملے لانے کا سلسلہ ختم ہوتے ہی فرجاد اور بیٹا اپنے اپنے حلقوں میں بٹ گئے۔ فرجاد کو دوستوں نے گھیر لیا اور بیٹا اپنے دوستوں اور سیلیوں کے محرمات میں آگئی۔ اس کے حسن جہاں سوز۔ اس کے لباس کے انتخاب اور اس کے زیورات کی ٹاپائی کے چہرے بھی کی زبان پر تھے۔ ارشی تو جیسے بن چے ست ہوا جا رہا تھا۔ نگاہیں بارگاہ حسن میں بار بار بربہ ویز ہونے کے ساتھ ساتھ مسلسل گستاخیاں بھی کئے جا رہی تھیں۔ بیٹا مسکراہٹوں سے ان گستاخیوں کو بخش رہی تھی۔

”ہائے بیٹا تم کتنی کٹی کلی ہو۔“ شائلہ نے حسرت سے اسے دیکھا۔

”ایسا انکل تو خدا ہمیں بھی دے۔“ یوسف نے دھانے انداز میں ہاتھ اٹھائے۔

”برقہ ڈے پر گاڑی پر پرنٹ لی۔“ شائنی نے آنکھیں منکھائی۔

”بیٹاؤ۔“ بیٹا سب کی باتیں سننے کے بعد مسکرائی۔ ”شادی پر کیا ملے گا۔“

”کیا۔“ تقریباً بھی بولے۔

”پوری دنیا کی سیر کرائیں گے انکل۔ مزے ہیں نا۔“ وہ اٹھا کر ارشی کو دیکھتے ہوئے مہتی خیز انداز میں بولی۔

”دینا کیسے۔“ دو تین آوازیں اٹھیں آہٹیں۔

”ہاں بھئی۔“ بیٹا بڑے قفاخر سے مسکرائی۔ ”میں جو ہر وقت انکل کا سر کھاتی رہتی ہوں۔ کہ فلاں ملک کیسا ہے۔ فلاں شہر کیسا۔ تو تنگ آکر بے چارے انکل نے وعدہ کر لیا کہ شادی کے فوراً بعد پوری دنیا کا ٹور کروائیں گے۔“

”کیسے تمہیں یا تمہارے میاں کو بھی۔“ شائلہ خوشی سے ارشی کو دیکھ کر بولی۔

”پہلے میرا میاں پھر میں۔“ بیٹا نے کبھی تڑپ نہ تڑپ کر جواب دیا۔

”عیش ہے بیٹے۔“ یوسف نے ارشی کے کان میں کہا۔

”مجھے پتہ ہو جاتا۔“ عمران نے اس قدر مسخرے پن سے کہا کہ سب نے زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر باری باری سبھی مسخرانہ انداز میں باتیں کرنے لگے۔ قہقہوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔

کھانا انتہائی شاندار تھا۔ اور کھانے کے بعد محفل موسیقی اس سے بھی زیادہ شاندار۔ خوب سالن بڑھا تھا۔ بڑے ریلے گائے گئے۔ بڑی مرص غزلیں سنائی گئیں کچے راگ بھی لوگوں کی پسند پر پیش ہوئے۔

اور

جب محفل پورے عروج پر تھی۔ لوگ سر ہلا ہلا کر داد دے رہے تھے۔ واہ وا کے نعرے سے

ایک ایک بلند ہو رہے تھے۔

اس وقت ارشی اور ثنا باہر چمن میں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے سرسبز ہنڈولے بھول رہے تھے۔ جی بھر کے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔
دونوں شاواں و فرماں ملتے ملتے فوارے کے قریب حوض کی مندر پر آ بیٹھے۔ شاید غریبوں کی بہادری کہیں کھائی جا رہی تھیں۔

اور اندر۔ یونہی فرجانیے حاضرین پر نگاہ ڈالی۔ کسی حسب حال شعر پر ثنا کو دیکھنا چاہا۔ انکا وہاں کی زبان سے شعر کا مفہوم اس پر واضح کرنا چاہا۔ تو۔ ثنا کو نہ پاکر وہ حیران سا ہوا۔ کئی لمحوں کے آنے کا انتظار کیا۔ جب وہ نہ آئی۔ تو اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا۔ اور اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے چلا گیا۔

ثنا کو دور ہی سے پہچان لیتا کون سا مشکل تھا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان کو دیکھ کر اس نے کہنے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اسے کچھ پتہ نہ چلا وہ کیا اور کیوں دیکھ رہا ہے۔

انکشاف انتہائی تباہ کن تھا۔ فرجاد کے قدم جیسے زمین ہی میں گر گئے۔ اور جب کتنی ہی دیر ہو، ثنا اور ارشی ہاتھ میں ہاتھ دینے لہراتے مسکراتے گنگنائے اپنی جگہ سے اٹھ کر برآمدے سے باہر ہال میں چلے گئے تو فرجاد کو یوں لگے جیسے آگ لگنا "ساری روٹیاں گل ہو گئی ہیں۔ چاروں دست کمر اندھیرا پھیل گیا ہے۔ اور مستقبل کی ساری راہیں اندھی ہو گئی۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ کوئی شے نظر نہ آ رہی تھی۔ خوبصورت بیڑہ۔ اس کی جالی دار ہال میں۔ قالین بکھرے دار نرم نرم گرم کرسیاں کھڑکیوں کے بھاری روشنی پر دے دیوار گیر بنیادیں بینکڑ۔ کانسی کے بت پتھر کے مجسمے۔ رنگ سرخ کے قدیم نگار۔ وہ بھی روشنیوں بکھیرنے والے ٹازک ٹازک شیشوں والے لپ اور چھت کے سینے میں لٹکا رو شنیوں کا بیخ چینی ٹافوس سب اندھیرے نے ان کو چاٹ کر ان کے ہونے کی نفی کر دی تھی۔ کمرہ قبر کی طرح بند تھا۔ ساری آرائشی اور زیبائشی چیزیں اس میں دفن تھیں۔

خوبصورتی اور دلکشی صرف روشنی کی چٹائی ہی کا نام ہے۔ ورنہ بذات خود یہ کچھ بھی نہیں۔ چمک دک کا احساس اسی کے دم سے ہے۔ حسن زیبائش رعنائی سب روشنی ہی کے کمالات ہیں۔ روشنی اندھیرے کی ضد ہے۔ اندھیرا جنہیں چاٹ جاتا ہے روشنی انہیں اجاگر کرتی ہے۔

اسے نظر واقعی کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔ اندھیرا نہ بھی ہوتا تو شاید جب بھی اسے کچھ نظر نہ آتا۔ اس کے مستقبل کی راہیں اندھی ہو چکی تھیں۔ اور بڑے اربابوں سے تعبیر کی ہوئی جنت سیاحوں کی اوتھ پھپھ بچی تھی۔

گل بانو کو کھو کر اس نے ثنا کو پایا تھا۔ تو اسے جہن سالوں کی ساری اڑتیں ذہنی بچو کے بذاتی مدد سے بھول گئے تھے۔ اس نے سوچا تھا اسے اپنی طویل ریاضت کا پھل مل گیا ہے۔ بھاگتے بھاگتے تھک کر گرا تو نہیں اپنی منزل پہ پہنچی محسوس ہوئی۔

نکین

وہ ماہ و سال کی گردشوں سے پیدا کردہ تغیرات کو نظر انداز کر کے ہوئے تھا۔ شاید وہ کسی وجود کا کسی شخصیت کا نہیں صرف جذبات کی علامت بن کر رہی رہا تھا۔ جذبات!

جو کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔ جو سدا ببار ہوتے ہیں ہمیشہ ایک جیسے۔

اس نے اب تک صرف ایک ہی رخ کو دیکھا تھا۔ ایک ہی زاویہ پر جھکا تھا۔ ایک ہی سوچ کو ذہن میں جگہ دی تھی۔ محبت ایک اٹل سچائی ہے۔ اس سچائی کے سامنے وہ سرنگوں تھا۔ اس نے ثنا کو اس شدت سے چاہا تھا۔ کہ شاید اس کے من میں گل بانو کے لئے بھی ایسے شہید اور سرکش

تھی۔ ناچنگلی چنگلی کے دور میں داخل ہو رہی تھی۔

اور

ایک چیز کا شواہد دوسری کا بیٹا اچھا خاصا اٹھالی عمل ہے۔ فریاد جانتا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا۔ اسنے دونوں سے اس کا اور بیٹا کا ساتھ تھا۔ لیکن بیٹا بھی اس کے جذبات کو سمجھ نہ پائی تھی۔ وہ تو کھلنڈری شرخ شرخ اور چنگلی سی لڑی تھی۔ شعور میں ستانت سنجیدگی یا ٹھنڈا ہوا تو شاید وہ فریاد کی ذہنی کیفیات کے متعلق بھی رک کر سوچ ہی لیتی۔ لیکن اس کی عمر کا تھا تا تو ہر بات پر بیٹا قہقہے لگاتا تھا۔

اور اپنی ضد پوری نہ ہونے پر رو دیتا۔

یوں بھی اگلیوں بیگی کے مزاج میں یہ چیزیں در آنا فطری تھا۔

فریاد اپنی آنکھوں میں مسکراتی شرخ رنگوں کی طرح نظروں میں کھب جانے والی بیٹا کا کلس دیکھتا رہا۔ پھر فوراً اس نے آنکھیں بند کر لیں جیسے یہ عکس آنکھوں کے زندان میں قید کر لیتا چاہتا ہو۔

بیچاری کے احساس سے اس نے جلدی آنکھیں کھول لیں۔ وہ جان چکا تھا کہ بیٹا اس کے لیے ایک رنگین اور حسین عکس کے سوا کچھ نہیں۔ گل پاتو بھی اس کے لیے ایسا ہی عکس تھی۔ اور شاید وقت نے اس عکس کی رنگین بات کر دی تھی۔ اسی لیے نئی خوش رنگ اور چنگلی تصویر اس چو سکتے میں فٹ بیٹھ گئی تھی۔

فریاد کو تمام عمران سکسوں ہی سے دل بہلاتا تھا۔

وہ پھر بیڑ پر آکر لیٹ گیا۔ روشنیوں گل کریں۔ ہر چیز کو تاریکی میں لگ گئی۔ بند قبر کا اندھیرا کرے میں پھیل گیا۔

فریاد کھینچے میں مندرے کر سناؤں کے حلقے میں رکتے ہوئے بیڑ پر اونٹھا پڑ گیا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ لیکن ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

اپنی شکست اس نے چپ چاپ قبول کر لی تھی۔ کوئی احتجاج نہیں کر سکتا تھا۔ واویلے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ ساری عمر ہی اس نے حالت جنگ میں گزاری تھی۔ اپنے آپ سے لڑتے ہوئے۔ یہ جنگ فتح و شکست کے لمحوں سے شاید بھی دو چار نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن اب اس نے اس جنگ کو شکست تسلیم کر لیا تھا۔

بیٹا کو پانے کا اسے کوئی حق نہ تھا۔ عمروں کے فاصلے حاکم تھے۔ وہ اچھی صحت اچھی شخصیت اور اچھے حالات کے باوجود بیٹا سے مجتنب جیسی مسالوں کے فاصلے پر تھا۔ جہاں سے اسے پانا تو محنت تھی ہی آواز دیا بھی ممکنہ خیر تھا۔

اپنی انا کے معاملے میں وہ پہلے کون سا خود دار نہ تھا۔ انا کی تشہیر و تذلیل اسے گوارا نہ تھی۔ اس کے سینے میں جذبات نے بیٹا کو گل پاتو سمجھ کر سر اٹھایا تھا۔ ان کو سینے ہی میں موت کی نیند سلا دینے میں مصیبت تھی۔ بعض اوقات ہم بڑی بڑی سوچ بڑی سمجھ بڑی سوچ بڑی سمجھ کے بعد شطرنج کی بازی ہار جیتے ہیں۔ پورے وقت اور احتیاط سے مہو ایسے خانے میں رکتے ہیں۔ جہاں سے کامیابی یقینی ہو جاتی ہے لیکن جب چال چل چکے ہیں۔ تو معا احساس ہوتا ہے۔ کہ ہم نے تو بالکل غلط رخ پہ مہور رکھ دیا تھا۔ یوں کھیل کا پانسہ ہی بدل جاتا ہے۔

اور جیت۔

بار میں بدل جاتی ہے۔

بغیر نہ رہ سکا۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ بچیاں بھی کتنی پیاری اور پاکیزہ سی پڑھتی ہیں۔ جو کچھ زبان سے نہیں کہہ سکتیں بچوں کے چہکاوے سے کہہ جاتی ہیں۔

”بالک۔“ شیر اندر آتے ہوئے بولا۔ آصف کا سلسلہ خیال اوجھڑ گیا۔
”کیوں“

”صاحب ابھی تک سو رہے ہیں۔“

”ہائے اللہ۔“ ٹینا نے سامنے دیوار پر لگے گلاب پر نگاہ ڈالی۔ ”دس بجتے والے ہیں انکل ابھی تک سو رہے ہیں۔“

”دوڑ بھاگ بھی تو اس نے بہت کی۔ انکل لے اچھی طرح سے نیند۔“ آصف نے پلیٹ اور کانا پیسے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ”شروع کرو ناشتہ۔“

ٹینا نے ٹاؤک سی بورس کوری میں دلیہ ڈالتے ہوئے بشرے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ جب صاحب انھیں کے توان کے لیے تازہ ناشتہ تیار کروا دیتا۔“

”بہتر صاحب۔“ بشر اُکڑے سے نکل گیا۔

باپ بیٹی اطمینان سے ناشتہ کرنے لگے۔

”ابو آپ دلیہ نہیں لیں گے۔“ ٹینا نے پالہ کی طرف بڑھایا۔ ”نہیں بیٹے۔ میں صرف ایک ٹوسٹ اور اینڈرل اؤں گا۔“ آصف نے ہاتھ کے اشارے سے دلیہ واپس رکھنے کو کہا۔

”کیوں ابو رات کھانا زیادہ کھایا تھا۔“ ٹینا نہیں۔

”کچھ بھی بات ہے۔“

”دلیہ بہت ہی ٹیسی تھا کھانا۔“

”فرجانیے سب کچھ اپنی گھرالی میں تیار کر دیا تھا۔“

”بھئی انکل بہت اچھے ہیں ابو۔“

”ہاں بیٹی۔ بہت اچھا ہے وہ۔“

”ابو۔“ مجھے سب دوست چھیڑ رہے تھے۔ کہ ساگر وہ پارٹی اتنی شاندار ہے۔ شادی کی دعوت تو جانے کسی ہوگی۔“

آصف مسکراتے ہوئے ٹوسٹ چھری سے کاٹ کر بولا۔ ”مجھے کرنا پڑی تو ایسی توقع نہ رکھیں تمہارے دوست۔ ہاں فرجانیے کی تو بلاشہر ایسا نکشن کبھی کسی نے دیکھا نہ سنا ہوگا۔“

”انکل کا آغا بڑا دل ہے۔“

ٹینا نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ تو آصف مسکراتے لگا۔

”جب سے انکل آئے ہیں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے حلی میں ہمارا آگئی ہے۔ جی ابو۔ پہلے تو

نکشن رات ڈیڑھ بجے ختم ہوا تھا۔ مگر آتے آتے دو بج گئے یوں رات سب ہی دیر سے سوئے اور دن چڑے تک سوئے رہنا ضروری تھا۔ سات ساتوے سات تک تو حلی پر غفلت چھائی تھی۔ صرف نمازی لوگ وقت پر اٹھے تھے۔ اور نماز پڑھ کر اوجھڑی نیند کو مکمل کرنے پھر لیٹ گئے تھے۔ ٹینا بھی نو بجے تک پڑی سوئی رہی۔ ابو کچھ ہی دیر پہلے جاگے تھے۔ ٹائٹ کی میز پر دونوں بیٹھے رات کے نکشن کی کامیابی کی باتیں کرتے ہوئے فرجاد کا انتظار کر رہے تھے۔

بشر انہیں ناشتے کے لیے بلائے گیا تھا۔

میز پر ناشتہ لگا ہوا تھا۔ دلیہ ٹوسٹ کھن اڑے اور فراخی مغز کے علاوہ بھل بھی تھے اور چائے بھی تیار پڑی تھی۔ چینی کے ٹاؤک اور خوبصورت برتن چمک رہے تھے۔ چاندی کے چھری کاٹنے اور چمچ بھی ترتیب سے رکھے تھے۔ سفید بے داغ پنک کواٹر ہیلڈن کے قریب رکھے ہوئے تھے۔

”ابو۔“ ٹینا نے پنک اٹھا لے ہوئے پاؤں کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔

”آپ رات لطیف صاحب سے ملے تھے۔“ آصف نے مسکراہٹ دیا تے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”اور ان کی حکیم؟“

”بہت اچھی خاتون ہیں۔“

”ان سے تو آپ پہلی بار ملے ہوں گے۔“

”ہاں لطیف سے تو جان پہچان ہے۔ حکیم لطیف سے رات ہی ملا۔“

”کتنی پیاری سی خاتون ہیں۔ ہیں نا ابو۔“

”ہاں بیٹی ہاں۔“ آصف نے مسکرا کر خوش کن لہجے میں کہا۔

”مجھے بہت پیار کرتی ہیں وہ ٹینا قدرے جھینپے ہوئے مسکرائی۔

”ٹھیک ہے۔“ آصف نے سنجیدگی سے کہا۔

ٹینا کی خوبصورت آنکھوں پر بچوں کی چٹن اٹنے ہمارے انداز سے گری۔ کہ آصف مسکراتے

”ہاں“

”ٹینا نے تازہ چائے بنا کر ان کے سامنے رکھ دی۔ وہ گھونٹ گھونٹ چائے قلع میں اتار آ رہا۔ اور ٹینا سوٹ پر کھن گائے ہوئے چائے میں خوش رنگ خواب دیکھنے لگی۔
 بشیرا اخبار آیا۔ آصف چائے پی چکا تھا۔ ٹینا بھی ناشتہ ختم کر چکی تھی۔ آصف نے اخبار لیا اور اٹھنے ہوئے بولا۔ ”رات کی ٹکان اب بھی محسوس ہو رہی ہے۔ میں ادھر لیٹ کر اخبار دیکھوں گا۔ آج کوئی کام نہیں کرنا میں نے۔“

”میں تو بالکل بھی نہیں تھکی۔“ ٹینا حشرم لیے میں بولی۔ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنے کھلے بالوں کو جوڑے کی صورت سمیٹتے ہوئے ابو کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکلی۔
 ”وہ لوگ اسی ہفتے آئیں گے۔“ آصف نے ٹینا سے کہا۔
 ”کون لوگ۔“ ٹینا بے خیالی میں بولی۔

”لطیف صاحب اور ان کی بیگم۔“ آصف نے معنی خیز انداز میں بیٹی کو دیکھا۔ ٹینا کے چہرے پر رنگدور کے سامنے لہرا گئے۔ وہ چیخے سے مسکرائے گئی۔
 آصف کمرے میں چلا گیا۔

اور

وہ اپنے تحائف دیکھنے کے لیے اپنے کمرے میں آگئی۔ تحائف کا انبار تھا۔ وہ قالین پر ہی بیٹھ گئی۔ نفی۔ راشو۔ اعظم اور توری بھی اس کے کمرے میں آئے دھکے۔ ہر شخصہ اور اس کے ساتھ نام و پیغام کی جٹ دیکھ دیکھ سب معظوظ ہوئے رہے۔
 ”خفے تو خبر جو تھے سوتے۔ رنگہ رنگ خبریں دلچسپ تھیں۔ ٹینا کے پورے گرد پنے جو جو جھلے خبر کر کے تھے۔ سب بڑھ بڑھ کر بھٹنے رہے۔ کمرے میں چیزوں کا ڈھیر لگ گیا۔ اور لال بزرگ لڈی کاغذ ادھر ادھر بکھر گئے۔ گولے کے ٹکڑے بھی جا بجا نظر آنے لگے۔

میرا گھر بی بی نہ لگتا تھا۔ انکل تو بالکل دوستوں کی طرح ہیں۔ کبھی کبھی تو بالکل بچوں کی طرح کھیلتے ہیں میرے ساتھ۔“

”چلو بھئی اچھی بات ہے۔ ہماری بیبا رانی کی پوریت تو دور ہو گئی۔ انکل کے آنے سے۔“
 ”جی ہاں۔ آپ دیکھتے ہی نہیں میں کتنی خوش رہنے لگی ہوں اب۔“
 ”جی ہاں جی ہاں۔ ہر بات زمان سے نکلتے ہی پوری ہو جاتی ہے۔“
 ”آپ کو برا لگتا ہے۔“

آصف اس کے معصوم سے سوال پر کھکھلا کر ہنس پڑا۔
 ”چلو بڑے خوف لڑکی۔ چائے بناؤ ہمارے لیے۔ وہ چپکان سے منہ صاف کرتے ہوئے بولا۔
 ٹینا نے چائے بنائی اور آٹھلے سے ابو کے سامنے رکھ دی۔ پھر اپنی بیانی میں دودھ ڈالا۔ اور چند قطرے قوے کے ڈال کر چینی ملائے تھی۔
 ”رات برسے برسے آشکاف ہوئے۔ آصف نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے ٹینا کو مسکرا کر دیکھا۔

”کیسے۔“ وہ روک کر باپ کو دیکھنے لگی۔

”یہ جو لطیف صاحب ہیں نا۔“

”ہاں۔“

”ان کے والد اور فرجاد کے ابا گھرے دوست تھے۔“

”واقعہ۔“

”ہاں۔“

”بڑا آنا بٹانا ملنا تھا ان لوگوں کا آپس میں۔“

”اچھا۔“

”لیکن عالی نور محمد کے حادثے کے بعد لطیف کے والد کا بھی انتقال ہو گیا۔ لطیف اور فرجاد ان دنوں بہت چھوٹے تھے۔ اس لیے دوستی کا سلسلہ بروں کے مرنے کے بعد منقطع ہو گیا۔ کبھی کبھار رسی کی ملاقات ہوتی رہی۔ وہ بھی میری۔ جب لطیف کی یہاں پوشنگ ہوئی۔ ساری باتیں تو رات پتہ چلیں۔ دونوں گھرانوں کے لکھنے گھرے اور دوستانہ مراسم تھے۔“

”اللہ ستنی عجیب۔۔۔ ہے۔“

”وہ لوگ اب خجید کرنا چاہتے ہیں۔ شاید۔“

آصف نے پیار سے ٹینا کو غوردار۔ لیکن مسکراہٹ لبوں سے پھسل رہی تھی۔ ٹینا شرمیلی مسکراہٹ سے بولی۔ ”اور چائے بناؤں ابو۔“

”کیوں۔“ فرجاد نے سرگرمی کی راگ بھاد کر اسے دیکھا۔
 ”پھر مجھے گل بانو کہا۔“ وہ شامی بچے میں بولی۔
 ”تم گل بانو ہی تو ہو۔“ اس نے پورے اطمینان سے اسے دیکھا۔
 ”نہیں۔“ وہ جھلائی۔
 ”نہ سہی۔“ وہ مسکرایا۔
 ”بس آپ مجھے ٹینا ہی کہا کریں۔“
 ”کیا فرق پڑتا ہے۔“
 ”کیوں نہیں پڑتا۔“
 ”تم پہلے گل بانو تھیں اب ٹینا بن گئی ہو۔“
 ”یہ کیا بات ہوئی۔“

”سچ کہتا ہوں۔ گل بانو ٹینا ہے اور ٹینا گل بانو۔“

فرجاد نے سرخ انگارہ سی آنکھوں سے ٹینا کو دیکھا۔ پھر وحشی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ گئی۔

ٹینا ڈر سی گئی۔ فرجاد کو کیا ہو رہا تھا۔ وہ بالکل نہ سمجھ پائی۔ چند لمحوں پہ چپ رہی۔ پھر بڑی ادھر روی اور ملا مت سے بولی۔ ”انگل آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“

”بہکی بہکی؟“ وہ آہ بھرے ہوئے بولا۔

”ہاں۔“ خوف زدہ خوبصورت آنکھیں بھی کسی قیامت سے کم نہیں ہوتیں۔ ”بعض لوگ پیدا ہی اس لیے ہوتے ہیں۔ کہ ساری عمر بہکی باتیں کر رہے ہوں۔ میں بھی ان بد نصیبوں میں سے ایک ہوں۔“

”انگل۔“ ٹینا غبرا کر جیسے رو دینے کو تھی۔ ”آج آپ کو کیا ہو گیا ہے۔“ کچھ نہیں۔

”چائے پی لیں اور بنا دوں۔ تو نصیحتی ہو گئی ہے۔“

وہ کچھ نہیں بولا۔ انگلیوں میں سرگرمی سلگتا رہا اور وہ کرسی کی پشت سے سرنگام آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔

ٹینا اس کی خرابی طبع سے خاصی تفرق نظر آئے لگی۔ اس نے چائے ٹرائی کے پتلے خانے میں رکھے خالی پیالے میں ایڑ بلی۔ اور پھر تازہ چائے بنا کر فرجاد کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

”انگل۔ چائے لے لیں۔“

”انگل۔ انگل۔“ فرجاد لولہ لمان آنکھیں کھولتے ہوئے بڑبڑایا۔

”جی۔“ ٹینا سہم گئی۔

”ہائے انگل آپ اب ناشتہ کر رہے ہیں۔“

”پینہ ہے کیا بچا ہے۔“

”گیارہ بج چکے ہیں۔“

”انگل آپ کی آنکھیں تو اب بھی اتنی سرخ ہو رہی ہیں۔ بہت زیادہ تھکے ہوئے لگتے ہیں۔“ ٹینا سیاہی مائل جو گیارہ رنگ کے پتکے جھلکے پڑے پتے بالوں کی ادھ کلی شیا کو انگلی پر لپٹتی اس چھوٹی سی بالکونی میں آئی۔ تو فرجاد بیرون دہشت کے گدوں والی سفید کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ٹرائی میں ناشتہ چھا تھا۔ سرگرمی کی ذبیہ اور لائٹریٹری ٹرائی کے ایک کونے میں رکھے تھے۔ برابر پڑی چھوٹی سی چاندی کی المیز ٹرے میں کئی سگریٹوں کے گل بھڑائے گئے تھے۔ اور آخری نئے نئے کلوے پھینکے ہوئے تھے۔ اب بھی اس کی انگلیوں میں سرگرمی تھا۔ اور پیالی میں چائے بنی تھی۔ جس میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔

یہ بالکونی بھی موسمی نشست گاہ تھی۔ مین پر دے دروں میں لٹک رہے تھے۔ دیدہ زیب رنگ کا قالین چھا تھا۔ اور خوبصورت کرسیاں اور میز رکھے تھے۔ سوکھی ڈالیوں پر خوش رنگ پلاسٹک کے پھولوں کی سجاوٹ سے بالکونی کے کونے آراستہ تھے۔ دائیں ہاتھ کے در سے سرمبز بنیلیں اندر کو آگئی تھیں۔ جو کتاہوں کو حسین لگی تھیں۔

ٹینا فرجاد کو بیٹھے دیکھ کر ادھر آگئی تھی۔ باتوں سی تو تھی۔ کتنی ہی باتیں آپوں آپ کر گئی جواب سوائے خاموشی اور تھکی ہوئی نظروں کے کچھ نہ ملا۔

وہ مگھوم کر فرجاد کے سامنے والی کرسی پر آ بیٹھی۔ فرجاد کی طرف دیکھا۔ وہ شاید تھوڑی دیر پہلے ہی سو کر اٹھا تھا۔ شب خوابی کے لباس میں تھا۔ بیلا وھارہ اور گاؤں اس نے پس رکھا تھا۔

”انگل لگتا ہے آپ بہت تھک گئے ہیں وہ غور سے اسے دیکھ کر بولی ”ہاں۔ میں بہت ہو گیا ہوں گل بانو۔“ فرجاد کے منہ سے لاشعوری طور پر نکل گیا۔

”انگل۔“ وہ تیز آواز میں بولی۔

وہ اسے دیکھتے دیکھتے مسکرا دیا۔

”یہاں کو کچھ حوصلہ سا ہوا۔ اپنے آپ کو نارل کرتے ہوئے بولی۔ ”انکل کہنا آپ کو برا لگتا ہے۔
”انکل۔“

وہ چپ رہا۔

”آپ میرے انکل نہیں ہیں؟“ وہ دیکھا نہ جرح کے موڈ میں آگئی۔

”اُوہ فرجاد سہاں۔“ فرجاد نے اس کی طرف دیکھے ہاتھ پائی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”تم پہلے گل لال تھے۔ اب انکل ہو۔ ہونہ۔ کیوں اچھے ہو کیوں اچھے اٹھاتے ہو۔“

”ہائے اللہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے تو سمجھ نہیں آ رہیں۔ انکل میں رو دوں گی۔ آپ کی طبیعت بہت خراب معلوم ہوتی ہے۔“

وہ سنبھلا۔ اور پھر ہنس پڑا۔

”یہاں۔ اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”جی۔“ وہ خوش ہو گئی۔

”تم اپنی ماں کی ڈوڈی کیلے کا پائی ہو۔“

”مجھے پتہ ہے۔“

”پھر میں تمہیں گل پانوکہ دوں تو کیا فرق پڑتا ہے۔“

”لیکن آپ مجھے گل پانوکہ ہی کیوں۔“

اور پھر جیسے اسے کوئی شرارت سوچھی۔ اس کی آنکھوں میں شرعی خوشی ڈول گئی۔ ہونٹوں پر بھی شرم جھم گیا۔ قدرے آگے کو کھینچے ہوئے بولی۔

”ایک بات پوچھوں انکل۔“

”ہوں۔“

”جج جج بتائیں گے۔“

”ہاں۔“

”پائل جج۔“

”جی۔“

”ہاں۔“

”انکل۔“

”ہاں۔“

”آپ کا امی سے کوئی آفیر تو نہیں تھا۔“

وہ یہ بات کہتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور پھر ہنسی جلی گئی۔ فرجاد نے بھی موقع کی نزاکت سے ہنسی میں شریک ہو کر اتنی اہم اور سنجیدہ بات کو ہنسی میں اڑا دیا۔

دونوں ہنستے رہے۔ چپ ہوئے اور پھر ہنس دیتے۔

”ہے کچھ وال میں کالا۔“ یہاں نے کئی لمبے لمبے بحر پور قہقہوں کے بعد آنکھوں میں آجائے والے پانی کو دھوئے کے سرے سے پونچھے ہوئے کہا۔

”یہاں۔“ فرجاد ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس کی آواز کی دھمک یہاں نے اپنے دل پر محسوس کی۔ وہ اب ہنس نہ سکی۔ فرجاد کے چہرے پر پتھر جی سنجیدگی تھی۔ وہ چپ ہو گئی۔

فرجاد نے چائے کی پیالی ابوں سے لگا لی۔ اور جب خالی پیالی واپس رکھی تو یہاں نے موضوع بدلنے کی غرض سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”اور پتاؤں۔“

”ہاؤ۔“

”ٹوٹ پر کھن بھی لگا دوں۔“

”لگاؤ۔“

”ایڑا فھڑا ہو گیا ہے اور لے آؤں۔“

”نہیں۔ چائے پتاؤ۔ اور ٹوٹ دے دو۔“

یہاں یہاں نے انداز میں حکم کی قبول کرنے لگی۔ فرجاد کی باتوں سے سہی جاری تھی۔ اتنے مینے اس کا ساتھ دیا تھا۔ لیکن یہ تبدیلی آج ہی دیکھی تھی۔ بیٹھ بیٹھ ہنسنے ہنسانے اور گفتگو لینے میں ملاحت سے باتیں کرنے والا فرجاد جانے کس انداز میں باتیں کر رہا تھا۔

یہاں اس کے سامنے رکھ کر اس نے خاموشی سے ٹوشٹوں پر کھن لگایا اور پلیٹ خاموشی سے اس کے سامنے رکھ دی۔

فرجاد نے چھری سے ٹوٹ کاٹا۔

یہاں اچھ کھن ہوئی۔

فرجاد کا ہاتھ دیں رک گیا اس نے یہاں کو دیکھا اور پوچھا۔ ”جاری ہو۔“

”جی۔“

”چھوگی نہیں۔“

”کر کے میں سارے پریڈنٹ بکھرے پڑے ہیں۔ انہیں۔“

”چھو۔“

وہ بیٹھ گئی۔ فرجاد چھری اور کاٹنے سے ٹوٹ کھانے لگا۔ وہ اپنے لمبے پالش شدہ ٹو بھورت ناخنوں کو دیکھنے لگی۔ نئی لمبوں کے وقفے کے بعد فرجاد نے اچانک سوال کیا۔ ”یہ ناخن کون تمہارے ساتھ وہ نوجوان کون تھا؟“

”جی کون؟“ ”یہ شاید اس کا اشارہ نہ سمجھ پائی۔“

”جس کے ساتھ تم باہر حوض کی منڈیر پر بیٹھی تھیں۔“ وہ ساٹ لمبے میں بولا۔

”اوہ۔“ ”یہ سارخ ہو گئی۔“

”کون تھا وہ۔“ فرجاد پتھر پلے لمبے میں بولا۔

”وہ۔ ارشی تھا انکل۔“ وہ شوخ ادائی سے بولی۔ اس کے چہرے پر قوس قزح کے رنگ بکھر گئے۔

”ارشی کون ہے۔“ فرجاد نے تفصیل چاہی تو وہ کرسی سے یک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ منہ ذرا سا کھولا۔ آنکھوں میں چمک خیرہ کن ہو گئی۔ فرجاد کی مستفادہ نگاہوں میں اپنی شوخ نگاہیں ملاتے ہوئے ہنس۔ ”ابو کو پتہ ہے انکل۔“

فرجاد کے کچھ اور کسنے سے پہلے ہی وہ وہاں سے بھاگ گئی۔

اور

فرجاد نے ہاتھ میں پکڑی پیالی فرش پر دے ماری۔

کیوں

خدا جانے کیوں؟

اس کیوں؟ کو صرف آصف ہی سمجھ سکا۔ جو برابر والے کمرے میں عین اس کھڑکی کے برابر پڑے پلنگ پر لیٹا اخبار دیکھ رہا تھا۔

اور

جو فرجاد کی گفتگو اپنے جواری بھائی اتار چڑھاؤ سمیت سن رہا تھا۔ اب تک اس کے ذہن میں جو محض مفروضہ تھا۔ حقیقت بن کر سامنے آ گیا تھا اخبار اس کے ہاتھوں سے گر گیا۔ اور وہ بیدم سا ہو کر پڑ گیا۔ اس کی ذہنی صلاحیتیں جیسے مناویں ہو گئیں۔

”ای۔“

”جی بچے۔“

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

”دیا تو ہے۔“

”نہیں۔ دیا۔“

”بہن کیوں نہیں دیا۔ تم نے یہی تو پوچھا ہے یہاں کیسی ہے۔ میں نے کہا نہیں کہ بہت پیاری بچی ہے۔ ہزاروں لاکھوں میں ایک۔ صرف خوبصورت ہی نہیں۔ مزاج بھی بہت نکلتا ہے۔“

”بس۔“

”تو اور۔“

”اس سے آگے کچھ نہ کہیں گی۔“

”جیل ہٹ۔“

”نہیں ای۔“

”ارشی بیٹھے اٹھنے دو۔ بہت سے کام کر رہی ہیں ابھی۔“

”سب سے بڑا کام تو یہی ہے جس کے لیے میں نے آپ کو بٹھا رکھا ہے۔“

”تو جو کچھ چاہتا ہے نا۔“

”ہاں۔ آپ کو سب معلوم ہے؟“

”معلوم ہے۔“

”ڈیڈی کو بھی۔“

”ہاں ڈیڈی کو بھی؟“

”تو پھر؟“

”دیکھو بیٹے۔“

”جی فرمائیے۔“

ارشی صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی گول مثل سرخ و سپید پیاری سی ای اس کے

قریب ہی بیٹھی تھیں۔ گفتگو ان کے مزاج کا نمایاں عنصر تھی۔ لیکن نگاہوں میں دادرسی بھی تھی۔ ارشی ان کا بڑا بیٹا تھا۔ پانچ بچوں میں بڑا ہونے کے ناطے گھریں اس کی حکمرانی بھی چلتی تھی۔ خدہ کبھی نہ کی تھی۔ لیکن بچہ رہی اپنی ہر بات اسی اور ڈیڑی سے منوالہ کرنا تھا۔

یہ گھرانہ اونچے متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ جسے محدود آمدنی میں ظاہر داری کا بھرم بھی رکھنا پڑتا ہے۔ جو ذہنی طور پر اونچے طبقے سے کسی طرح کم نہیں ہو سکتا۔ اور نظریات پورڈ والی ہوتے ہیں۔ لیکن مالی لحاظ سے اس طبقے تک پہنچ نہیں پاتا۔ یوں متوسط اور اونچے طبقے کے درمیان غلام میں مطلق یہ طبقہ قابل رحم ہے۔ اونچے طبقے میں مل جانے کے لیے یہ طبقہ مسلسل ازایں کرتا ہے۔ پر دیا زود جب تک ساتھ دیتے ہیں اس کی کوشش پرواز جاری رہتی ہے۔ قسمت ساتھ دے۔ تو اونچے طبقے میں شامل بھی ہو جاتا ہے۔ اور اگر نصیب سوئے ہوں۔ تو پورا زود ٹوٹ جاتے ہیں اور در اوئے منہ مگر تاپے۔ یہ ذہنی شکست بعض اوقات اسے پاگل بھی بنا دیتی ہے اور وہ اس جنون کا پاگل بنے میں وہ وہ باتیں کر گزرتا ہے۔ جس کی علاج اجازت دیتا ہے نہ قانون اور نہ ہی مذہب روا رکھتا ہے۔

اس طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد اگر خوشمد ہیں۔ اپنی ذہنی بلوغت کو پہنچے ہوئے ہیں۔ حقیقت پسند اور قناعت کو اپنائے ہوئے ہیں۔ تو پھر وہ حال مست رہتے ہیں۔ سفید پوشی کا بھرم مچھاتے ہوئے وہ اونچے طبقے کے ساتھ چلتے ہیں۔ لیکن اس حد تک کہ سفید پوشی کا بھرم نہ ٹوٹے۔ جہاں یہ بھرم ٹوٹے گا امکان ہوا۔ ان کی خوشنمائی نے انہیں فوراً آگاہ کر دیا۔ اور وہ قانع ہو کر بیٹھ گئے۔

ارشئی کے گھرانے کا تعلیمی اسی طبقے سے تھا۔ جو اونچے لوگوں سے ملے بیٹے۔ ان کی طرح سوچنے اور زندگی گزارنے کا بے شک خواہاں تھا۔ لیکن قدم اسی حد تک بڑھاتا تھا۔ جس حد تک سکتا تھی۔ سیکائی کے اس دور میں لطیف صاحب کی تنخواہ بے شک خوشحالی کی ضامن نہ تھی۔ پھر بھی صبر و قناعت نے ان لوگوں کو ذہنی اور روحانی خوشیوں سے مالا مال کر رکھا تھا۔ بیستایہ بیٹا یہ گھرانہ پانچ بچوں اور میاں بیوی پر مشتمل تھا۔

لطیف صاحب بڑے کم گو انسان تھے۔ انکھوں میں ذہانت اور سوچ ہمیشہ بھری رہتی۔ یہ بات ان کے پیشے کی منتقاضی تھی۔ اماندار آدمی تھے۔ چاہتے تو ورکشاپ لے کر لاکھوں کروڑوں بنا لیتے۔ لیکن ایسا انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

ارشئی بھی صابر و شاکر طبیعت رکھتا تھا۔ نئے آسمانوں کی تلاش و جستجو اسے بھی رہتی تھی۔ اپنے بال و پر پر بھروسہ کیے تھا۔ تو کسی کی تلاش میں سرگردانی رہتی تھی۔ لیکن رشتہ یا سفارش کے بغیر ہی اپنی قابلیت کے سمارے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ گو یہ بات زمانے کے تیوہوں سے صرف مشکل ہی

نہیں ناممکن بھی تھی۔

بیٹا سے ملاقات چند برس پہلے عمران کے ہاں ہوئی تھی۔ پہلی ملاقات میں وہ اس کے پرسوں حسن سے مرعوب ہوا تھا۔ وہ اسے اپنے سے بہت اونچی شے لگی تھی۔ اس لیے اس نے محبت کا خیال بھی کرنے کی جرأت نہ کی تھی۔ لیکن چند ملاقاتیں مختلف کی حدود کو توڑ گئیں۔ وہ اس کے قریب ہوا۔ تو اچھی طرح سمجھنے کا موقع بھی ملا۔ اس کا ذہن بیٹا سے صرف دوستی کی حد تک راضی ہوا۔ لیکن یہ دوستی جانے کس طرح اپنی جڑیں پیچھے پیچھے ہی پھیلائی گئی۔ جب اس نے رک کر سوچا تو وہ محبت تو کیا عشق کی حدود بھی پھیلا گئے پکا تھا۔

لیکن۔

اس کی محبت!

زندگی کی طرح تھی۔

زندگی بھی تو اک ڈر۔ ایک خدشے اور مسلسل خوف کا نام ہے۔ ہم ہر لمحہ اس ڈر خدشے اور خوف کو محسوس کرتے ہیں۔ کسی ان کی کئی لمحے بھی تو زندگی اپنے آپ کو موت کے حوالے کر سکتی ہے۔

بیٹا محبت میں ثابت قدم تھی۔ اسے کبھی مایوسی نے نہیں گھیرا تھا۔ کبھی بایست نہیں ہوئی تھی۔ باپ کی اکوٹی بھی تھی۔ ہر چیز جو اس نے چاہی اسے مل گئی۔ پھر ارشی کو چاہ کر نہ پانے کی تک ہی کیا تھی۔ اس نے کبھی ان کی غلطی پر سوچا بھی نہیں تھا۔ مصفاغابی والی شرع و خشک ندی کی طرح اپنے راستے کا تعین کر کے روانی سے بے جا رہا تھی۔

ارشئی کا صبر کا بھی دور ہو گیا۔ بیٹا نے جس دن اسے اپنی ساری کماٹی خاندانی پس منظر کے ساتھ سنا ڈالی۔

حوالی اس کے ٹھانڈے ہاتھ دھن دھن دل لٹن میں سب فرجاد کے تھے اس کے ابو تو صرف امین تھے۔ ان کے پاس تو صرف اہل کی رعایت کی ہوئی تھوڑی سی راضی تھی۔ یا وہ تنخواہ مقرر ہو جو فرجاد کے یہاں ہوتے ہوئے بھی اخراجات کے لیے لیا کرتے تھے۔

خوبی کی شان و شوکت بیٹا کے پس منظر سے بنیادی جانے۔ تو پھر اس میں اور ارشی میں دوری یا اونچ نیچ تو رہی نہ جاتی تھی۔ دونوں ایک ہی سماجی سطح پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس انکشاف نے ارشی کی محبت کے بھندھن اٹھ کر دیے تھے۔ اب اسے محمودی کا ڈر تھا نہ

پاکای کا خوف۔ دونوں منازل عشق پہنچے مسکراتے ملے کر گئے تھے۔ لیکن بیٹا نے اسے ہمیشہ فرجاد کے اچانک آجانے سے بیٹا پر پیسے خزانے کے منہ کھل گئے تھے۔ لیکن بیٹا نے اسے ہمیشہ ارشی کے حوالے ہی سے اہمیت دی تھی۔ یہ سب چیزیں ثانوی تھیں۔ ارشی کا اپنا مقام تھا۔ یہ مقام

”بعد کی باتیں پھوڑیں ای۔ اس کے ذمہ دار میں اور بیٹا ہیں۔ آپ صرف یہ رمی کارروائی کر دیں اور بس۔“

”ڈیڈی سے کہو۔“

”اول ہوں۔“

”کیوں۔“

”ڈیڈی سے ڈر لگتا ہے۔“

”آپ تو میری دوست ہیں ای۔“

ارشی نے چار سے ماں کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔ اسی نے مسکرا کر بیٹے کی پیشانی چوم لی۔ پھر کشتی ہی دیر تک دونوں اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ ماں نے سنجیدگی سے ہر پہلو اس کے سامنے رکھا۔ اس نے بھی سنجیدگی سے جواب دیے۔ ماں بیٹا متعلق ہو رہی گئیں۔

”اتوار ٹھیک رہے گا۔“ ارشی نے دن کا تعین کیا۔

”ہاں میرے خیال میں ٹھیک ہی ہے۔ ویسے تمہارے ڈیڈی سے بھی پوچھ لوں۔“

”آپ سارا کچھ آپ ہی نے کرنا ہے ای۔“

”تک نہ کرو۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”روزہ پادای۔“

ارشی نے دونوں بازو بلند کرتے ہوئے خوشی سے نعرہ سالگایا۔ پھر ماں کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔

”مطلبی کہیں کا۔“ اسی ہنسنے لگیں۔

ماں بیٹا خوشیوں سے سرشار ہو رہے تھے۔

زمین کے سینے میں خور کی طرح گڑا ہوا تھا۔ اگر فرجاد کی طرف سے مراعات مل رہی تھیں۔ تو بیٹا کی خوشی حق بجانب تھی۔ شادی کے بعد اک پر فقیہ زندگی کا تصور ہر نوجوان لڑکی کی طرح اس کے ذہن میں بھی تھا۔ ارشی کو وہ اپنی ذات سے الگ تھوڑا سی سمجھتی تھی۔ فرجاد کی دولت اگر آج اس کے لیے تھی۔ تو کل ارشی بھی اس سے مستفید ہو گا۔ بیٹا کے لیے یہ بات تسکین دہ تھی۔ اور اس بات کا تذکرہ وہ اپنی سیلیوں دوستوں اور ارشی سے بار بار کر چکی تھی۔

ارشی کو ان ساری باتوں سے جیسے کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ اس کا سینہ محبت کی تکیوں سے پر نور تھا۔ محبت کو ضروریات سے الگ بے شک نہیں کیا جاسکتا۔ اور وہ اتنا کم فہم بھی نہیں تھا۔ اس لیے نوکری کے لیے تک دو کر رہا تھا۔

اور آپ جبکہ اس نے بیٹا کے کتنے پر عام کامازمت قبول کر لی تھی باؤں کا لڑکا آگے بڑھنے کی سوچنا مشکل نہیں ہو تا۔ اسے چاہیے ہی گئی تھی۔ اس کی قابلیت سوچ اور ذہن کے مطابق نہ تھی۔ بہر حال کام تو تھا۔

اپنا انٹرنٹ لیزر بھی نہیں آیا تھا۔ لیکن ملازمت کا وعدہ ہو چکا تھا۔ چند دنوں میں اسے اطلاع ملنے والی تھی۔

اسی لیے آج وہ اپنی ای کے کاتوں میں اپنی ترنا گھول رہا تھا۔ اسی اس کے جذبات سے بے خبر نہ تھیں۔ اور بیٹا بھی انہیں دل سے اچھی لگتی تھی۔ اس خاندان سے تجدید مراسم کا بھی خیال تھا۔ لیکن برتھ ڈے پر بیٹا کی آن بان دیکھ کر وہ ٹھہر کر سوچنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔

ارشی چاہتا تھا۔ اسی اور ڈیڈی بیٹا کے ابو سے جلد سے جلد مل کر رشتہ طلب کریں۔ بہت سے بخاری لوگ اس رشتے کی آس لگائے ہوئے تھے۔ بیٹا کے ابو تک ارشی کا سوال جلد پچھتا چکا ہے۔ تھا۔ گو بیٹا نے رشتے کی کامیابی کا سو فیصد یقین دلایا تھا۔ پھر بھی ارشی رمی کارروائی کے لیے بے تاب تھا۔

”ہاں تو فرمائیے ای۔“ ارشی نے ماں کی طرف مسکرا کر دیکھا ”کیا کہنا چاہ رہی تھیں آپ۔“

”کہنا کیا ہے بیٹے۔ سوچ لو اچھی طرح۔ یہ نہ ہو رشتہ مانگنے جائیں اور کرکری ہو جائے۔“

”کرکری کیوں ہو جائے۔“

”برتھ ڈے پر بیٹا کی سب دیکھی تھی۔“

”ادہ ای۔ آپ کو میں نے بتا تو دیا ہے کہ یہ سب فرجاد انگلی کی مرمانی ہے۔ بیٹا کے ابو ہماری

ہی طرح کے عام سے بندے ہیں۔“

”جو کچھ بھی ہے۔ بیٹا فرجاد صاحب ہی کی وجہ سے تھی۔ ہر تکلف اور فقیہ زندگی کی عادی ہو کر تمہاری معمولی سی تنخواہ میں گزارہ کر سکتے گی۔“

اجازت نہ ہو۔ سارے غم سینے میں اتار لینے پر مجبور ہو۔

لیکن جب وہ ٹینا کا معصوم چہرہ دیکھتا۔ تو اس خزانِ نابیدہ کلی کو بھی دریائی سے آشنا کرنے کا حوصلہ دل میں نہ پاتا۔

دن بڑے بے کیف گزر رہے تھے۔ ٹینا بہت اداس رہنے لگی تھی۔ اور اب تھک بار کر اس نے پھر اپنی سیلیوں اور دوستوں کا سارا دل لیا تھا۔ لیکن طبیعت سکول کا آشنا ہو چکی تھی۔ گھر کی دریائی کٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ فریاد سے جب بھی شاکی ہوتی تو جانے نہ کیسی کیسی باتیں کرنے لگتا۔ کبھی کبھی تو ٹینا کو اس کی ذہنی صحت پر بھی شک ہونے لگتا۔

آصف کی جان کھٹے میں آتی ہوئی تھی۔ جذبات کی سیڑی پر چڑھا تھا۔ سوچ سوچ کر دماغ تھک جاتا تھا۔

کیا ہو گا؟

یہ سوال دماغ پر مسلسل ہتھوڑے برساتا۔ ضمیر اصرار دیتا تھا کہ اب۔ اسے فریاد کا سامنا کرتے خوف آنے لگا۔ اسے ٹینا کو دیکھ کر جھرجھری سی آجاتی۔ کھٹکھٹاؤن سا مقام تھا۔ جہاں سے نکل جانے کی کوئی صورت ہی نظر نہ آتی تھی۔

اس شام وہ اپنے کمرے میں تھا۔ سامنے میز پر بہت سی قالیں رکھی تھیں۔ کوئی کھلی تھی کوئی بند۔ فون بھی قریب ہی پڑا تھا۔ جس کا ریسیور اس نے کریڈل سے باہر کر کھنکھواتا تھا۔ وہ اس وقت مکمل تنہا بیٹھا تھا۔ من میں پاپ دیکھے وہ آرام نہ کر سکی تھیں۔ وہ فریاد تھا۔ اس کے ہاتھ پر سوچ کی ٹھکنیں تھیں۔ اور بیکوں کے پیچھے اس کی آنکھیں کھلی ہوئے کے بادلوں اور دیکھے کچھ بھی نہ دیکھ رہی تھیں۔ اسی لیے شاید اسے فریاد کے آنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ وہ تو جب اس کی قدرے کھسکا کر میز کے دوسری طرف بیٹھ گیا۔ تو آصف بھنا بھنا سا گیا۔ پاپ ہاتھ میں لیتے ہوئے کرسی میں آگے کو جھک گیا۔ اور فریاد پر استغما سے نظریں ڈالیں۔

”کہاں ہوئے ہو فریاد۔ تمہیں دیکھنا ہی نہیں ملتا۔“ آصف سنبھل کر اسی قدر کہہ سکا۔

”وہاں ہوتا ہوں۔ جہاں سے اپنی خبر بھی نہیں ملتی۔“ فریاد نے کہا۔ آصف نے عینک ناک کی ڈھلوان پر لاتے ہوئے اسے غور سے دیکھا۔

فریاد بے پروا۔

”کس پکڑ میں ہو۔“ آصف نے دل کڑا کر کے براہ راست سوال کیا۔

”واپسی کے۔“ فریاد نے سگریٹ نکال کر ڈب پر ہی اسے بجاتے ہوئے کہا۔

جو اب آصف کی توقع کے بالکل ہی خلاف تھا۔ وہ بو کھلا گیا۔ جلدی سے بولا۔ ”کہاں واپسی۔“

آصف ایسے دور اس پر کان کھڑا ہوا تھا۔ جہاں سے راستے کا تعین کرنا اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ فریاد کی باتیں سن کر ٹھک و شبہ کی تو گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ کہ وہ گل بانو کا کھنکھٹنا میں دیکھ رہا ہے اور اس کی برسوں کی محرومی اور شخصیت کی توڑ پھوڑ اب اس نقطے پر جمع ہو گئی ہے۔ شخصیت پھر بکھر جائے کو تھی۔ ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔ آصف فریاد کے دل کی کھک اپنے سینے میں محسوس کر رہا تھا۔ اسے برسوں پہلے کی باتیں یاد نہ تھیں تو شاید وہ اس بات کا اس طرح اثر نہ لیتا۔ لیکن فریاد نے اس نے پیشہ پیار دیا تھا۔ اور جس کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی کر سکتے کا جذبہ اپنے دل میں پیشہ تر و تازہ پاتا تھا۔ اور جس کی ناکامی نے اس کے دل میں پیار کے جذبے اور گرت کر دیئے تھے۔ اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ وہ اسے بھرپور خوشیاں دینا چاہتا تھا۔ اسے مستقل اذیت سے نجات دلانا چاہتا تھا۔

لیکن

یہ سارے فیصلے ٹینا کی معصوم خوشیوں اور ان چھوٹی جتناؤں کے گلے کاٹ جاتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ٹینا کی مسرتوں اور آرزوؤں کا مرکز ارشی ہے۔ اسے یہ بھی اعتراف تھا۔ کہ ارشی ٹینا کے لیے موزوں ترین رفیق زندگی ثابت ہو سکتا ہے۔

ایک طرف فریاد تھا دوسری طرف ٹینا۔

اسے سمجھ نہ آ رہا تھا۔ کہ کیا کرے۔ اس روز کی گفتگو کے بعد فریاد نے فرار کی راہ اختیار کر لی تھی۔ گھر سے غائب رہنا شروع کر دیا تھا۔ اب نہ ٹینا کے ساتھ بیٹھ سکتی تھیں۔ نہ تاش نہ شطرنج کی بازیاب جیتیں اور نہ ہی ستار بجائی ٹینا کو گھنٹوں بیٹھے نکلا

ٹینا اس کے اس قدر سرد اور خشک رویے سے حیران و پریشان تھی۔ وہ کئی بار اس پر سے تذکرہ کر چکی تھی۔ فریاد کی کاپلٹ یوں ہو گئی تھی۔ وہ کئی دفعہ اسے کہتے کہتے رو پائی ہو گئی تھی۔ اسے تو فریاد کے آجانے سے ہماروں کے ورود کا احساس ہوا تھا۔ ہماریں یوں بھی اجڑ جاتی ہیں؟ کیا انکی دیر ان بھی ہو جاتی ہیں؟؟

آصف فریاد کی ذہنی کیفیت کا ایک ایک نقطہ سمجھ رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں جو جھجکاں رہا تھا۔ اس کا اسے اچھی طرح علم تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ فریاد بار بار تھوڑے کایوں نشانہ بنے کہ تڑپ لے

”جہاں سے آیا تھا دوست۔ سوچ رہا ہوں وہیں لوٹ جاؤں۔“ اس نے سگریٹ منہ میں دبا کر لائٹ کر دیا۔

”آصف صرف اسے تنکا رہ گیا۔“

”یہاں کی فضا مجھے راس نہیں آئی۔ وہ لائٹریٹ جیب میں ڈالتے ہوئے سگریٹ کا کش لے کر

بولاً۔

”خدا بخواد ہی آگیا تھا۔“

آصف کچھ بھی نہ کر سکا۔ بیس برس پہلے فرجاد کیوں گیا تھا اسے علم تھا۔ اور اب کیوں واپس جا رہا تھا وہ بھی جانتا تھا۔ کتنے سننے کو اس کے پاس تھا۔ یہ کیا؟ کیا کیا کیا نہ کہتا۔

فرجاد چندے پتے خاموشی سے سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ بڑی آہستگی سے حواں چھوڑ کر نل کھاتے سرغولوں کو دھیتا رہا۔

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور باہر نکلنے والی کڑی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

یہاں سے ندی کا اوپر والا ٹھکانا صاف نظر آتا تھا۔ جہاں لکڑی کا صندویں پرانا پل اپنے پرانے پل ہی کی وجہ سے مجاز نظر آ رہا تھا۔

بارشوں کی وجہ سے یہاں کی یہاں کی نظر آتی تھی۔ ہر چیز دھلی دھلی تھی۔ فضا میں بڑا ہی کھار تھا۔ لیکن من بے چین ہو۔ تو خوبصورتی بے معنی ہی مٹے ہو جاتی ہے۔ حسین ذوق نظری کا تو دوسرا نام ہے۔

فرجاد کمر موڑے کھڑا تھا۔ لیکن منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا نہ خوشگوار فضا سے۔ ساکت نگاہوں سے خلا میں دیکھ رہا تھا۔

”آصف۔“ جانے کیا سوچتے سوچتے وہ بولا۔

”ہوں۔“ آصف پھر پہلے پیسے مرل انداز میں کرسی میں پڑا تھا۔

”یہ ارشی کون ہے؟“ فرجاد کی گواہی سے ہمت دور سے آئی۔

یہ آصف کے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ اسے یوں لگے جیسے اس کی روح کسی نے قبض کر لی ہے۔ جسم میں سخت درد نل دواغ کام کرتا محسوس ہوا۔

فرجاد نے گردن قدرے موڑی۔ اور پھر ادھر ہی دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میتا کو کوئی بوائے فریڈ ہے۔ اور شاید۔“ میتا اس کے حق میں اپنا آخری فیصلہ بھی دے چکی ہے۔“

آصف نے چال چلا کہاں کہہ دے۔ لیکن جانے کیوں اس کے لب جنش نہ کر سکے۔ فرجاد کے لیے کی بچاؤ کی اور پھٹا ہوا درد قطرہ قطرہ اس کی روح کے نہاں خالوں میں اتر رہا تھا۔

کیا واقعی کچھ لوگ دنیا میں صرف محرومی کی جس دوام ہی کاٹنے آتے ہیں؟۔ سب کچھ رکھتے

ہوئے بھی کچھ نہیں پاتے۔ کسی کا برا نہیں چاہتے لیکن اپنے ساتھ بھلائی نہیں پاتی۔ تقدیر انہیں گھیر گھیر کر مارتی ہے۔ اور مقدر تباہ تباہ کر نشانہ بناتا ہے۔

محبت میں ناگاہی کا صدمہ تو ایک دفعہ بھی جھیلنا کم نہیں ہوتا۔ دودھ دار ایسے سامنے سے دو چار ہونا کتنی بڑی المیائی ہے۔

فرجاد آصف کو بہت عزیز تھا۔ اس کے اس پر بہت سے احسان تھے۔ گل بانو کو اس قدر شدت سے چاہتے کے باوجود اس کی راہ سے ہٹ جانا فرجاد کے کردار کی عظمت کی دلیل تھی۔ ورنہ دولت کے بل بوتے پر وہ چاہتا تو گل بانو کو حاصل کرنا اس کے لیے مشکل نہ تھا۔ لیکن وہ خاموشی سے اس کے راستے سے ہٹ گیا تھا۔ اور دولت جائزہ زمینیں سب کچھ آصف کے نام منتقل کر کے بہت دور چلا گیا تھا۔ گو آصف نے اپنے آپ کو ساری دولت کا صرف مالک ہی سمجھا تھا۔ لیکن فرجاد نے تو قربانی دے دی تھی۔

میں برس اس نے جانے کن کن تلخ تجویزوں کی نذر کیے تھے۔ اپنی بھولی میں دکھ ہی دکھ بھر لیے تھے۔ اپنوں سے کٹ کر جیتا بھی تو بدترین دکھوں میں سے ہے۔

اب حالات اور وقت سے اسے پھر اس موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔ جہاں سے بھاگ کر اس نے قید تہائی کے میں برس کاٹے تھے۔

کیا اب پھر وہ تہائی کا سیر ہو جائے گا؟

نہیں۔ یہ ظلم ہو گا۔ ناروا ظلم ہو گا۔ اس تہائی سے اس قید سے اسے بچا لیتا آصف کا فرض تھا۔ بعض حکم خریدنے کے لیے ہمیں دکھ کی صلیب پر چڑھنا پڑتا ہے۔ اب وقت سکھوں کا زیادہ مستحق فرجاد تھا۔ اس لیے آصف اور میتا کو دکھ کی صلیب کندھوں پر اٹھانا ہی تھی۔

”تم بہت مایوس دکھائی دے رہے ہو فرجاد۔“ آصف اپنی جگہ اٹھ کر اس کے قریب آکر آہستگی سے بولا۔

ہمدردی کا بیان ہے کہ نر سا روپ تھا کہ فرجاد نے بے بس ہو کر کہنیاں کھڑکی کے در میں نکالتے ہوئے سر ہاتھوں پر گر لیا۔

”تم واپس نہیں جاؤ گے۔“ آصف نے مستحکم آواز میں کہا۔

فرجاد نے اسی انداز میں کھڑے کھڑے سر کو نفی میں جھنٹ دی۔

اور

اس کی بچاؤ کی ہے بس اور گھمبیر دکھ کو محسوس کرتے ہوئے آصف نے انکا اپنی فیصلہ کر لیا۔

اپنی زندگی۔

میتا کی زندگی۔

فرجادی زندگی کا اہم ترین فیصلہ۔

جو دونوں کی سوچ کے بعد بھی کسی واضح نتیجے پر پہنچ نہ پاتا تھا۔ ایک لمبے میں طے پایا۔

”میں نہیں بلاؤں نہیں کدوں کا فرجاد“ آصف کی آواز یوں لگے جیسے صرف کمرے ہی میں نہیں روح میں بھی گونج پڑا کر گئی ہے۔

فرجاد نے جلدی سے سر اٹھایا۔ آصف کو دیکھا۔ اسے شاید ان الفاظ کا یقین نہ آیا تھا۔ جو اس کے کانوں میں اتر چکے تھے۔

آصف بڑی المناکی سے مسکرایا۔

”تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“ فرجاد نے پچھنی سے اسے دیکھا۔

”جو کہنا چاہتا ہوں تم مجھے کہتے ہو۔“ آصف واپس مڑتے ہوئے بولا۔

فرجاد کے لب طے لیکن کچھ نہ سکا۔

”کیا تم سمجھتے ہو۔ میں بے خبر ہوں۔“ آصف اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔

”آصف۔“ مرمل سی آواز فرجاد کے لبوں سے نکلی۔

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ۔“ بیڑہ تھیں سو نہ دوں۔“ آصف نے جلدی سے کہا۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ یوں جیسے مہلوں کی مسافت بھاگ بھاگ کر طے کی ہو۔

فرجاد پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ منہ اودھ کھلا اور ہاتھ اٹھے ہی وہ گھٹے آنکھوں میں اذیت جم گئی۔

آصف بائپ کے کش پر سس لگائے جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں مغموم سی کیکاپٹ حتی اور بدن پر غیر محسوس ساروش۔ دماغ کی ریگس سننا رہی تھیں۔ پیشانی پر سلوین مہم کی تھیں۔

آنکھیں ٹینک کے شیشوں کے پیچھے بند ہو گئی تھیں۔

جب فرجاد قدرے سنبھلا۔ تو غیر متوازن چال چلتے کرسی کے قریب آیا۔ کرسی کی پشت پر

مضبوط گرفت کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ تم نے کیوں اور کیسے کر دیا آصف۔“

آصف نے صرف ایک خاموش نگاہ اس پر ڈالی۔ خاموش نگاہ جو بلند آواز میں گویا تھی۔

”تم غلط سمجھتے ہو آصف۔“ فرجاد نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی۔ بے رنگ سی

مسکراہٹ لبوں پر لے آیا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو دیے ہی واپس جانے کی سوچ رہا ہوں۔

دراصل۔ دراصل۔ یہ باجول مجھے اپنے میں جذب نہیں کر سکا۔“

آصف کوچ کا یقین دلانے کے لیے وہ جانے کیا کیا باتیں کہتا رہا۔

اس کا چہرہ اس کی آنکھیں اس کے لب و لہجہ پر اس بات کی نفی کر رہا تھا۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا۔

آصف کچھ نہیں بولا۔ چپ چاپ سنتا رہا۔

”کاش یہ سب کچھ سچ ہوتا۔“ آصف کا دل کہہ رہا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ جو کچھ فرجاد کہہ رہا ہے۔ باتوں قسطنطنیہ اور جھوٹ کے سوا کچھ نہیں۔

اس کا ثبوت اسے اس رات مل گیا۔

آصف اپنے بستر پر قزاقی سے کد میں بدل رہا تھا۔ نیند آنکھوں سے دور تھی۔ بائپ بی بی کر ملحق کر دیا ہو چکا تھا۔ پوٹے بدل رہے تھے۔ وہ بڑھن میں لگ سی گئی تھی۔ وہ بستر سے اٹھ کر کمرے سے باہر آیا۔

وہ اپنے تختے بدل و دماغ کو ہر کی گھڑی اور خوشگوار فضا میں تسکین دینا چاہتا تھا۔

باہر فضا رات تھی خوشگوار تھی۔ رات چاند کے بغیر بھی جھل جھل کر رہی تھی۔ دور چٹنیوں

میں چٹنیوں کو روٹیوں کا انکسار پر آمدے تک نہ وہ رہا تھا۔ پھر بھی یہ اندھیرے کی سیاہی کو تحلیل کر

رہی تھیں۔ وہ ستون سے لگتی سی دیوڑھی آسمان کے سینے میں ٹپکتے تھے۔ فانیوں کو تنگ رہا۔

تاریکی کا لبادہ اوڑھنے پر اسرار درختوں کو دیکھتا رہا۔ ندی کی شاخ شاخ کی آواز سننا رہا۔

پھر ٹپکتے لگے۔ اور ٹپکتے ٹپکتے یونانی خوابگاہ کی طرف آیا۔ اس پر آمدے سے ہو کر وہ پچھلے

پر آمدے کی طرف جانے والا تھا۔

لیکن

اس کے قدم رک گئے۔

یونانی خوابگاہ میں ٹپکتے والی چوڑی کھڑکی سے ہلکی ہلکی روشنی پر آمدے میں آ رہی تھی۔ پردوں کے پٹنے سے روشنی کے زاویے بھی بدل جاتے تھے۔

اس نے دیکھا۔

کہ ایک سایہ کھڑکی سے لگا کھڑا ہے۔

یہ سایہ فرجاد کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔

آصف دیے پاؤں آگے بڑھا۔ دیوار کی اوٹ سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ فرجاد کھڑکی کا درمیانی

پر وہ دونوں ہاتھوں میں قسائے کچھ بڑھا رہا تھا۔

اور ٹوٹے پھوٹے جو الفاظ آصف کی سمجھ میں آئے ان کا لب لباب یہ تھا کہ گل بانو میں

صدیوں سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ ہر بار کوئی آصف تمہیں مجھ سے جھپٹ لیتا ہے۔ لیکن میں

تمہیں دکھ نہیں دوں گا۔ گل بانو۔ تمہاری خوشیوں کی خاطر اب بھی تمہارا راستہ سے ہٹ جاؤں

گاہ میں تھے اپنی بد نصیبی کی لپیٹ میں نہیں آئے دوں گا۔ ٹینا۔ گل بانو۔ ٹینا گل بانو۔
وہ سبک رہا تھا۔

آصف تو جیسے سانس لیتا بھی بھول گیا۔

اور جب کئی لمحوں بعد فرجاد کھڑکی کے پردے چھوڑ کر پرے ہٹا اور سامنے کی طرف آہستہ

آہستہ قدم اٹھائے چلا گیا۔ تو آصف اپنی جگہ سے ہلا۔

وہ کھڑکی کے سامنے سے گزرا تو اس کی نظر ٹینا پر پڑی۔

بیاضی ریشمی بستریں وہ بڑی معصومیت سے سو رہی تھیں۔

سوئے کا انداز بلاشبہ گل بانو کا تھا۔

ٹینا کو یوں لگ رہا تھا جیسے ہر چیز ہفتہ دن ہے۔ بھلا بھی جان چیزیں بھی کبھی فہم سکتی ہیں۔
مسکرا سکتی ہیں۔ قہقہے لگا سکتی ہیں۔ یہ تو جانداروں کی اک کیفیت کا نام ہے۔ اور بے جان چیزیں۔!
اسے دن مسکراتا ہوا لگ رہا تھا۔ درد و پوار مسکرائے دکھائی دے رہے تھے۔ گھر کی ایک ایک
چیز جن کا ایک ایک پورا۔ ایک ایک پھول ایک ایک پتی قہقہے لگاتی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید یہ
سب اس لیے کہ انسان ہر چیز کو اپنے محسوسات کی آنکھ سے دیکھنے کا عادی ہے۔

آج ٹینا بے انتہا خوش جو تھیں۔ من میں لذت و انبساط کی لہریں ڈول رہی تھیں۔ آنکھوں
میں مستقبل کے حسین خوابوں کا عکس ڈول رہا تھا۔۔۔۔۔۔ مسکرا رہیں اس کے انگ انگ
سے پھوٹ رہی تھیں۔

آج ارشی کے اسی ابو آ رہے تھے۔ دست سوال پھیلائے آ رہے تھے۔ ارشی نے صبح ہی
صبح اسے فون پر بتایا تھا۔

اور

اسی وقت سے اسے یوں لگ رہا تھا۔ کہ جیسے ہر چیز مسکرا رہی ہے۔

فون سنتے ہی اس نے سارے دن کا پروگرام ترتیب دے لیا تھا۔ اس کا آواز ڈرائیونگ روم کی الٹ
پلٹ سے ہوا۔ جدارنی اور بیڑے کو ساتھ لے کر اس نے ڈرائیونگ روم کی صفائی شروع کر دی۔
وہ کام کروا رہی تھی۔ بیڑے اور جدارنی سے آج اتنی بے تکلفی سے ہنس پول رہی تھی۔
کہ وہ دو دنوں کبھی کبھی حیران ہو کر اس نکتے گھٹکتے۔

وہ پانچپنٹے اڑسے روپے کے چنل پہنے دوپٹے سے بالوں کے جوڑے کو ڈھانپنے فرنیچر جھاڑ پونج
رہی تھی۔ دیواریں صاف کروا رہی تھیں قالین باہر دھوپ میں ڈال دیا تھا۔ عینیاں تصویریں اور
آرائشی چیزیں سب نکال کر برآمدے میں رکھ کر صاف کروا رہی تھی۔

وہ ماربل کا لیپ صاف کرنے میں مگن تھی۔ کہ آصف باہر جانے کے لیے ادھر سے گزرا۔

”کیا ٹینا بیٹے۔“ اس نے دھول و گرد میں الٹی ٹینا کی طرف دیکھا۔

”صفائی کروا رہی ہوں ابو۔“

”کروا رہی ہو یا کر رہی ہو۔“

”کر رہی ہوں۔“

”کے لیے تھوڑا سا جھڑپا اور صابراں کو بلا لیا ہوتا۔“

”کوئی بات نہیں ابو۔ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔“

وہ جیسے نئے نئے ڈول رہی تھی۔ آصف نے سر ہلاتے ہوئے اچھا اچھا کہا اور باہر جانے کو قدم

اٹھایا۔

”ابو۔“

”ہوں۔“

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”کون؟“

”جائیں گے۔“

”ہسپتال میں دو مریضوں کو دیکھنا ہے۔ کل گاؤں سے آئے تھے۔ اور جہاں جا رہوں۔“

”دوہروا نہیں آجائیں گے۔“

”ہاں ہاں۔“

”جس ٹھیک ہے۔“

”کوئی کام ہے۔“

”ہاں۔“

”کیا۔“

”ٹینا لپ پر جھکتے ہوئے سرشار لہجے میں بولی۔ ”آج شام ارشی کے اہی اور ابو آرہے ہیں۔“

آپ سے ملنے۔“

”آج۔“ آصف کچھ ہڑسا گیا۔

”ہاں ابو آج شام۔ آپ گھر ہی رہیے گا۔“

وہ لپ اٹھا کر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

اور

آصف وہیں کھڑا رہ گیا۔ بے حس و حرکت۔ بت کی طرح۔

ارشی کے اہی اور ابو آرہے تھے۔ جس سلسلے میں آرہے تھے۔ ٹینا کے لب و لہجہ نے اس کا

احساس دلا دیا تھا۔

چند لمحوں کو اس کی کایا ڈول گئی۔ لیکن فیصلہ فیصلہ تھا۔ ستر تھا۔ آج ہو ہی باکے۔ وہ تیرا تیرا قدم چلا برآمدہ عبور کے بیڑھیاں اتر گیا۔

ٹینا کو یاد رہی خانے سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن آج اس نے چائے کے لیے دو ایک چیزیں اپنے ہاتھوں سے بھی بنائیں۔ ساری دوپہر اس نے خانہ سال سے ہدایات لے لے کر اپنے ہاتھوں سے چیزیں بنائیں۔ نیچے کے دروازے پر بیٹھے کباب اس نے بڑی محنت سے تیار کیے۔

ڈانگ روم میں بھی وہ کتنی ہی دیر گھسی رہی اور برتنوں کا انتخاب کرتی رہی۔ نفیس ترین برتن اس نے میز پر رکھے۔ چاندی کے کٹری سیٹ کو بھلا آج استعمال نہیں ہونا تھا تو اور کب ہونا تھا۔ خوبصورت پرنٹ والے کانڈی ٹینک بھی اس نے میز پر سجا دیے۔

اور

ان سب کاموں سے فارغ ہو کر وہ نمائی دھوئی۔ سیاہی مائل اور مچ رنگ کے شوار دوپٹے کے ساتھ شوخ شوخ پھولوں والی قمیض پہنی۔ یہ سادہ سالباں بھی اس کی حسن کی چاندیت اور دلکشی میں اضافہ کر رہا تھا۔

تیار ہو کر وہ فریاد کے کمرے کی طرف آئی۔ انکل ان دنوں گھر سے غائب ہی رہتے تھے۔ صبح اس نے تاکید تو کی تھی کہ شام وہ گھر ہی رہیں۔ لیکن ان کا موڈ جس طرح رنگ بدل رہا تھا۔ یقین دہانی کے لیے وہ ان کے کمرے میں آگئی۔

وہ کمرے میں نہ تھا۔

ٹینا نے برآمدے میں دیکھا۔ پچھلے چمن کی طرف گئی۔ نشست گاہ میں آئی۔ فرجاو کبھی نہیں

تھا۔“

”انکل کہاں ہیں۔“ اس نے ان کے ملازم سے پوچھا۔

”گاؤں میں گئے شاید۔“

”گاؤں۔“

”جی۔ شاید۔ یہی کہہ رہے تھے۔“

”کب گئے۔“

”تھوڑے ڈیڑھ ہو گا۔“

”واپس کب آئیں گے۔“

”کچھ کہہ نہیں سکے۔“

”کوئی ضروری کام تھا۔“

”کام کیا ہو گا۔ میرے لیے گئے ہوں گے۔“

ارشی براہِ بولے جا رہا تھا۔ ینا کبھی مسکرا کر کبھی ہوں کر کے جواب دے رہی تھی۔

”یہ کیا۔۔۔ کبھی ہوں کبھی ہوں۔ کبھی منکا سا سر ہلا دیتی ہو۔ باتیں کیوں نہیں کرتیں ینا۔ جب سے آیا ہوں میں ہی بولے جا رہا ہوں۔ آج کتنا مبارک دن ہے۔ تم خوش نہیں ہو۔“

”تو پھر۔“

وہ دھیرے سے مسکرائی۔ پھر روشن روشن آنکھوں سے ارشی کو دیکھ کر نظریں جھکاتے ہوئے لجا کر بولی۔ ”ارشی۔“

”ہوں۔“ وہ سر پاشوق تھا۔

”اللہ۔ مجھے تو ابھی سے تم سے شرم آنے لگی ہے۔“ اس نے ادائے دلربائی سے دونوں

ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔

حسن کی اس محب و محبوب ادا پر ارشی کا دل لوٹ پوٹ ہی تو گیا۔ جلدی سے اس نے ینا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے۔ اور اس کی شرمیلی نگاہوں سے اپنی شوق نظریں ٹکراتے ہوئے بولا۔ ”اور مجھے تو تم پر ابھی سے ایسا پیار آ رہا ہے۔ کہ جی چاہتا ہے سینے میں پہچاؤں تمہیں۔“

”نیٹے جی۔“ ینا نے دھچکے سے ہاتھ چھڑا کر پیچھے ہٹنا چاہا۔

لیکن

ارشی کا چمک زوردار تھا۔ وہ پیچھے ہٹنے کی بجائے ارشی کے سینے سے آگلی۔

”یہ کیا بات ہوئی۔“

مازم نے کوئی جواب نہ دیا۔ ینا دھیرے دھیرے چلتی اپنے کمروں کی طرف آگئی۔ فرجاد کو اس نے بڑی تاکید کی تھی۔ لیکن وہ پھر بھی چلا گیا تھا۔ وہ برآمدے کے ستون کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اور فرجاد کے اسٹے غیر معمولی اور عجیب و غریب روپے کے متعلق سوچنے لگی۔

سوچیں کچھ طویل نہ ہو پائی تھیں۔ کہ حویلی کے بیرونی بڑے گیٹ سے لطیف صاحب کی چھوٹی سی موٹر اندر آئی دکھائی دی۔

گاڑی ارشی چلا رہا تھا۔ اس کے برابر لطیف صاحب بیٹھے تھے۔ اور پچھلی سیٹ پر اس کی اسی اور بڑی باقی بیٹھی تھیں۔

ینا کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ گالوں پر سرخی لہرائی اور کانوں کی لوسیں چلنے لگی۔ خوشیوں کا یہ دھماکہ خیز تھا۔ دھماکہ کسی چیز کا کبھی ہوا ایک بار تو تھا ادا رہتا ہے۔ ینا نے ستون کے گرد باؤڑ حاصل کر کے اسے سختی سے پکڑ لیا۔ جیسے یہ اقدام نہ کرتی تو گھر ہی جاتی۔

مہمانوں کا استقبال اسے ہی کرنا پڑا۔ ابھی اس نے اپنے کمرے ہی میں تھے۔ لطیف صاحب نے اس کے سر پر دست شفقت رکھ کر دعا دی۔ ارشی کی اسی نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا ان کے نرم نرم سینے میں اس کا پی چاہا کہ دھن پی چلی جائے۔ کتنی شفقت تھی کتنی متانت۔ ینا نے اسی کے مرنے کے بعد آج پہلی بار اس پیار کو پھر سے محسوس کیا تھا۔

ارشی کی باہی نے بھی اسے لپٹا لیا۔ اس کے پیارے پیارے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر اس نے محبت سے پیار کر لیا۔

ارشی کا بس چلنا تو وہ پیار کے اظہار میں ان سب سے سبقت لے جاتا۔ آنکھوں آنکھوں میں اس نے کیسی خوشیاں کر ڈالیں۔ ینا اس سے بے تکلف ہونے کے باوجود ان خوشیوں سے لگا گئی۔

مہمانوں کو ڈرا بینک روم میں بٹھا کر چند لمحے احوال پر سی کرنے کے بعد وہ ابو کو بلانے چلی گئی۔

ابو کی طبیعت کا الجھاؤ ینا نے محسوس تو کیا۔ لیکن خوشیوں کی یلغار ایسی تند تھی۔ کہ اسے اس کے متعلق سوچنے کی فرصت تھی۔ نہ ضرورت۔

ابو ڈرائیگ روم میں گئے۔ وہ باہر ہی رک گئی۔ اور چند لمحوں بعد ارشی بھی باہر آ گیا۔

محالہ بیڑوں کے ہاتھوں میں سوئپ کر دوںوں دل کے معاملے طے کرنے چن میں اتر گئے۔

ارشی زمانے بھر کی باتیں کر رہا تھا۔ ینا کا نرم و گداز ہاتھ باتوں کے دوران شدت جذبات سے دبا بھی رہتا۔ ینا سرخ سرخ ہو رہی تھی۔ فطری سیاقا غالب آ رہی تھی۔ وہ ارشی سے بے شک بے تکلف تھی۔ بلا تردد ہمتی تھی۔ لیکن آج اسے ارشی سے عاجز آ رہا تھا۔

”ساحرہ بائی۔“ وہ روٹا ہنسی ہو گئی۔

”کیا کہنا ہے ٹینا۔“

”ساحرہ بائی۔ ارشی کہاں ہے۔“

”اپنے نصیبوں کو رو رہا ہے۔“

”بائی۔“

وہ ایک دم چیخ اٹھی۔ اس کے منہ سے اور کوئی لفظ نہ نکل سکا۔

”ٹینا۔“ ساحرہ کی آواز رفتاری لہری طرح اس کے دل و دماغ سے ٹکرائی۔ ”ہمیں یہ امید نہ

تھی۔“

”کیا کہہ رہی ہیں ساحرہ بائی۔“

”تمہیں کچھ پتہ نہیں۔“

”کس بات کا۔ خدا کے لیے ساحرہ بائی کھل کر بات کیجئے۔ کیا بات ہے۔ بائی۔ بلو۔ بلو۔“

ساحرہ بائی کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔“

”تمہارے ابو نے ہماری درخواست مسترد کر دی ہے۔“

”کیا؟“

ساحرہ نے بھڑوئی الفاظ دہرا دیئے۔

”کیوں۔ کیوں ساحرہ بائی۔“ ٹینا پریشان سے پریشان تڑو کر اٹھا اسی سے پوچھنے لگی تھی۔ اس کا

رنگ اڑ گیا تھا۔ اور جسم میں سناٹا پھٹ سی ہونے لگی تھی۔

”یہ اپنے ابو سے پوچھو۔“ ساحرہ نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

”بائی۔ بائی۔“ وہ رو دینے کو تھی۔

”تمہارے ابو نے صاف طور پر انکار کر دیا ہے ٹینا۔ شاید ہم لوگ مالی لحاظ سے تمہارے ہم

پلہ نہیں۔ یہ ارشی کی بھی غلطی ہے۔ جو جائید کو پکڑ لینے کی حماقت کرتا رہا۔ تم ہی کم از کم اسے اپنے

ابو کے خیالات کے بارے میں کچھ بتا دیتیں تو آج وہ اس حد سے بے دھچکا تو نہ ہوتا۔“

ساحرہ بائی جاسے کیا کیا کہتی رہی۔ ٹینا کے ہاتھ سے ریسیور گر گیا۔ اور چند ٹائپے تو اسے یوں

ٹکا جیسے موت اسے اپنی پلیٹ میں لیے چلی ہے۔ بے حس و حرکت مٹی کے بت کی طرح بیٹھی رہی۔

یہ انکشاف اس قدر عجیب اور اتنا غیر متوقع تھا کہ ٹینا رد عمل کے طور پر فوراً چیخ سکی نہ رو سکی۔ اس

کے حواس تو جیسے جواب ہی دے گئے۔

لیکن جب وہ حواس میں آئی۔ تو پہلا احساس شکست ماننے سے انکار تھا۔ ابو نے ایسا کیوں کیا

تھا؟ وہ سوچنے کے لیے تیار نہ تھی۔

ٹینا کا خیال تھا کہ ارشی گھر پہنچے ہی اسے فون کر کے اپنی بے پناہ خوشیوں کا جذباتی سا اظہار کرے گا۔ اسے چھیڑے گا۔ شوخیاں کرے گا۔ بنائے گا۔ ستائے گا۔ لیکن شام ڈھل گئی۔

اور

پھر رات بھی اتر آئی۔ ارشی کا فون نہیں آیا۔ ٹینا اپنے آپ سے الجھنے لگی۔ کتابچی چاہ رہا تھا۔ اس کا ارشی سے باتیں کرنے کو۔

وہ ٹیلیفون اپنے کمرے میں اٹھلائی۔ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس نے فون گود میں رکھ لیا۔ نمبر ڈائل کرنے سے پہلے وہ کئی لمبے متذبذب کے عالم میں رہی۔ جھجک سی کر رہی تھی۔ اتنا اپنا سارا شری

تھا۔ لیکن پھر بھی اس سے شرم آ رہی تھی۔ یہ سنے تعلق اور رشتے کا انوکھا پن ہی تو تھا۔

پھر اس نے نمبر ڈائل کر ہی دیا۔

فون اٹھانے والی ارشی کی بائی ساحرہ تھی۔

”بلو۔“

”ساحرہ بائی۔“

”ہوں۔“

”میں ٹینا بول رہی ہوں۔“

”ابھی تو آواز نہجان سکتی ہوں ٹینا صاحبہ۔“

”جی۔“

ساحرہ بائی کی آواز میں غصے کی کھانسی اور اللہ جانے سرزد مہری کی کیسی لہر تھی۔ ٹینا کچھ سمجھ نہ

سکی۔ اپنی صاحت پر یقین نہ آیا۔ چند ٹائپے ہر اسالیسی ریسیور کو دیکھتی رہی۔ پھر جلدی سے بولی۔

”بلو۔ بلو۔“

پلے ٹھنڈے لہجے میں جواب ملا۔ ”کیا ہے۔“

ابو کویا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ ایمان سوچ بڑی تھمتھی۔
 وہ دن ستر پیچک کر جب انھی تو اس کا چہرہ جھٹھا رہا تھا۔ کھلوں پر پڑے بالوں کو اس نے
 سس کر جوڑے کی صورت لپیٹا۔ بال کسے میں جو شدت تھی یہ اس کے جذبات کا پتہ تھی۔
 اس نے اسی وقت ابو کے پاس جا کر پوچھنے کا فیصلہ کر لیا۔ ابو اگر اس کے اور ارشی کے
 جذبات سے لاعلم ہوتے تو شاید وہ سرکش اور بغاوت کی یہ لہر اپنے اندر اپنی تھمتی سے اٹھنے نہ
 دیتی۔

لیکن

سب کچھ جانتے ہو جیسے ابو نے اپنے حق کا اتنا جبارانہ اور وحشیانہ استعمال کیوں کیا تھا۔ وہ بے
 زبان لگائے نہ تھی۔ پڑھی لکھی ہو شہنشاہی لڑی، ارشی کا انتخاب بھی کوئی ایسا کر پڑا نہ تھا۔ جو
 یوں رد کر دیا جاتا۔ وہ سرمایہ دار نہ کسی عزت مند گھرانے کا ایک سلجھا ہوا فرد تھا۔ جس کی ذہنی سطح
 اس کے ذہن سے مطابقت رکھتی تھی۔ جس کی سوجھیں اس کی سوجھوں سے مختلف نہ تھیں۔ جو
 زندگی کے متعلق وہی نظریات رکھتا تھا۔ جو خود اس کے تھے۔ جو خلص تھا۔ بے عیب تھا۔ بے لوث
 چاہتیں اور بھرپور محبتیں دینے والا پیارا انسان تھا۔

یہنا کے انکار جمل رہے تھے۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے سے نکلی اور ابو کے کمرے کی طرف
 چلی۔

اس کے ذہن میں لطیف صاحب اور ان کی بیگم کے چہرے گھوم رہے تھے۔ ساتھ باجی کا
 سر اٹھا کر رہا تھا۔

وایسی کے وقت واقعی وہ لوگ بچے بچے تھے۔ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے تہمت کرنے والے
 واپس لوٹ رہے ہوں۔ اس وقت تو یہنا نے یہ بات محسوس نہ کی تھی۔ لیکن اب وہ ان لوگوں کے
 بچھ جانے کی وجہ جان گئی تھی۔

یہنا جس تہمتی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ اسی تہمتی کے ساتھ ابو کی کرسی کی پشت پر
 آئی۔

آصف باپ کے کش پہ کش لے رہا تھا۔ کمرے میں خوشبودار تمباکو کی محک پھیلی تھی۔ یہ
 محک غماز تھی۔ کہ آصف کافی دیر سے باپ نہی رہا ہے۔

”ابو۔“ یہنا نے کرسی کی پشت کو مضبوطی سے پکڑ کر جس انداز میں کہا۔ آصف کا ٹھٹھکا جانا
 یقینی تھا۔

اس نے جلدی سے گردن گھٹائی۔ یہنا کو دیکھا۔ جو کچھ وہ کہنے پا چکے تھے۔ اس کے تہور
 سب کچھ تار پھٹے۔

آصف نے کچھ نہیں کہا۔ رخ موڑتے ہوئے تہمتی سے باپ کے کش لینے لگا۔ وہ یہنا کی
 طرف نہیں دیکھتا چاہتا تھا۔ مبادا اس کی مصیبت بے گناہی اور محبت اس کے فیصلے کو متزلزل کر
 دے۔ اس کا وہ ہاتھ کاپ جاتے۔ جو یہنا کی محبت کا ٹکڑا ہونے کے لیے حرکت میں آچکا تھا۔
 چند لمحے صیب سی خاموشی طاری رہی۔ قبرستانوں پر چھایا سنا بھی شاید اتنا صیب نہ ہوتا ہو
 گا۔ یوں لگتا تھا جیسے موت کو موت آچکی ہے۔

شاید یہ لمحے طویل سے طویل تر ہو جاتے۔ سنانے کو توڑنے کی آصف میں ہمت تھی نہ یہنا
 میں۔ وہ تو اندہی اندر اہل رہی تھی۔ بیچ و تاب کھاری تھی۔ اندر جذبات کی اتنی شدید انتہائیں
 تھیں۔ کہ کچھ کہنے کی ان کوں قوت ہی نہ آسکتی تھی۔ باہر لان میں سنا کی اجنبی کو کچھ کر زور زور
 سے بھوکنا سنانا اپوں آپ ٹوٹ گیا۔

آصف نے پانس پیڑ ڈال دیا۔ اور کرسی سے اٹھ کر بوجھ قدموں سے کھڑکی کے قریب جا
 کھڑا ہوا۔

یہنا بھی قدرے سنبھلی اور تیز استقامت نظروں سے باپ کو دیکھا۔ اس کی گرفت کرسی کی
 پشت پر اور مضبوط ہو گئی۔

جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھی۔ آصف جان چکا تھا۔ جو اسے پوچھنا تھا۔ وہ بھی اس کے علم میں تھا۔
 چند لمحے وہ باتوں کو بے چینی سے ملتا رہا۔ پھر گھیر آوازیں بولا۔ ”یہنا بیٹے۔ میں نے جو کچھ کیا
 ہے۔ مصلحت اسی میں تھی۔“

”ابو۔“ وہ چیخا۔ اس کا وجود کانپنے لگا۔ چروہ پر رونق ہو گیا اور ہونٹ پھیل پڑ گئے۔ آصف
 جلدی سے اس کے قریب آیا۔ اس کے سر پر دست شفقت رکھتے ہوئے گھٹی گھٹی آوازیں بولا۔ ”
 میں نے بت کچھ سوچا ہے۔ بیٹی۔ بعض اوقات مصلحتیں انسان کو ایسے فیصلے کرنے پر مجبور کر دیتی
 ہیں۔ جو نظارہ صحیح نہیں لگتے۔ جو ذہنی اور روحانی تکلیف بھی دیتے ہیں۔ لیکن کچھ وقت گزرنے پر
 جب ہم جذباتیت سے ہٹ کر سوچتے ہیں۔ تو احساس ہوتا ہے کہ جو کچھ ہم نے کیا وہی درست تھا۔“

یہنا لگ لگ سی کھڑی رہی۔ اس کے چہرے پر نرمی چھائی ہوئی تھی۔ وہ جانے آصف کی باتیں
 سن اور سمجھ بھی رہی تھی یا نہیں۔

آصف نے فرجاد کا نام تو نہ لیا۔ لیکن بڑی مانت سے ایک ازلی محروم انسان کو خوشیاں دینے
 کی باتیں کرتے ہوئے یہنا کو سمجھانے لگا۔ جذباتیت سے ہٹ کر سوچنے کی تلقین کرنے لگا۔ دو سروں
 کی خاطر قربانی دینے کی عظمت پر روشنی ڈالنے لگا۔

لیکن

جب دل و دماغ میں ٹھن جائے۔ تو نہ دل و دماغ کی منتا ہے۔ نہ دماغ دل کی۔ کشش کا عالم بھی زیادہ دیر قائم نہیں رہتا۔ ایک کو مات کھانا ہی پڑتی ہے۔ آصف کی دلیلیں لاکھ عقلی صحیح۔ ٹینا کا نوجوان ذہن ایسی باتیں بھلا قبول کرنے کو تیار کیسے ہو سکتا تھا۔ دل کے معاملے یوں تھوڑا ہی نہٹ سکتے ہیں۔ وہ کوئی کچے اور ناچنے ذہن کی تیرہ چودہ سالہ لڑکی بھی تو نہ تھی۔ پڑھی لکھی باشعور اور سلیجے ہوئے دل و دماغ کی نوجوان دہ شیزہ تھی۔ اسے اپنے انتخاب پر پورا پورا اعتماد تھا۔ پھر بھلا ماجد وہ کیونکر اس انتخاب سے دستبردار ہونا قبول کر لیتی۔ اس کی تربیت بھی مکمل مکمل کر گھٹ گھٹ کر مر جانے والے ماحول میں نہ ہوئی تھی۔ جو یہ فیصلہ اپنے اوپر مسلط کر کے میلی ٹکڑی کی طرح سلگنا عمر بھر کے لیے قبول کر لیتی۔

آصف صاحبانہ انداز میں جانے لگتی دیر تک باتیں کرتا رہا۔ وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔

آصف سمجھا اس کی باتوں کا ٹینا نے اس کی منتا کے مطابق اثر لیا ہے۔ وہ چند لمحے چپ رہا۔ پھر پاپ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”جاؤ۔ اب سو جاؤ جا کر تم۔“
”مجھے آپ کا فیصلہ منظور نہیں ایو۔“ ٹینا نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ مستحکم اور پر عزم آواز میں اسی انداز میں کڑے کڑے کہا۔

”ٹینا۔“ آصف نے حکمانہ آواز میں کہا۔

”میں کسی مصلحت۔ کسی مجبوری کو نہیں جانتی۔“ وہ تلخ لمبے میں بولی۔

”تمہیں میرا فیصلہ ماننا ہو گا۔“ آصف فیسے میں آگیا۔

”نہیں مانوں گی۔“ وہ بھی ہنرک لڑ گئی۔

”کیسے نہیں مانو گی۔“ آصف نے کڑکدار آواز میں کہا۔ ٹینا نے کچھ جواب دینا چاہا۔ آواز پوری طرح اس کے منہ سے نکلی بھی نہ تھی کہ آصف کا بھرپور تھپڑ اس کے منہ پر پڑا۔
ٹینا کا دماغ چکر اٹھا۔ اسے ذہنی دھچکا سا لگ۔ آج تک اس نے باپ کے منہ سے کوئی سخت بات نہ سنی تھی۔ یہ تھپڑ تو اس کی ساری ہستی کو تھرا گیا۔ گال پر ہاتھ رکھے وہ تیزی سے مڑی اور روٹے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

یہ چھٹی حس بھی کیا ظالم چیز ہے۔ کبھی کبھی تو خطرے کے اللارم کی طرح بج اٹھتی ہے۔ جو کس اور خبردار کر دیتی ہے۔ ہونے والے واقعے کے متعلق کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ لیکن یہ سارا پتہ دے دیتی ہے۔

فرجوانے پر آمدے میں قدم رکھتے ہی اللارم کی آواز محسوس کر لی۔ ناخوشگوار فضا کی بوسنگھ لی۔ اک انجانی سی الجھن اس کے اعصاب پر مسلط ہو گئی۔ وہ بڑے محتاط قدم اٹھاتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

ایک رات کے نو بجے تھے۔ لیکن اک تھمیری سی چب درو پوار پر چھائی تھی۔ لی دی والی اونچ سے کوئی آواز آرہی تھی نہ نفست گاہ سے۔ تو کون چاکروں کی پانچل بھی نہ تھی۔ ٹینا کے کمرے کی بتیاں روشن تھیں۔ اور آصف کے کمرے کی روشنیاں بھی گل نہ تھیں۔ پھر بھی روشنیاں تو گلی بھر لگ رہی تھیں۔ اتنی چپ تھیں کہ ان کے مرنے کا احساس ہوتا تھا۔

آج کی شام بڑی اہم تھی۔ کچھ نہ کچھ ہوتا تھا۔ لطیف صاحب جس مقصد کے لیے آرہے تھے۔ فرجوانہ جاتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی اس کے علم میں تھی۔ کہ آصف ٹینا کو اس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ جسم میں کپکپاہٹ تھی۔ اور ماتے پر نغصے پیسے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس کی روشن اور کشادہ آنکھوں میں گھپ اندیرا تھا۔

”میں ٹینا تمہیں سوہنہ دوں گا۔“ آصف کے الفاظ اس کے کانوں میں آہوں آپ اتر رہے تھے۔ لیکن ان حیات بخش الفاظ کے باوجود وہ اپنے آپ کو زندگی سے کنارہ کش کر رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ جانتا تھا۔ آصف نے اگر یہ قدم اٹھا بھی لیا۔ تو ٹینا ارشی کو اپنے آپ سے۔ جدا نہ کر سکے گی۔

اور یہی اعلان اس کی چھٹی حس چیخ کر کر رہی تھی۔

اس نے آہستگی سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔

اندرواغل ہو گیا۔

کمرے کی تباہی روشن تھیں۔

”سلام صاحب۔“ بیٹے ٹیک لگا کر قالین پر بیٹھے ہوئے بدرو نے تصاویر والا رسالہ ایک طرف دکھ کر اٹھتے ہوئے کہا۔

سر کے اشارے سے جواب دیتے ہوئے فرجاد نے اپنے آپ کو آرام کرسی پر گر کر کرسی کی پشت پر گونڈ ڈال دی۔

بدرو اسی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس کے قدموں میں جھپٹتے ہوئے پوٹوں کے تسے کھولنے لگا۔ خاموشی سے اس نے پوت اتارے اور کچلے چیل لاکر اس کے پاؤں تلے رکھ دیئے۔

خاموشی اپنا آپ سنوار رہی تھی۔ چھٹی جس کا الارم پوری قوت سے بج رہا تھا۔ باتنی سا بدرو آج بلاوجہ خاموش و قنیتا نہیں تھا۔

”مہمان آئے تھے بدرو۔“ فرجاد نے کرسی میں آگے کو جھپٹتے ہوئے پوچھا۔

”جی صاحب۔“

فرجاد کا دل زور سے اچھلا۔ وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔

”کھانا لاؤں صاحب۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد بدرو نے پوچھا۔

فرجاد نے بیشکل نفی میں سر ہلایا۔ اس کا سانس ابھی تک سخت نہ ہوا تھا۔ تذبذب اور شک کی حالت بھی تو کھینچے سے کم نہیں ہوئی۔ وہ بھی اس وقت کھینچے میں جکڑا ہوا انسان تھا۔

بدرو پھر کچھ نہیں بولا۔ خاموشی سے فرجاد کا لباس شب خوابی ڈریسنگ روم میں رکھتے چلا گیا۔ چند لمحوں بعد واپس آیا۔ تو فرجاد کمرے میں ٹھل رہا تھا۔

”لباس تبدیل کر لیں صاحب۔“ بدرو نے آہستگی سے کہا

فرجاد دو تین طور پر سنبھل چکا تھا۔ رک کر بدرو کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا بات ہے بدرو۔“

”جی۔“

”بڑے چپ چاپ ہو۔“

وہ صرف مسکرایا۔ دھیمی بولی بولی ہوئی مسکراہٹ اس کے مونہے سے مونہے ہو نٹوں پر تھی۔

”کوئی بات ہے؟“ کیوں بدرو۔ آج گھر میں بھی خلاف معمول بڑی خاموشی ہے۔“

”جی صاحب۔“

”آصف صاحب گھر پر ہیں۔“

”جی اپنے کمرے میں ہیں۔“

”اور یتیم۔“

”وہ اپنے کمرے میں۔ شاید۔ شاید رورہی ہیں۔“

”کیوں؟“

فرجاد نے سوال تو کر دیا۔ لیکن اس کے جواب سے وہ بے خبر نہیں تھا۔

”میں یتیم تیس سو سو دوں گا۔“ آصف کے الفاظ بڑی ملائمت سے اس کے کانوں میں اتر گئے۔ قنیتا آصف نے یتیم اسے سو سو دی تھی۔ یتیم کا روٹا سی بات کا یتیم ثبوت تھا۔

بدرو نے یہی بات بتائی۔ جس کی تمہ کو وہ پہلے پہنچ چکا تھا۔

تو

دو انتہائیں کھرا چکی تھیں۔ آصف کا فیصلہ فرجاد کے حق میں تھا۔ کھراؤ کی خوفناکی اور ہولناکی کے باوجود فرحیوں کے بے شمار لمبے فرجاد کی گرفت میں آگئے۔ اسے یوں لگا جیسے مہمگر کی

معدروں کا صلہ ان گھڑوں میں اسے مل گیا ہو۔ چھتری ہوئی گل بانو جس نے یتیم کے روپ میں دوبارہ جنم لیا تھا۔ اس کی ہانہوں میں آگئی ہو۔

وہ کرسی میں پھر کر گیا۔ بیدم اور مداحاں سا۔ بدرو اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ بغور تنک رہا تھا۔

”تم جاؤ۔“ اس نے بدرو سے کہا۔ اور سرگٹ سگ کر کش پر کش لینے لگا۔ وہ اس وقت اور کچھ نہیں سوچتا چاہتا تھا۔ کسی انجام کسی آغاز کسی سمت کا یقین نہ ہو سکتا تھا۔ بھرپور خوشی کا احساس

مطلوب کر رہا تھا۔ لیکن یہ لمحے دیر نہ تھے۔ اس کی عمر جذباتی سوچوں سے آگے بڑھ چکی تھی۔ رک کر غصہ کر

سوچنے کے مقام پر تھا۔

یتیم رورہی تھی۔

اور

کیوں رورہی تھی۔ وہ جانتا تھا۔

ماتھے کو اٹھایوں سے دبا تے ہوئے آنکھیں کچھ کر وہ دیر تک سوچتا رہا۔ اس نے بے شمار سرگٹ بھی چھو جک ڈالے۔ بے قراری سے اس نے ہٹلو پر ہٹلو بدلا۔

وہ یتیم کو ٹوت کر چاہتا تھا۔ اس کا پیار لا زوال تھا۔ اس کا عشق جنوں خیر تھا۔ یتیم صرف یتیم نہیں تھی۔ اس وجود میں گل بانو تحلیل ہو چکی تھی۔

گل بانو۔ جو اس کی روح کی پیاس تھی۔ جو اس کے جذبات کا قاتنا نہیں۔ جو اس کے جسم، جاں کی مانگ تھی۔

اس کے پیار چاہت اور عشق کا تقاضا تھا۔ کہ وہ یتیم کی خوشیوں کے لیے اپنی پیاس مانگ اور
تھکتے سب قربان کر دے۔

اس نے فیصلہ کر لیا۔ یتیم کی سرتیں یتیم کو لوٹا دیئے گا۔

وہ کرسی سے اٹھا۔ کمرے میں شلتا رہا۔ پھر رات کے اندر میں آیا۔ اور اس کے قدم خود بخود یتیم
کی خوابگاہ کی طرف اٹھ گئے۔

خوابگاہ روشنیوں سے بھری تھی۔ چائنی روشنیوں میں یتیم بستر میں بے ترتیب کی پڑی سو رہی
تھی۔ درستے روئے جانے کب آنکھ لگ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر اب بھی بے چینی اور اضمحلال
تھا۔

وہ کئی لمبے لمبے تکتا رہا اور اس کے جلتے سینے سے ٹھنڈی آہیں نکلتی رہیں۔ دروازے میں
کھڑا وہ دیکھتا رہا۔

پھر اس کا سر کھٹکا گیا۔

اسے یوں لگا جیسے بیٹے پر یتیم نہیں۔ گل بانو بھی نہیں۔

بلکہ

پوچا جاکے لیے پتھر سے تراشی گئی صدیوں پرانی مورتی ہے۔

جس سے صلے کے بغیر ٹوٹ کر مہبت کی جاتی ہے۔

شکر ہے مہبت کسی وجود کا نہیں ہڈیے کا نام ہے۔ وجود چمچن جاتے ہیں۔ جذبے نہیں چھتے۔

فرجاد نے سوچا اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو گلابوں پر لڑھک گئے۔

دن کافی ٹھنک گیا تھا۔ سہری دھوپ چوڑے در پچوں سے اندر در آئی تھی۔ خوابگاہ کی سبز
رنگت میں دھوپ کا سنہرا پن ٹھنک کر تازگی اور خوشگوار کی علامت بن گیا تھا۔ تمازت اور ٹھنکی کا
گٹھ جو ابھی خوب تھا۔ فرجاد کے کھلے پاؤں دھوپ کی زد میں تھے۔ اور سینے پر اس نے موٹا سا ادنی
کپڑا ڈال رکھا تھا۔

رات کے جانے کس پھر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اور وہ ٹھنکیوں کی بے سدھ نیند نکال کر اب
بیدار ہوا تھا۔ نیند بھی انسان پر قدرت کا احسان عظیم ہے۔ کتنی وسیع القاب ہے۔ یہ کتنی مخلص
اور ہمدرد ہے۔ سارے دکھ سارے درد اور ساری اذیتیں سمیٹ لیتی ہے۔ جانتے میں پریشانیوں
تکالیف اور دکھوں سے تڑپا بلکتا انسان نیند میں کیسے آزاد ہو جاتا ہے۔ ہلکا پھلکا۔ اور بے خبر۔ جیسے
کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

فرجاد بھی سو گیا تھا۔ اور ساری پریشانیوں کا بار جیسے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ لیکن آنکھ کھلنے
کی حالات کی آنکھ بھی کھل گئی تھی۔ اور وہ بستر میں پڑے پڑے سرایت ملگ کر حالات کا سننے
سرے سے جائزہ لینے لگا تھا۔

آصف کا فیصلہ رد کر کے یتیم اور ایشی کا بندھن باندھنے کا اس نے جو فیصلہ کیا تھا۔ وہ بلاشبہ
اصل تھا۔ لیکن اس وقت اک نئی اذیت نے فرجاد کو گھیر رکھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کیا آصف نے یتیم کو
فرجاد کے جذبات سے آگاہ کر دیا ہے۔

اس سوچ ہی سے اسے بھر بھری سی آہی تھی۔ سبکی تیر کی طرح سینے میں بوسہ تھی۔ یتیم
کے دل میں اس کی لیے جو عقیدت و احترام بھری مہبت تھی۔ اس انکشاف سے وہ جھٹک سے اڑھنی
ہو گئی۔ ہو سکتا ہے وہ نفرت کے اس مقام پر پہنچ گئی ہو۔ جہاں سے وہ فرجاد پر نگاہ ڈالنا بھی گوارہ نہ
کرے۔ ایشی اور اپنے درمیان حامل ہونے والے کو وہ معاف کہاں کر سکتی تھی۔ یہ اس کی عمر کا
تقاضا اور اس کی جذباتی سوچ کا صحیح رد عمل تھا۔

فرجاد کو سمجھ نہ آ رہی تھی۔ کہ وہ یتیم کا سامنا کیونکر کر سکے گا۔

اسے آصف پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ جس نے اس کے احتجاج کے باوجود ایسی پہلے چا دی تھی۔ بد رو تیسری بار چائے لے کر آیا۔ صاحب کو بیدار پا کر اس نے بیٹھے کی سیانی پر چائے رکھ

دی۔

فرجاد نے ایک طویل انگڑائی لی۔ بستر میں بیٹھے ہوئے بالوں کو انگھڑوں سے سلجھایا۔

بد رو نے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔

”بست در بست سوتا رہا ہوں۔“ وہ بولا۔

”گیارہ بیٹے والے ہیں۔“

”واقعی۔“

”جی صاحب۔“

”آصف کلام پر چلے گئے۔“

”جی امیں آج گاؤں جانا تھا۔“

”یہنا۔؟“

”وہ۔ وہ اپنے کمرے ہی میں ہیں۔“

”ناشہ کیا۔“

”لے کر پٹائی تھی۔ لیکن میرا خیال ہے انہوں نے واپس لوٹا دیا۔“

”ہوں۔“

فرجاد نے جلدی جلدی چائے علق سے انڈلی اور خالی پیالی بد رو کو بڑھا دی۔

”اور صاحب۔“

”ہیں۔“

بد رو برتن سمیٹ کر کمرے سے لے گیا۔ فرجاد بستر سے نکلا۔ گاؤں پر پتا اور میز پر رکھا اخبار

اٹھا کر کھڑکی کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اخبار اس نے دیے ہی میز پر دکھ دیا۔ نیا سگریٹ

سٹگایا۔ اور کھڑکی سے باہر بیٹھے روغن آسمان کو دیکھتے ہوئے سوچوں کی لذت سے فرار پانے کی

کوشش کرنے لگا۔

ایک ہی سوچ تھی۔

یہنا سے سامنا کرنے کی۔

وہ اپنے آپ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کہ دروازے پر دھیمی سی دنگ ہوئی۔

”آجاؤ۔“ فرجاد نے اسی انداز میں آسمان میں نظریں گاڑے آہستگی سے کہا۔

دروازہ قدرے چرچایا۔ بیٹھے بیٹھے فرجاد نے گردن گھما کر اندر آنے والے کو دیکھا۔

ایک لمحہ کو تو اسے یوں لگا جیسے وہ اپنے کمرے میں کرسی پر نہیں۔ قطب شمال۔ کے کسی گوشے

میں صدیوں پرانی برف میں دھنسا ہوا ہے۔

یہنا اندر آئی۔

فرجاد کا پگمیا۔ دوسرا لمحہ کسی استوائی خطے کی مجلس دینے والی گرمی لیے تھا۔ اس کے ماتھے

پر پسینے کی بوندیں آئیں۔

”انکل۔“ یہنا نے تیزی سے اس کی طرف آتے ہوئے بے اختیار ہو کر کہا۔ اس کی آواز

گھٹ مٹی اور آنکھوں میں رکے آنسو بہہ نکلے۔

اور پھر اس کے کہ فرجاد یہنا کے انکل کہنے پر سکون کا سانس لیتا۔ وہ اس کی گود میں سر رکھ کر

چٹکیوں سے روئے لگی۔

”انکل۔ انکل۔“ وہ ٹوٹ ٹوٹ کر کہہ رہی تھی۔

فرجاد کی حالت غیر تھی۔ لیکن سکون وطمینان کی لہروں اس کی کوفت دینے والی سوچ سے

بگلیک ہو رہی تھی۔

آصف نے یہنا اس کے متعلق یہنا کو کچھ نہیں بتایا تھا۔

”انکل۔ ابونے۔ ابونے۔“ وہ کئی لمحے آنسو بہانے کے بعد چہرہ اٹھا تے ہوئے رندھی آواز

میں بولی۔

اس کا چہرہ چمکیا ہوا تھا۔ آنکھیں متورم تھیں۔ گالوں پر آنسوؤں کی ٹکریں تھیں۔ بکھرے

بالوں کی چند ٹہنیں آنسوؤں کی نمی سے گالوں اور کانوں کی درمیانی جگہ۔ چمک مٹی تھیں۔

حسن ہر رنگ میں حسین ہے۔ روتے ہوئے بھی یہنا کا قلندر حد تک حسین تھی۔

”ابونے ارشی کو جواب دے دیا ہے۔ انکل۔“ فرجاد کی خاموشی سے آگاہ کر اس نے اس

کا گھٹا قرطہ جذبات سے چھجھوڑ کر کہا۔

فرجاد نے سر کو ہلکا سا جھکا کر دے کر اپنے آپ کو اپنے آپ میں لاتے ہوئے یہنا کی طرف

دیکھا۔

اور

یہنا کو زمانے بھر میں وہی مخلص و ہمدرد نظر آیا تھا۔ اس نے روتے روتے ابو کی زیادتی بیان کر

دی۔

”آپ ابوسے کہہ دیں۔ انہوں نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔ نہیں۔ میں جان دے دوں گی۔“

تب فرجاد کے لبوں پر پڑی پر اسرار سی مسکراہٹ آگئی۔ اس کی سرخ انگڑاں آکھیں نیم داہو

”آپ بہت اچھے ہیں انکل۔“ ٹینا نے سر اس کے گھٹنے پر رکھ دیا۔

فرجاد نے اس کی گردن دھیرے سے تھپتھپائی۔

دوسروں کو مھنڈک پہنچانے کے لیے انسان کو بعض اوقات آتشیں عرابوں تلے سے گزرنا پڑتا ہے۔

فرجاد آتشیں عرابوں تلے ہی سے گزر رہا تھا۔ اور اسکی تسلی و تفتنی سے ٹینا اپنے آپ کو فردوسی رعنائیوں میں گم ہوتے پارہی تھی۔

”گئیں۔ اس نے ٹینا کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر پوچھا۔“ بہت محبت ہے تمہیں ارشی سے۔“

ٹینا نے چہرہ چھڑاتے ہوئے سر جھٹکا کر کہا۔ ”ابو سے آپ کہہ دیں انکل۔ میں ان کی کسی مصلحت کو نہیں جانتی مجھے آخری سارا آپ ہی نظر آتے ہیں۔ ابو آپ کی بات مان بھی جاتے ہیں۔“

”اگر نہ مانتے تو۔“ فرجاد نے پوچھی کہہ دیا۔

”تو۔ میں۔ میں۔“ وہ رو دی۔

”مر جاؤں گی۔“ فرجاد نے اس کی بات پوری کر دی۔

”میں سنجیدہ ہوں انکل۔“ اس نے دھپکے کے کونے سے آنسو صاف کیے۔

فرجاد نے گردن کرسی کی پشت پر ڈال کر آنکھیں بند کرتے ہوئے دھیرے دھیرے کہا۔ ”محبت میں ناکام ہو کر مر جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ ناکام ہو کر زندہ رہنا بلاشبہ موت ہے۔ ایسی موت جو جیتی رہتی ہے۔ اس موت سے بچنا آسان نہیں۔“

ٹینا نے اپنی خوبصورت آنکھوں کو پوری طرح کھول کر فرجاد کو دیکھا۔ جانے کیوں وہ کسی انسان کے وجود سے زیادہ حسرتوں کا مدارا کر رہا تھا۔

وہ تسلی ہی دیر اسے سختی رہی۔ وہ بے حال سا پڑا رہا۔

پھر اس نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر اسے بلایا اور دکھ سے بولی۔

”انکل۔ آپ ٹھیک تو ہیں۔“

ایک گہری سانس پھونٹتے ہوئے وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ سنبھلتے ہوئے ٹینا کی طرف دیکھا۔ جلدی سے بولا۔ ”آصف نے بہت زیادتی کی ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو ٹینا تمہاری خوشیاں لوٹانے کے لیے میں آصف کو کیا تقدیر سے بھی ٹکرا سکتا ہوں۔ آنسو مجھ ڈالو۔“

”ٹینا نے بڑی عقیدت مندانہ احسان بندی سے اسے دیکھا۔

فرجاد کشتہ غم لگ رہا تھا۔

روندا ہوا۔

شکستہ شکستہ سا۔

”کیوں؟“ یہ سوچنے کی ٹینا کو فرصت کہاں تھی۔ وہ تو اس وقت اپنے لیے بی رہی تھی۔

دوسرے کے بارے میں کیونکر سوچتی۔

فرجاد نے دل پر صبر کی سل رکھ کر اسے تسلی و تفتنی دی۔ ”آصف نے جو کہا ہے وہ نہیں ہو گا

ٹینا۔ جو میں چاہوں گا وہی ہو گا۔ اور۔ تم جانتی ہو کہ مجھے تمہاری خوشیاں بہت عزیز ہیں۔“

تھی۔ بقیہ فلاجی کاموں کے لیے وقف کر دی تھی۔

کئی دنوں کی تنگ و دو اور دو ڈھوپ کے بعد اس نے یہ سارے مرحلے طے کیے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ کافی احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ خاموشی سے وہ سب کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اور پھر خاموشی ہی سے ایک بار اس طرف لوٹ جانا چاہتا تھا۔ جس طرف میں برس گزار کر آیا تھا۔

تھی دامن تھی دل ہو کر وہ اب اس حویلی کی چھتوں تلے سانس بھی نہ لے سکتا تھا۔ اپنے اربابوں کی نقش کندھوں پر اٹھائے وہ آخر تک اب اپنے آپ کو چھپا سکتا تھا۔ اس نے یہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

آج حویلی میں اس کا آخری دن تھا۔ سارے کام طے پا چکے تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ آسمان کی رنگت سنو لاگتی تھی۔ پرندے ہیروں کو لوٹ رہے تھا۔ کام کاج سے فارغ ہو کر لوگ گھروں کو واپس آ رہے تھے۔

اور فرجاد بھرا چھوٹے کی چٹاری کر رہا تھا۔ گھر سے جانے کو تیار ہو رہا تھا۔ اپنا ایٹھی کیس اس نے ضروری سامان رکھ کر بند کر دیا تھا۔ جبچہ جیس بیک میں رکھی تھیں۔ اور بریلب کیس میں احتیاط سے سارے کاغذات کو لٹھی پا سپورٹ اور گھٹ رکھ کر تینوں جیبیں نیز پر اوپر سے دھک دی تھیں۔

ہوٹوں میں مگرٹ دبا دے وہ دونوں ہاتھوں سے کاغذات برابر کر رہا تھا۔ اس نے بے شمار مگرٹ چھوٹک ڈالے تھے۔ حلق بھی تلخ ہو رہا تھا۔ کاغذات نہ تھی کر کے اس نے کپڑا گنگے کاغذ کے بڑے سے مضبوط لفافے میں سارے کاغذات ڈال دیے۔ لفافہ بند کیا اور اس پر ٹینا کا نام لکھ دیا۔

قلم اس نے میز پر ڈال دیا۔ لفافے پر لکھے نام کو لٹھی سے ہٹا کر دبا۔

پھر لفافہ میز پر رکھتے ہوئے وہ کرسی پر بیٹھ کر اپنے آپ کو تیار کرنے لگا۔

مرحلے سے گزرنے کے لیے وہ اپنے آپ کو تیار کرنے لگا۔

اس نے سر کرسی کی پشت پر ٹکرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

ٹینا

ٹینا

اس کا ہر سانس پکار رہی رہا تھا۔ وہ ویسے ہی بڑا ادا لے بیٹھ گئے۔

اور اس کی آنکھوں کے گوشے جانے کیسے۔ آپ آج بھی گئے۔

نشت گاہ سے باہر حویلی میں زندگی رواں دواں تھا۔ کسی جھ سے قہقہوں کی گونج تھی۔ کسی

میں ریوے یوگ کر فضا کو مٹ رہا تھا۔ کسی کمرے میں ریکارڈر پلیئر پر دفرب دھنیں چل رہی تھیں۔

اور کہیں سے ٹی۔ وی پر ہونے والی انگریزی فلم کی گھن گرج سنائی دے رہی تھی۔

بات مشکل ترین ہونے کے باوجود مشکل نہ تھی۔ فرجاد نے چند منٹوں میں آصف کو اس کا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اور صرف یہی نہیں ملیف صاحب اور ان کی بیگم سے مل کر معاملہ طے کر دیا۔ مگنی کی تاریخ بھی مقرر کر دی۔

حویلی کے رگ و پے میں زندگی کی حرارت دوڑ گئی۔ مگنی کی چٹاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فرجاد کے حکم پر حویلی کی زمین و آرائش شروع ہو گئی۔ روپیہ بالی کی طرح ہلکا جانے لگا یہ تعقیب اس انداز سے منائی جانے والی تھی۔ کہ برسوں اس کا تاثر ذہنوں سے محو نہ ہو سکے۔

ٹینا خاموشی سے پھولی نہ ساقی تھی۔ اس کا دامن مراد گوہر امید سے بھر گیا تھا۔ انکل نے اسے خوشیوں سے ہمکنار کیا تھا۔ وہ سب کچھ دیا تھا جو ابو نے جھین لینے کی کوشش کی تھی۔ انکل کے لیے اس کے سینے میں عقیدت اور محبت کا سمندر تھا نہیں رہا تھا۔

آصف بالکل خاموش تھا۔ فرجاد جس آگ میں دوسری باجل رہا تھا۔ وہ اس کی نظروں سے پوشیدہ نہ تھی۔ لیکن اس نے اسے بالکل بس لے کر دیا تھا۔ بولنے کی اجازت دیتا تھا۔ کچھ کہنے کی۔ خاموش قماشائی تھا۔

دن گزر رہے تھے۔

کام ہو رہا تھا۔

تیاریاں زوروں پہ تھیں۔ حویلی کا ہر فرد مصروف کار تھا۔

فرجاد بھی مصروف تھا۔ دن رات آگ خود کار مشین کی طرح مگم کر رہا تھا۔ لیکن اس کے کام کی نوعیت مگنی کے سلسلے میں ہونے والے کاموں سے جدا تھی۔

وہ جاکیر، ہانیہ اور روپیہ پیسے کا صاحب کتاب طے کر رہا تھا آج سے تیس برس پہلے وہ ساری چیزیں آصف کو دے گیا تھا۔ لیکن آصف نے اسے فرجاد کی امانت سمجھا تھا۔ چنانچہ جب وہ واپس آیا تھا۔ تو اس کی امانت اسے واپس لوٹا دی تھی۔

فرجاد اس دلفرہ مستقل بندوبست کر رہا تھا۔ اپنی آویجی ہانڈ اور اس نے ٹینا کے نام منتقل کر دی

ڈینا باہر سے آئی۔ نشست گاہ میں کئی دنوں کے بعد روشنی دیکھی۔ تو اپنے کمرے میں جانے کی بجائے ادھر ہی آگئی۔

ادھ کھلے دروازے میں جھانک کر دیکھا۔ انکل کو کرسی پر بیٹھ دیکھ کر وہ اندر آگئی۔ کئی دنوں سے اس نے انکل کو دیکھا کہ نہیں تھا۔ وہ سوئی ہوئی تھی۔ تو کمرے سے نکل جاتے تھے۔ وہ سو جاتی تھی۔ تو واپس آتے تھے۔ انکل سے باتیں کرنے کو اس کا چہرہ رہا تھا۔

فرجاد آکھیں، بندہ کر سی میں بے سادہ سا پڑا تھا۔ ڈینا کو شرارت سو جی۔ آہستہ آہستہ عقاب قدم رکھتے پیچھے سے آئی اور انکل کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دینے۔ ہاتھوں سے فرجاد تو چونکا سو چونکا۔ ڈینا تو بھی چونک گئی۔ اسکی آنکھوں میں نمی تھی۔ حیران ہو کر اس نے ہاتھ کھینچ لیے۔ اور کرسی کے گرد گھوم کر فرجاد کے سامنے آگئی۔

فرجاد کی حالت موقع واردات پر بکڑے جانے والے مجرم کی سی تھی۔ وہ بوکھا گیا۔ جلدی میں اسے کچھ سو بھائی نہیں۔ سرخ سرخ ہیکلی ہیکلی آنکھیں ڈینا کی حیران آنکھوں سے ملیں اور جھک گئیں۔

”انکل۔“

”انکل۔“

ڈینا نے ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ ”آپ۔ آپ۔ رورہے تھے۔“
وہ ہنس پڑا کھوکھلی سی بے کیف ہنسی۔ پھر جلدی سے رومال جب سے نکالا اور رخ پھیرتے ہوئے آکھیں صاف کر لیں۔ ”کم بہت نزل۔“

لیکن ڈینا اس کی بات پر یقین نہ کر پائی۔ مضطرب ہو کر بولی۔ ”آپ کو کیا دکھ ہے انکل۔“
فرجاد نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے میرے لفافہ اٹھایا۔ آستین اوپر کھینچ کر وقت دیکھا۔
”یہ بونیٹا۔“ لفافہ بڑھاتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”یہ کیا ہے۔“ وہ بولی۔

”دیکھ لیتا۔“ فرجاد نے لفافہ اسے دیتے ہوئے کہا۔

”آپ جلدی نہ۔“ ڈینا نے لفافہ دونوں ہاتھوں میں بکڑے بکڑے پوچھا
”نہیں۔ جب میں چلا جاؤں گا۔ پھر اسے کھولنا۔ یہ میری طرف سے تمہارا آخری تحفہ ہے۔“

”آپ کہاں جا رہے ہیں۔“

”جہاں سے آیا تھا۔“

”کیا؟“

”ہاں۔“

”آپ ذرا نیچے آ کر بات کرنا۔“

”نہیں۔“ اس نے ایک کمری مانس لی۔ پھر کھڑی دیکھی۔ اور بولا۔ ”وقت بہت کم رہ گیا ہے۔“

”انکل۔“ ڈینا نے لفافہ میز پر بٹھاتے ہوئے اس کا بازو تھام لیا۔ ”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کہیں نہیں جانتے۔ آپ کو نہیں رہتا ہے۔“

وہ بے جان سی مسکراہٹ لبوں پر لے آیا۔

ڈینا کی نظر اس کے سلمان پر پڑی۔ اس نے گہرا ذکر فرجاد کو دیکھا

”کیا یاد آتی آپ جا رہے ہیں۔“ اس نے فرجاد کا بازو زور سے ہلا کر پوچھا۔

”ہاں۔“

”ہائے اللہ۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے انکل۔ کسی کو پتہ بھی نہیں اور آپ جا رہے ہیں۔ میں ابو سے کہتی ہوں۔“

فرجاد سے روتا ہی رہا۔ لیکن وہ بھانگ بھانگ ابو کو بلا لائی۔

آصف کو جانے کیسے پہلے سے گمن من تھی۔ یا حالات کے ہماؤ سے ہی اس نے اندازہ کر لیا تھا۔ فرجاد کے سامنے کیا تو صرف اسی قدر کہا۔ ”میں جاتا تھا۔ تم یہی کرو گے۔“

”مجھے یہی کرنا چاہیے تھا۔“ فرجاد اس سے نگاہیں ملاتے ہوئے آہٹکی سے بولا۔

”ہاں۔ شاید۔“ آصف نے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ اس کے چہرے پر حزن و ملال کے سامنے تھے۔

ڈینا بھی ابو اور کبھی فرجاد کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا خولہ رت پریشان چرو پیکا پڑ گیا تھا۔ کچھ بھی تو سمجھ نہ آ رہا تھا۔

آدھ گھنٹے بعد وہ سب ہوائی اڈے پر تھے۔ جہاز کی پرواز کے وقت کا اعلان ہو رہا تھا۔ وینٹگ روم میں کھوکھلی تھی۔ مسافر جا رہے تھے۔

فرجاد کے نہ جانے کے باوجود حویلی کے بست سے لوگ اسے چھوڑنے ہوئی اڈے پر آگئے تھے۔ وہ سب سے مل رہا تھا۔ چھوڑنا بھی تو قیامت سے کم نہیں ہوتا۔ ڈینا نے تورو رو کر برا حال کر لیا تھا۔

سب سے مل کر فرجاد آصف سے گفتگو ہوا۔ آصف بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ حالات نے اسے جس خطرناک مقام پر لاکھڑا کیا تھا۔ وہاں زبان کام نہ دے سکتی تھی۔ جذبات کا اظہار بننے والے آنسو ہی کر رہے تھے۔

”مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں دوست۔“ گلوگیر آواز میں فرجاوے کہا۔ اور قریب کھڑی ٹینا کی طرف رخ پھیر لیا۔

”تم کیوں روتی ہو ٹینا۔ خوشیاں تمہارا مقدر ہیں۔“ فرجاوے نے رندھی آواز میں کہا۔
”انکل۔“ ٹینا سسک رہی تھی۔

فرجاوے اس کا بیگیا ہوا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ چند لمے اسے تکتا رہا۔ اس کے ہاتھ رخ بستہ تھے۔

پھر اس کا سر جھکا۔ اور۔۔۔ اس کے ہونٹ — ٹینا کی پیشانی کو چھو گئے۔
ہونٹ ہونٹوں کو چھولیں تو پیار کا اظہار ہے۔

ہونٹ پیشانی سے آگئیں تو یہ بھی پیار کی علامت ہے۔ لیکن —

ہونٹوں اور پیشانی میں فاصلے کی کمی کے باوجود پیار کے مضموم میں ازل وابد کی مسافتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔

پیشانی پر ہونٹوں کے ٹھنڈے لمس میں جانے کیا تھا۔ کہ ٹینا سر تاپا کانپ گئی۔ اس نے جلدی سے فرجاوے کے ہاتھوں سے چہرہ چھڑا کر اس کی طرف دیکھا۔ فرجاوے کے چہرے پر محرومی کی ایسی چھاپ تھی۔ جو کٹار بن کر روح میں اتر گئی۔

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن کہہ نہ سکی۔ فرجاوے جلدی سے مڑا اور سب کو ہاتھ ہلاتے ہوئے چلا گیا۔

اور جب وہ غیر متوازن سی چال چلتے ہوئے طیارے کی طرف جا رہا تھا۔ تو ٹینا کو محسوس ہوا۔ کہ یہی وہ ازلی محروم انسان تھا۔ جس کے لیے ابونے۔
ٹینا کا دماغ گھوم گیا اور آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔
وہ لہرائی۔

آصف نے جلدی سے اسے بازوؤں میں تھام لیا۔ باپ کے سینے سے لگ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ پیار کا جذبہ اک اٹل سچاکی ہے۔

ہاں

اس کی قسمیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔

خدا جانے۔

پیاری یہ کون سی قسم تھی۔